بنیاد پرستی
پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر

بنیاد پرستی

پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

200.1 Saleem Akhtar, Dr.
Buneyad Parasti. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1996.
228p.
Kitabiat p. 226-228.
1. Mazhab - Falsafah. 2. Islam - Falsafah. 3. Islam - Aqaid wa Kalam.
I. Title.

١٩٩٦

نیاز احمد نے
آر۔ آر پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

قیمت ۱۵۰/۰۰ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0599 - 4

لاؤڈ سپیکر کے نام

ترتیب

6- بنیاد پرستی:

آغاز- جمادات کی طرح- اپنے خدا سے غداری- جہالت : مسلک فکر- برصغیر میں بنیاد پرستی- معقول بمقابلہ منقول- دین الٰہی- علمی روح- کافر فرنگیوں نے- سعی ناکام- ناداں یہ سمجھتا ہے- روشن خیالی کا سفر- بدل کے بھیس پھر آتے ہیں- مولویت- نیا کا ناخدا- کیدو یا کھل نائیک- خاتمہ بالخیر-

7- فساد—— فی سبیل اللہ:

اقبال اور ملا- تیسری دہائی- کریلے کی نیم- ظالمو! یہ کیا کیا؟—— خود بن گئے ڈر کی صورت—— زشت خوئی—— آگ کی قینچیوں سے کٹنے والے ہونٹ- انداز جفا- لاؤڈ سپیکر عوامی عدالت میں- مفاسد سے پاک طریقہ- اسے کیا کہئے—— شیطان آزاد ننھے فرشتے قید —— طرز کہن پہ اڑنا—— طہارت پسندی- ماضی کا مزار- کون کافر مجھے کہتا ہے- غسل دہ ایں منبر- لہو پکارے گا!

8- ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا:

زخت سفر- میر کارواں- 73- سیکولرازم- گلستان من- مسلمان کون؟_ کافر گر- وقولوالناس حسنا- کافر سازی- سیاسی ہتھیار: تکفیر—— مرغ قبلہ نما-

9- فحاشی اور عریانی کا سیلاب:

بھان متی کا کنبہ- جنس کے متنوع مظاہر- دوپٹہ کی جنس- سور سے پرہیز- کارشر- انسانی حقوق کی پامالی- آج کا ویلن : ڈش انٹینا- مہم برائے انسداد عریانی و فحاشی-

10- عورت—— چھوٹے فریم میں بڑی تصویر:

تصویر کائنات کا رنگ- ناگن اور افعی- دیوی : پاؤں کی جوتی- نیک پروین- نیک پروین کا مسئلہ- نیک پروین کا المیہ- فرمودات—— قصہ ٹیڑھی پسلی کا- تار تار پیرہن- الزام کی چادر—— کیوں؟—— عورت : اسلحہ خانہ- تضاد در تضاد- حوا کی بیٹی-
کتابیات

پیش لفظ

فلائنگ کوچ کے ملتان سے نکلتے ہی ڈرائیور نے کیسٹ لگا دی' ابھی سازینہ کی آواز پوری طرح سے ابھری نہ تھی کہ ایک گرجدار آواز گونجی :

"بند کرو یہ فحش گانے!"

ریش دراز عالم غیض میں تھا۔

"تم کون ہو روکنے والے' ہم تو سنیں گے"

کچھ اور سواریوں نے بھی ان کا ساتھ دیا "ڈرائیور! کیسٹ چلا دو!"

کیسٹ دوبارہ چلا دی گئی۔ اس پر ریش دراز مزید غیض و غضب میں آیا' خاصی تو تو میں میں ہوئی "تم چلا کر دیکھو یہ گندے گانے میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔"

ڈرائیور نے گھبرا کر کیسٹ بند کر دی

"کیسٹ چلاؤ!"

"کیسٹ بند کر دو!"

"کیسٹ ضرور چلے گی"

"میں نہیں چلنے دوں گا"

ڈرائیور جو اس سارے ہنگامہ سے اب خاصہ پریشان دکھائی دے رہا تھا سواریوں سے لجاجت سے مخاطب ہوا "جانے دیجئے! آپ لوگ تو چلے جائیں گے' انہوں نے مالکوں سے میری شکایت کر دی تو میں نوکری سے جاؤں گا"

کیسٹ تو نہ چلی مگر دو سو میل کا سفر عجب تناؤ میں کٹا' میں سارا راستہ یہی سوچتا رہا' انہیں یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ اگر انہیں موسیقی پسند نہیں تو باقی لوگ بھی نہیں سن سکتے۔

علامہ اقبال ٹاؤن سے تین نمبر ویگن چلی ہی تھی کہ میرے مقابل بیٹھا ریش دراز بولا :

"شرم نہیں آتی تمہارا دوپٹہ سر سے گرا ہوا ہے"

کچھ دیر تک نہ عورت کو نہ ہمیں سمجھ آئی کہ بات کیا ہے لیکن غصہ سے ان کی آواز بلند اور اسلوب پست ہوتا گیا' تب اندازہ ہوا کہ وہ آخری سیٹ پر بیٹھی اچھی خاصی پختہ عمر

کی عورت سے مخاطب تھے۔ اس نے وضاحت کی:

"کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور ہوا سے دوپٹہ سر پر نہیں ٹک رہا"

اس وضاحت نے ٹھنڈا کرنے کے برعکس جلتی پر تیل کا کام کیا کہ اب وہ ننگی گالیوں پر اتر آئے تھے۔ عورت نے ویگن رکوائی اور بچشم نم ویگن سے اتر گئی' انہوں نے تمام مسافروں پر فاتحانہ نگاہ ڈالی مگر کسی میں تاب نظارہ نہ تھی۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ جو عورت آپ کی بیوی' بیٹی یا بہو نہیں آپ اس کی بھری ویگن میں بے عزتی کر دیں لیکن پھر سوچتا ہوں کون الجھے ان سے۔ مگر ایک اور واقعہ نے مجھے الجھنے پر مجبور کر دیا۔ ویگن بھری تھی' میرے سامنے ریش دراز دو سیٹوں پر پھیلا تھا' سٹاپ پر ایک بوڑھی غریب عورت سوار ہوئی مگر کہیں جگہ نہ پا کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ اگر آپ ذرا سمٹ جائیں تو یہ آپ کے ساتھ بیٹھ جائے گی۔

"یہ نامحرم عورت میرے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی ہے"

میں کم آمیز اور کم گو ہوں' مجمع کا آدمی نہیں' دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے بھی پرہیز کرتا ہوں مگر اس دن چشم فلک نے مجھے بھری ویگن میں لڑتے دیکھا اور بالآخر میں نے وہی کیا جو کر سکتا تھا یعنی بوڑھی عورت کو اپنی سیٹ پر بٹھا دیا۔

یہ اور اس نوع کے واقعات روزمرہ کا معمول بن جانے کی وجہ سے اب ہم میں حیرت' غصہ یا ردعمل پیدا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ صرف وقتی طور پر بدمزگی' تلخی یا اعصابی کشیدگی پیدا کرتے ہیں بلکہ اکثریت تو اب ایسے واقعات کی کثرت کے باعث امیون ہو کر یوں لاتعلق اور بے حس ہو چکی ہے کہ آب پر سکون میں ایک لہر بھی نہیں پیدا ہوتی' تاہم اس نوع کا ہر واقعہ۔ انفرادی حیثیت میں عام (یا عامیانہ) ہونے کے باوجود بھی — اساسی اہمیت کا یہ سوال ضرور پیدا کرتا ہے کہ یہ نیک نیت نیوراتی کون ہیں؟ کس سماجی' اخلاقی اور ملکی قانون کے تحت انہیں مواخذہ اور محاسبہ کا حق دیا گیا ہے؟ کیا واقعی مذہب انہیں اس کی اجازت دیتا ہے؟ اخلاق عامہ کے نام پر مذہب کو جس طرح بطور ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں میں الجھے بغیر اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ "ان" میں اور "ان" میں جو فاصلہ پیدا ہو چکا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے — وعظوں' نصیحتوں' مقالات' جلسوں' جلوسوں' مساجد اور لاؤڈ سپیکر کے باوجود یا پھر شاید ان ہی کی وجہ سے؟ ایک خدا' ایک رسول' ایک کتاب کے

ماننے والوں کے لئے مسجد اتفاق، اخوت، بھائی چارہ کے ساتھ ساتھ دینی وحدت کی علامت قرار پاتی ہے۔ کسی اور ملک میں ہوتی ہو گی ہمارے ہاں تو نہیں!

حاکم محکوم، سرمایہ دار مزدور، جاگیردار کاشتکار وغیرہ کی صورت میں پاکستان میں مختلف طبقات اور ان کے عمرانی کردار، سماجی حیثیت اور اقتصادی صورت حال پر تو بہت کچھ لکھا جاتا ہے مگر ملا مسلمان۔ مولوی مسلمان اور بنیاد پرست مسلمان کی صورت میں تشکیل پانے والے طبقہ میں عدم مفاہمت، مغائرت اور عدم ابلاغ کے تجزیاتی مطالعہ کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی حالانکہ بلا مبالغہ یہ سب سے بڑا طبقہ ہے۔ واضح رہے کہ یہ غلط بات نہیں کہتے، امر و نہی کی تلقین کرتے ہیں، قرآن مجید اور حدیث شریف سے استدلال کرتے ہیں، درس اخلاق دیتے ہیں، صراط مستقیم دکھاتے ہیں، عاقبت سنوارنے کی باتیں کرتے ہیں، دوزخ سے ڈراتے ہیں اور اس کے باوجود عدم ابلاغ کی وسیع خلیج؟

"بنیاد پرستی" ایسے ہی سوالات کے بارے میں ہے۔ ایسے سوالات جو علم و عمل میں مذہبی شخصیات کے طرز عمل سے جنم لیتے ہیں۔ ایسے سوالات جو تاریخی، تہذیبی، تمدنی، عمرانی نوعیت کے حامل ہیں۔ ایسے سوالات جنہیں عقل جنم دیتی ہے اور ایسے سوالات جو سائنس، فلسفہ اور منطق کی تکذیب سے معرض وجود میں آتے ہیں اور عقل کا عدم فروغ جن کی شدت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے ___ پاکستان جیسے ملک میں اگرچہ ایسے سوالات کرنا معیوب ہے کیونکہ یہاں آبادی کا کثیر حصہ اعمال میں عملاً مذہب کی نفی کے باوجود اقوال میں مذہب مذہب کرتا ہے ہاں! پاکستانی مسلمان سور نہ کھانے کے معاملہ میں واقعی سچے مسلمان ثابت ہوتے رہے ہیں۔ یہ ہماری اجتماعی نفسیات کا عجب پر تضاد مظہر ہے کہ سور سے اجتناب کے بعد باقی سب کچھ روا ہے۔

شاید یہ سوالات اور تضادات میرے ذہن ہی میں رہتے اور کبھی اظہار نہ کر پاتے کہ ضبط تحریر میں لانے کی ایک صورت نکل آئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری گذشتہ کئی برس سے دسمبر میں نیاز فتح پوری یادگاری خطبہ کا اہتمام کر رہے ہیں۔ گذشتہ برس انہوں نے کلیدی خطبہ کے لئے مجھے دعوت دی تو میں نے "بنیاد پرستی اور نیاز فتح پوری" موضوع تجویز کیا جسے فرمان صاحب نے بہت پسند کیا۔ جب فراہمی مواد اور بنیاد پرستی کے آغاز، نشوونما اور اس کی مختلف صورتوں کو سمجھنے کے لئے مطالعہ شروع کیا تو خود کو وادی حیرت میں پایا۔ میرا بنیادی مطالعہ نفسیات، تنقید، ادب اور اس کی مختلف اصناف اور شخصیات تک محدود رہا ہے کہ مجھے ان ہی پر لکھنا ہوتا ہے مگر اب میں جو کچھ پڑھ رہا تھا وہ نیا انوکھا اور دلچسپ ہونے

کے ساتھ ساتھ خوفزدہ اور اداس کر دینے والا بھی ثابت ہو رہا تھا۔

مقالہ لکھنا شروع کیا تو کام پھیلتا گیا یوں کہ سمیٹنا مشکل ہو گیا' کراچی جا کر مختصر مضمون پیش کیا اور واپس آکر پھر لکھنا شروع کر دیا اور اب سال بھر کی محنت کا ثمر (شیریں؟ تلخ؟) قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ اس کتاب نے سوالات زیادہ اٹھائے اور جوابات کم دیئے ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ متنازعہ امور میں جوابات بعض اوقات فتوے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور میں خود کو اس کا اہل نہیں پاتا اسی طرح کئی معاملات میں اپنے بجائے حقائق/ معلومات/ کوائف/ شواہد اور حوالوں کو بولنے دیا گیا ہے۔

بنیاد پرستی/ مولویت/ ملایت اور ان کے زیر اثر فرقہ پرستی نے جو پرتشدد صورت اختیار کر لی ہے اپنے حالات کے مخصوص تناظر میں اس کا تذکرہ ضروری تھا۔ مگر ماضی کے مشرق اور مغرب میں بھی ان رجحانات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ عقل دشمنی اور خرد سوزی پر مبنی ان رویوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے جو فلسفہ منطق اور سائنس سے خوف اور نفرت کا باعث بنے۔

ہمارے ہاں بیشتر امور میں شماریاتی مواد مدون کرنے کی روایت نہیں جس کے باعث حقائق کے بجائے ظن و تخمین سے زیادہ کام لیا جاتا ہے حالانکہ شماریاتی مواد اپنا ثبوت خود مہیا کرتا ہے۔ سو اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اخبارات کی خبروں پر زیادہ تر انحصار کیا گیا کہ یوں مثالیں براہ راست ہونے کے ساتھ اپ ٹوڈیٹ بھی ہوتی ہیں۔ شاید بعض اصحاب کو یہ "صحافتی" محسوس ہو مگر یہ میرے طریق کار کی مجبوری تھی۔

میں نے اس متنازع موضوع سے وابستہ جذباتیت کو حوالوں' مثالوں اور شواہد سے دبانے کی کوشش کی ہے۔ میں خود بھی غیر جذباتی رہا اور قارئین سے بھی غیر جذباتی رہنے کی استدعا ہے کہ علمی امور کا تصفیہ علمی استدلال ہی سے ہونا چاہیے۔

میں نے ادبی تنقید کی' نفسیاتی مضامین لکھے' جنسی افسانے رقم کئے' تخلیق سے وابستہ مسائل و مباحث پر لکھا' تخلیقی شخصیات کو موضوع بنایا اور سالانہ ادبی جائزے قلم بند کئے ــــ یہ دنیا کے کام تھے مگر "بنیاد پرستی" عاقبت کے لئے ہے۔۔ گر قبول افتد!

سلیم اختر

طویل ترین دن : 1994ء

۱- "صحیفہ افلاک کے قاری"

"منکہ گلیلیو گلیلی ولد آنجہانی ون سن زیو گلیلی سکنہ فلورنس عمر ستر سال، جو ذاتی طور پر عدالت میں لایا گیا اور دو زانو ہو کر آفاقی عیسائی ریاست کے محافظ اور بدعتی گناہ کے مخالف عظمت مآب، عزت ماب اور قابل صد احترام، منصف تفتیش عمومی کے سامنے پیش ہوا، مقدس بائبل میری آنکھوں کے سامنے ہے اسے میں اپنے ہاتھوں سے چھوتا اور حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ میں نے خداوند کے فضل سے ہمیشہ اس پر ایمان رکھا ہے اور آئندہ بھی رکھوں گا، کیتھولک عقیدہ کی تمام جزویات پر بھی اور روم کے حواری گرجے (Apostolic Church) کی تعلیمات اور احکامات پر بھی، کیونکہ اس مقدس ادارے نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے جھوٹے خیالات کو ترک کر دوں جن کے تحت میرا خیال تھا کہ سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور وہ حرکت نہیں کرتا اور مجھے منع کیا گیا ہے کہ نہ ہی میں اس غلط نظریہ میں یقین رکھوں، نہ اس کی مدافعت کروں، نہ دوسروں کو اس کی تعلیم دوں اور اب مجھ پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ نظریہ کتاب مقدس کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ میں نے ایک کتاب لکھی اور شائع کی جس میں، میں نے اس مردود نظریے کا پرچار کیا اور اس کو ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری قوت سے جواز اور استدلال تلاش کیے مگر میں کسی نتیجے تک نہ پہنچا۔ لہٰذا مجھے اذیت ناک کفر کا مرتکب قرار دیا گیا کیونکہ میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ سورج زمین کا مرکز ہے اور گردش نہیں کرتا اور یہ کہ زمین مرکز نہیں ہے اور گردش کرتی ہے۔ میں آپ سب تقدس مآب حضرات اور تمام کیتھولک عیسائیوں کے ذہنوں سے یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں جو بالکل بجا طور پر میرے سلسلے میں بعض شکوک رکھتے ہیں۔ لہٰذا خلوص دل سے اور صمیم قلب سے میں توبہ کرتا ہوں اور اسے نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اگر اس بات میں کوئی اور بھی غلطی ہے یا کوئی ایسی بات ہے جو مقدس چرچ کی شریعت کے مطابق نہیں، میں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا اور نہ ہی کوئی ایسی بات زبانی کہوں گا، نہ لکھوں گا جس کے باعث میرے سلسلے میں اس قسم کے شبہات دوبارہ پیدا ہوں۔ اگر مجھے کسی ملحد کا پتہ چلا یا کسی ایسے شخص کا

جس پر الحاد کا شبہ ہو سکے تو میں اس پر لعنت بھیجوں گا اور اس مقدس ادارے کو مطلع کروں گا یا کسی دینی عدالت کے منصف یا اس علاقہ کے پادری کو اطلاع دوں گا جہاں میں اس وقت موجود ہوں گا' میں پھر حلفیہ بیان کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ یہ مقدس ادارہ مجھ پر جو بھی حکم عائد کرے گا میں اسے بجا لاؤں گا اور کفارہ پوری طرح ادا کروں گا اور آئندہ ایسا ہو کہ میں اپنے کیے وعدے' اٹھائے حلف یا اعتراف سے پھر جاؤں (جس سے خداوند مجھے بچائے) تو میں اپنے آپ کو سزاوار ٹھہراؤں گا ان تمام تکالیف اور سزاؤں کا' جو مقدس شریعت نے جاری کی ہیں اور جن کی اشاعت کی جا چکی ہے۔ میں سزاوار ہوں گا عمومی یا مخصوص غفلت شعاری کا جو دستوری توجیہہ میں آتی ہے میری دعا ہے کہ خداوند میری مدد کرے اور اس کی مقدس کتاب جسے میں اپنے ہاتھوں سے چھو رہا ہوں' میری رہنمائی کرے اور مجھے مذکروہ بالا کا پابند رہنے کی توفیق دے اور تمام موجود شہادتوں کے سامنے جن کا میں نے اقرار کیا ہے اور جن سے میں نے حلفی انکار کیا ہے اور جو کچھ میں نے حرف بحرف پڑھا ہے۔ روم کے مقام پر کونونٹ مزوا میں 22 جون 1633ء میں گلیلیو گلیلی توبہ کرتا ہوں اور اپنے ہاتھ سے یہ تحریر لکھ دیتا ہوں۔"[1]

"تاریک دن:"

22- جون 1633ء

پوپ اربن ہشتم (اصل نام: مافیو بر برینی (Urban VIII- Maffeo Barbrini خوش ہو گا کہ آج اس نے بوڑھے گلیلیو گلیلی سے اعتراف گناہ اور توبہ نامہ حاصل کر لینے کے بعد بائبل کی حرمت محفوظ کر کے گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ طے کر دیا کہ یہ غیر متحرک کرۂ ارض مرکز کائنات ہے اور چاند سورج خدام ادب کی مانند اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ گلیلیو پوپ کا ذاتی دوست تھا اور وہ اس کی صلاحیتوں کا معترف بھی تھا مگر اس ناہنجار کی زباں بندی اس لیے ضروری تھی کہ اگر لا دین عناصر کو دور بین جیسے کھلونوں کی مدد سے آنکھوں پر جادو کی پٹی باندھ کر نا قابل دید چیزیں دکھا کر کھلے عام بائبل کی تعلیمات کے بر عکس اور تخلیق کائنات کے ربانی ارشاد کے منافی کافرانہ اور ملحدانہ نظریات پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی تو ایک دن ایسا بھی آ سکتا ہے جب نہ مسیحیت رہے گی' نہ پوپ' نہ چرچ' نہ پادری! یہ محض چاند سورج کی بات نہ تھی بلکہ عیسائیت سے وابستہ بنیادی عقاید کا معاملہ تھا۔

یوں دیکھیں تو 22- جون 1633ء کے دن سے فنڈا مینٹل ازم کی باقاعدہ تاریخ کا آغاز کیا

جا سکتا ہے کم از کم یورپ کی حد تک!

"گائے کا سینگ اور کچھوے کی پیٹھ:"

گلیلیو کا توبہ نامہ محض انفرادی واقعہ نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں کوئی دو ہزار برس کی علمی تاریخ کے مختلف ادوار شامل ہیں۔ عہد عتیق کے انسان کو اگر زمین ساکن اور چپٹی نظر آتی تھی، چاند سورج اس کے تابع فرمان اور زمین کے ناطہ سے وہ خود کو مرکز کائنات گردانتا تو وجہ سمجھنی دشوار نہیں کہ برعکس کے لیے شواہد موجود نہ تھے۔

ناکافی علم اور ناقص معلومات پر مستزاد تھی اساطیر جس کے بموجب سورج چاند (اور بعض) ستارے دیوی دیوتا تھے، سیارے ان کا مسکن تو مظہر فطرت ان کے چمتکار! اسی لیے عام اور ناخواندہ افراد کا اس سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ دھرتی گائے کے سینگ پر ٹکی ہے، کچھوے کی پیٹھ پر قائم ہے یا اسے اٹلس نے اٹھا رکھا ہے۔ تسلیم کی اس خو کی دو بنیادی وجوہ تھیں ایک ناکافی اور ناقابل اعتبار علم اور دوسرے مذہب کی اتھارٹی، پہلے اساطیر پھر مذہبی کتب، بزرگوں کے اقوال، مذہبی قصص اور مذہبی شخصیات کے خارق عادات کارناموں کی صورت میں۔

چلیں ماضی سے تو کوئی توقع نہ تھی لیکن لطیفہ یہ ہے کہ مسلمانان ہند میں سائنسی شعور پیدا کرنے کے داعی۔ مذہب میں عقلی معیارات کی ترویج کے حامی، مذہبی متکلم اور سائنس کی عمومی مقبولیت کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی (غازی پور: 1863ء) قائم کرنے والے سرسید احمد خاں کا یہ عالم تھا کہ وہ خود 1848ء تک زمین کے ساکن ہونے کے قائل تھے بلکہ اس ضمن میں اتنے جذباتی تھے کہ ایک مقالہ بعنوان "قول متین در ابطال حرکت زمین" رقم کرتے ہوئے یہ طرز استدلال اپنایا:

> "یونانی حکیم زمین کی گردش کے قائل نہیں ہوئے الا ماشاءاللہ اور جو لوگ کہ گردش زمین کے قائل ہیں ان کے کان تک وہی اعتراض پہنچے ہیں جن کو خود یونانی حکیموں یا ان کے متبعوں نے رد کر دیا ہے۔"(2)

حالانکہ سرسید سے آٹھ سو برس قبل البیرونی (1048ء - 973ء) ساکت زمین کے تصور پر تنقید کر چکا تھا (ویسے البیرونی کو علماء نے مرتد قرار دیا تھا)۔

دراصل یہ کائنات کا بطلیموسی (Potlemaic) تصور تھا جو سترھویں صدی تک یورپ اور اس کے کئی صدیوں بعد تک مسلم ممالک میں رائج رہا۔ خود اس تصور کی اساس بھی ایک یونانی ہیئت دان ہپارکس (Hipparchus) کے اقوال پر استوار تھی جن کی رو سے ساکن

زمین مرکز کائنات تھی۔

"قدیم یونان میں علمی تصورات:"

یونان میں سائنس اور فلسفہ کے مطالعہ کا اگرچہ براہ راست ہمارے موضوع سے تعلق نہیں لیکن یونانی مفکرین نے مشرق و مغرب دونوں کی سوچ پر صدیوں تک گہرے اثرات ڈالے ہیں اس لیے تناظر کی درستی کی خاطر مختصر ترین الفاظ میں چند اہم فلاسفروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قدیم یونان کے ایک جزیرہ ملوط کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے تین فلاسفروں کا تعلق اسی سے تھا۔ یونان کا پہلا اور باضابطہ فلسفی / سائنس دان طالیسی ملوطی (643 ق م -547 ق م) کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں زمین پانی پر تیرتی ہے اور آب علت حیات ہے۔ فلکیات میں اس کی مہارت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 585 ق م میں اس نے سورج گرہن کی درست پیش گوئی سے تمام یونان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ہم وطن اور معاصر انکسی ماندر (611 ق م - 547 ق م) سے دنیا کے پہلے نقشہ کی تیاری منسوب کی جاتی ہے۔ اس نے مظاہر فطرت اور اجرام فلکی کے بارے میں بھی تحقیقات کیں لیکن اب اس کی شہرت اس بنا پر ہے کہ حیوانات کی زندگی کے مطالعہ کے ضمن میں بعض امور کی حد تک تو یہ ڈارون کا پیش رو معلوم ہوتا ہے۔ ہیرا قلیطس (535 ق م - 470 ق م) تخلیق کائنات میں دیوتاؤں کے کردار کا قائل نہ تھا' نہ وہ انسان پر دیوتاؤں کی برتری تسلیم کرتا تھا کہ وہ تقدیر کے خالق نہ تھے۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ تم ایک دریا میں دو مرتبہ نہیں نہا سکتے کہ ہر لحہ دریا تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی کے ایک اور قول کو نظم کیا ہے:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

دیمو کراٹس (460 ق م - 370 ق م) نے سب سے پہلے ایٹم کا تصور پیش کرتے ہوئے انہیں کرۂ ارض کی تشکیل کا باعث ٹھہرایا۔ ایٹم یونانی زبان کا لفظ ہے اور لغوی معنی ناقابل تقسیم ہیں۔ وہ مروج مفہوم میں روح' وجود اور عدم کا قائل نہ تھا اور سب مظاہر فطرت کو ایٹم کی متغیر صورتیں قرار دیتا تھا۔ اور پھر ان کے بعد فلسفہ کا وہ زریں دور آتا ہے جو عبارت ہے سقراط افلاطون اور ارسطو سے!

کسی مفکر کا قول بہت مشہور ہے کہ خدا اتنا نادان بھی نہ تھا کہ کائنات تخلیق کرتا اور پھر اسے سمجھنے کے لیے یونانیوں کے آگے رکھ دیتا مگر عملاً یہی محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ یونانیوں

سے کہیں پہلے بابل، نینوا، مصر اور ہند کے مندروں کے پجاری، پروہت اور فلاسفر فلکیات کے ضمن میں بہت سی تحقیقات کر چکے تھے لیکن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ان کے نظریات معروف نہ ہو سکے۔ جبکہ یورپ کی علمی روایات کا آغاز یونان سے ہوتا ہے اس لیے ہر بات ان سے شروع کی جاتی ہے ورنہ فیثا غورث (500 ق م- 440 ق م) اور ارسطرفس -220 ق م- 143 ق م) کہیں پہلے زمین کی حرکت، چاند سورج کے گرہن اور مد وجزر کی حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے۔

"جمال پرست یونانیوں کی سائنس:"

یونانی سائنس، فلکیات یا طبعیات وغیرہ کے تذکرہ کے ضمن میں یہ واضع رہے کہ اس عہد میں ہر نوع کے مطالعات کا مشترک نام فلسفہ (لغوی مطلب: علم سے محبت، حصول دانش تھا) اسی لیے تو اس عہد کے فلسفی مابعد الطبیعیات، طبیعیات، طب، فلکیات، اخلاقیات، شاعری، ڈرامہ، خطابت، کیمیا الغرض ہر مسئلہ پر اظہار خیال کرتے تھے بلکہ ارسطو سے تو پامسٹری کا ایک رسالہ بھی منسوب ہے۔

آج کی سائنس کے برعکس یونانی سائنس عملی اور تجربی نہ تھی بلکہ نظری اور فکری تھی جس کی بنیادی وجہ جمال پرست یونانیوں کی ہاتھ سے کام کی ناپسندیدگی تھی۔ اکثر قدیم تمدنوں کی مانند یونان میں بھی محنت مشقت اور گھریلو کام کے لیے غلام تھے اور حکمران، اشرافیہ، آزاد شہری اور فوجی سبھی ہاتھ سے کام کرنا باعث ہتک جانتے تھے۔ غلاموں کی کثرت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح کے ایتھنز کی تقریباً سوا تین لاکھ کی آبادی میں سوا لاکھ غلام تھے یعنی تین اور ایک کی نسبت۔ چنانچہ تمام کام غلام کرتے تھے جبکہ اشرافیہ اور آزاد شہری فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتے، جسمانی کثرت کرتے، کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے، ڈراموں سے حظ حاصل کرتے اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کرتے۔

ہاتھ سے کام کرنے کے بارے میں اجتماعی رویہ کو زینو (430 ق م- 355 ق م) کی اس رائے کی روشنی میں با آسانی سمجھا جا سکتا ہے:

> "مہذب قومیں میکانکی ہنروں کو جائز طور پر حقیر سمجھتی ہیں کیونکہ ان سے جسم خراب ہو جاتا ہے مزدوروں کا بھی اور ان کی نگرانی کرنے والوں کا بھی۔ ان کو لا محالہ زمین پر بیٹھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ یا سارا سارا دن بھٹی کے سامنے جھکا رہنا پڑتا ہے جسمانی انحطاط کے ساتھ ان کی روح بھی کمزور ہو جاتی ہے پھر یہ ذلیل پیشے اتنا وقت چاہتے ہیں کہ انسان کو اپنے دوستوں یا ریاست کے کاموں کی

طرف توجہ دینے کی مہلت نہیں ملتی۔"[3]

دیکھا جائے تو ہمارے شاہوں' حاکموں اور ان کے زیر اثر پرورش پانے والی اشرافیہ اور جاگیرداروں کا "کمی کمین" کی صورت میں اب بھی یہی رویہ ہے کہ وہ ہاتھ سے کام کو گھٹیا' خلاف شان اور منصب و امارت کے منافی جانتے ہیں۔ انگریز حکام میں بھی یہی رویہ ملتا تھا اور اب کالے حاکم بھی یہی شان رکھتے ہیں۔ اعلیٰ افسر فون خود نہ کرے گا' اٹھ کر خود پانی نہ پئے گا' بریف کیس خود نہ اٹھائے گا اور کار کا دروازہ خود نہ کھولے گا۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ ہاتھ سے کام نہ کرنے کی وجہ سے یونانیوں کے تمام سائنسی تصورات کی اساس تجربہ کی بجائے ظن و تخمین پر استوار رہی' اب یہ ان کا رعب تھا کہ صدیوں تک ان کے قیاسات ہی نظریات بنے رہے۔ یوں ارسطو کے حوالہ سے صدیوں تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ گھوڑی اور عورت کے دانتوں کی تعداد میں فرق ہوتا ہے اس پر کسی ستم ظریف نے فقرہ چست کیا کہ وہ بیوی کا منہ کھول کر اس کے دانت تو گن سکتا تھا۔ میرے خیال میں ارسطو نہیں بلکہ اس کا غلام یہ گھٹیا کام کر سکتا تھا۔ اسی لیے جب ارسطو کا طلسم ٹوٹا تو بری طرح سے' مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی اور بقول البیرونی:

> "بہت سے لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ ارسطو کی آراء کے سلسلہ میں اسراف سے کام لیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے نظریات میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے اگرچہ ان کو یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی بہترین قابلیت کی وجہ سے صرف نظریات تشکیل دیتا تھا"[4]

"صحیفہ افلاک کا مطالعہ:"

بہرحال یونانیوں کو اس بات کا کریڈٹ یقیناً دیا جا سکتا ہے کہ عملی اور تجربی نہ ہونے کے باوجود بھی وہ کئی امور میں حقائق کے درست مطالعہ اور راست نتائج تک پہنچے تھے مثلاً ارسطو (384- 322 ق م) نے بھی فلکیات پر اپنے رسالہ میں چاند گرہن کی وجہ سے زمین کا گول ہونا تسلیم کیا تھا۔ اس ضمن میں اس کی دوسری دلیل وہی تھی جو میں نے چوتھی جماعت کے جغرافیہ کی کتاب میں پڑھی تھی یعنی دور سے آنے والا بحری جہاز ساحل پر سے بیک وقت مکمل طور پر دکھائی دینے کے بجائے بتدریج نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ لیکن ارسطو بھی کرۂ ارض کے غیر متحرک اور مرکز کائنات ہونے کا قائل تھا۔ تاہم برعکس سوچ رکھنے والے بھی تھے۔ برٹرینڈرسل "گلیلیو" پر اپنے مقالہ میں رقم طراز تھے:

"خیر جو کچھ بھی ہو یونانیوں نے علم فلکیات میں جو کچھ دریافت کیا تھا یقینی طور پر

قابل داد ہے۔ انہوں نے بہت جلد یہ اندازہ کر لیا تھا کہ زمین گول ہے اور کچھ تو کوپر نیکس کے نقطۂ نظر تک پہنچ گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ زمین گھومتی ہے آسمان نہیں گھومتا اور اسی وجہ سے روزمرہ سورج اور ستارے حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ ارشمیدس گیلون کے بادشاہ سیراکیوس کے نام ایک تحریر میں کہتا ہے کہ:

"ساموس کے ارسٹارکس نے چند مفروضوں کی بنیاد پر ایک کتاب لکھی ہے جس کے بنیادی قضیہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ کائنات جیسی کہ نظر آتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ بڑی ہے۔ اس کا مفروضہ یہ ہے کہ ٹھہرے ہوئے ستارے اور سورج حرکت نہیں کرتے۔زمین سورج کے گرد دائرے کی صورت میں مدار پر گھومتی ہے اور سورج مدار کے مرکز میں پڑا رہتا ہے۔"

چنانچہ یونانیوں نے نہ صرف زمین کی یومیہ گردش کا پتہ چلا لیا تھا بلکہ وہ اس کی سورج کے گرد سالانہ گردش کو بھی مان گئے تھے۔ یہ ایک یونانی ہی کے خیالات اور دریافت تھی جس نے کوپر نیکس کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ اس کا احیاء کرے(5)

اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ ارسطوفس سیموی نے دن رات اور موسموں کی تبدیلی کے بارے میں بھی درست قیاس کیا تھا۔"

حواشی:

1- "گلیلیو" از برٹرینڈ رسل- مشمولہ: "تخلیقی رویے" مترجم شہزاد احمد ص: 48 _ 46

2- "مقالات سر سید" مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی- جلد شاذ دہم میں یہ مقالہ شامل ہے ص: 500--- 487

3- بحوالہ: "موسیٰ سے مارکس تک" از سبط حسن' ص :60

4- بحوالہ: "ارمان اور حقیقت" از ڈاکٹر عبدالسلام' مترجم شہزاد احمد ص: 86

5- بحوالہ: "تخلیقی رویے" ص: 39

2- "جہالت کی کشتی خوف کے بادبان"

کلاڈیمس بطلیموس (Claudius Ptolemaeus,Potolemy) وہ یونانی الاصل مصری ہے جسے ہیئت، فلکیات، ریاضی اور جغرافیہ میں صدیوں تک اتھارٹی تسلیم کیا جاتا رہا- عربی اور یونانی الفاظ کے ملاپ سے بنائے گئے نام والی اس کی کتاب (120ء "Al. Majest:" — لمجطی : لغوی مطلب، شاندار، اعلیٰ، بزرگ ترین) نے سترھویں صدی تک مغرب کی دانش اور درس گاہوں پر راج کیا، بطلیموس کے کائناتی ماڈل میں دائروں کی صورت میں ہشت افلاک کا تصور پیش کرتے ہوئے ان سے مخصوص چاند، سورج، سیاروں (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل) اور ساکت ستاروں کا مقام متعین کر کے غیر متحرک کرۂ ارض کو مرکز کائنات قرار دیا گیا تھا- عربی اور فارسی تراجم کے باعث بطلیموس مشرق میں بھی مقبول رہا لیکن کب تک ؟ ایک دن اس کے نظریہ کی خامیاں سامنے آنی تھیں مشرق میں نصیرالدین طوسی نے بطلیموس کے ماڈل پر سخت اعتراضات کیے، اس ضمن میں الزر قالی اور البطرونی کے اسماء بھی آتے ہیں جو زمین اور ستاروں کی گردش کے بارے میں لکھ چکے تھے- بقول ڈریپر:

"یورپ زر قالی کی تالیفات کے ترجمہ سے فلکیات سے روشناس ہوا"

"فلکیات کی تاریخ کا روشن ستارہ:"

بطلیموسی تصور کائنات کی کامل شکست پولش طبیب، قانون دان، ریاضی دان، ہیئت دان نکولس کوپر نیکس (Nicholes Copernicu,s پیدائش : 19 فروری 1473ء وفات : 24 مئی 1543 کی محنت اور لگن کی مرہون منت ہے- کوپر نیکس کا مروج نام لاطینی ہے- اس کی اپنی زبان میں اصل نام کچھ یوں بنتا ہے : Canon Nicolas Kopperigk

کوپر نیکس پولینڈ سے ترک وطن کے بعد ایسٹ پرشیا میں قیام پذیر رہا- اس کے بارے میں جو شخصی معلومات ملتی ہیں ان کی روشنی میں وہ خاصہ کم گو اور کم آمیز نظر آتا ہے وہ عمر بھر طرح طرح کے واہموں کا شکار رہا اسی لیے مارے ڈر کے اپنے خیالات چھپائے رکھے- وہ 1510ء تک بطلیموسی نظام کی خامیوں سے آگاہ ہو چکا تھا مگر چرچ کے خوف کی وجہ سے برملا اظہار سے گریزاں رہا اور صرف مخصوص احباب یا بعض علم دوست حضرات کے سامنے

ہی اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔ عمر کے آخری ایام میں یعنی 1540ء میں وہ کتاب چھپوانے پر راضی ہوا۔ روایت ہے کہ انتقال والے دن اس نے اپنی کتاب دیکھی، دماغ کی شریان پھٹنے سے انتقال ہوا۔ کتاب کا نام ہے:

"On The Revolutions Of The Celectial Spheres"

کہا جاتا ہے کہ کتاب کے پہلے ایڈیشن کی ہزار کتابیں بھی نہ بکیں اور آنے والی چار صدیوں میں صرف چار ایڈیشن چھپ سکے۔ بہرحال فلکیات کی تاریخ میں وہ ایک روشن ستارے کی مانند ہے۔ چاند کے سب سے بڑے کریٹر (قطر: 58 میل) کا نام کوپر نیکس کریٹر ہے۔

کوپر نیکس کے خیالات نے تمام یورپ میں آگ لگا دی۔ کیتھولک چرچ اور اسی چرچ کا باغی مارٹن لوتھر بھی نے اس کی مخالفت کی کہ سورج کا مرکزی ہونا اور کرۂ ارض اور دیگر سیاروں کا اس کے گرد اپنے اپنے مدار پر گردش کناں ہونا بائبل کے تصور تخلیق کے برعکس تھا۔ لہٰذا کوپر نیکس کو ملحد، کافر، بدعتی قرار دے کر 1616ء میں پوپ نے اس کی کتاب کو مذہبی نقطۂ نظر سے ممنوع اور ناقابل مطالعہ قرار دے دیا۔ بعد میں جب دیگر شواہد سے تصدیق ہو گئی تب کہیں جا کر عیسائی دنیا نے کوپر نیکس کے نظام شمسی کے اس تصور کو درست تسلیم کیا جو اس صدی کی ابتدا ہوئی دوسری تیسری دھائی تک مقبول اور معروف رہا۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ کوپر نیکس کے مشاہدات فلکی نہ ہونے کے برابر ہیں یعنی کم سے کم 27 اور زیادہ سے زیادہ 20 کی تعداد میں— لیکن یہ اس کی قوت استخراج کا کمال ہے کہ وہ درست نتائج تک جا پہنچا۔ اب یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ حالات نے اسے اتنا خوفزدہ رکھا کہ زندگی میں اپنے نتائج کی علمی حلقوں میں پذیرائی نہ دیکھ سکا۔ فلکیات میں کوپر نیکس کی شہرت کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی مسلم ہے کہ غیر جانبدار محققین نے اس کی دریافتوں پر مسلم سائنس دانوں سے اخذ و استفادہ کے الزامات بھی عائد کیے ہیں ڈاکٹر فواد سیزگیں "عربی و اسلامی علوم کا یورپ کی تحریک احیائے علوم پر اثر" میں لکھتے ہیں:

> "1956ء سے اب تک میں نے کئی ایسی تحقیقات کا اعادہ کیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوپر نیکس نے سیاروں کی گردش سے متعلق اپنے نظریات ان مسلمان فلک شناسوں سے اخذ کیے تھے جو تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہو گزرے تھے۔ محققین کے لیے اس امر کی وضاحت میں بڑی دشواری رہی کہ ان فلک شناسوں کی کتابیں کوپر نیکس تک کیونکر پہنچیں لیکن اب ہمیں قطعی

دلیل کی بنیاد پر یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عربی فارسی سے کتابوں کے یونانی ترجمے کے لیے بحر اسود کے ساحل پر ایک مدرسہ تو طرابزون (Trabzon) میں قائم ہوا تھا اور دوسرا چودھویں صدی میں قسطنطنیہ میں قائم ہوا۔ ان دونوں مدرسوں کے لوگ ان کتابوں کی اہمیت سمجھتے تھے اور تازہ ترین کتب کا یونانی میں ترجمہ کر کے اپنی مغربی برادری کو بھجواتے رہتے تھے۔"(۱)

(ترجمہ: ڈاکٹر خورشید رضوی)

کوپر نیکس کے نتائج کو سائنسی مشاہدہ کی سند دینے والے دو افراد تھے ایک جرمن نژاد یوہانس کیپلر (Johannes Kepler) جس نے یونانیوں، بطلیموس اور کوپر نیکس کی اس غلطی کی تصحیح کی کہ سورج کے گرد زمین اور سیاروں کی گردش مدور کے بجائے بیضوی مدار میں ہے اور دوسرے تھا گلیلو گلیلی!

"دوربین کی ایجاد:"

اسی اثنا میں ایک اور اہم واقعہ ہوا جس نے مشاہدہ افلاک کو ظن و تخمین اور قیاسات سے قطعی طور پر آزاد کر کے براہ راست مشاہدہ سے فلکیات کے علم میں انقلاب برپا کر دیا۔ یہ تھی دوربین کی ایجاد!

وینس شیشہ گری اور کانچ کے ظروف کے لحاظ سے ہمیشہ ہی سے یورپ بھر میں ممتاز رہا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ کارگہ شیشہ گری ہو اور اس سے اگلا منطقی قدم یعنی عینک نہ بنائی جاتی چنانچہ تیرھویں صدی تک کسی نہ کسی صورت میں عینک معرض وجود میں آچکی تھی مگر دوربین کو ابھی مزید دو صدیاں انتظار کرنا تھا اور جب دور بین بنی تو وہ بنیادی طور پر بحری جہازوں اور بری فوجیوں کے لیے بنائی گئی۔ فلکیات کا علم ہنوز قیاسات پر مبنی تھا اور براہ راست مشاہدہ کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی تھی کہ سب کچھ تو ارسطو اور بطلیموس کہہ چکے تھے۔

دوربین کی تیاری کے سلسلہ میں کئی اصحاب کے اسماء آتے ہیں تاہم دو لینز والی دوربین کی ساخت کا کریڈٹ بالعموم ایک ڈچ باشندہ ہانس لیپرشی (Hanc Leppershey) کو دیا جاتا ہے جس نے اکتوبر 1608ء میں Binacular کی پیٹنٹ کے لیے درخواست دی، جلد ہی اس ایجاد کا شہرہ ہو گیا۔ اگرچہ محققین کے بموجب گلیلو سے پہلے ایک انگریز تھامس ہیریٹ (Thomas Harriot) دوربین سے چاند ستاروں کا مشاہدہ کر چکا تھا مگر اس ضمن میں شہرت گلیلو ہی کو حاصل ہوئی اتنی کہ مدت تک اسی کو دوربین کا موجد سمجھا جاتا رہا۔ وہ موجد تو

نہ تھا مگر اتنا ہے کہ اس نے اپنی ضروریات کے مطابق اپنی دوربین خود بنائی تھی جو اس کے نام سے منسوب ہے یعنی گلیلین ٹیلی سکوپ۔ پہلے یہ اشیاء کو تین گنا بڑا کر کے دکھاتی تھی مگر گلیلیو اس کی استعداد بڑھاتا گیا حتیٰ کہ اس کی قوت دیدار میں تیس گنا اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گیا یوں کائنات پر اسرار اور بعید از فہم ہونے کے بجائے کھلی کتاب میں تبدیل ہو گئی اور یہی کچھ گلیلیو نے کیا

"مشاہدہ افلاک:"

جب اگست 1609ء کی ایک تاروں بھری شب اس نے اپنی دوربین کا رخ آسمان کی طرف موڑا تو کتاب کائنات کے ایک اہم قاری کی حیثیت سے قرطاس ایام پر اپنا نام رقم کرا لیا کہ جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں ارسطو اور بطلیموس بھی اس سے نا آشنا تھے۔ آسمان پر غبار نما ملکی وے لا تعداد ستاروں پر مشتمل نظر آئی' چاند کی نا ہموار سطح اور اس پر آتش فشانوں کے دہانے دیکھے' زہرہ کی گردش کے مختلف مراحل کا مشاہدہ کیا' زحل کے حلقوں اور سورج کے دھبوں کا سراغ لگایا۔ 7- جنوری 1610ء کو اس نے مشتری کا طواف کرتے چار ذیلی سیارچے دریافت کیے جو اب اسی کے نام پر "Galilean Satelites" کہلاتے ہیں۔ امریکہ کے خلائی ادارہ "ناسا" نے مشتری کے مطالعہ کے لئے جو خود کار سیٹلائیٹ چھوڑی اور جو مشتری کے گرد گردش کناں ہے اس کا نام بھی "گلیلیو" رکھا گیا۔ زمین اور مختلف سیاروں کے مداروں کے بارے میں مزید شواہد پیش کیے الغرض! اپنے عہد کی فلکیات میں انقلابی تبدیلیاں لانے کا موجب بنا۔

اگرچہ گلیلیو 1597ء سے ہی کوپر نیکس کے نظام شمسی میں دلچسپی لے رہا تھا اور 50-1604ء تک اس ضمن میں خاصہ کام بھی کر چکا تھا مگر 1609ء ہی میں اس کے اصل کام کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے چنانچہ جب ان شبینہ مشاہدات پر مبنی کتاب "Siderus Huncius" (Stray Messengers) مارچ 1610ء میں طبع ہوئی تو یہ صحیح معنوں میں سنسنی خیز ثابت ہوئی اور گلیلیو تمام یورپ میں مشہور ہو گیا۔

گلیلیو کے دور بینی مشاہدات کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوتے اور اس کے اخذ کردہ نتائج میں کتنی ہی ریاضیاتی صداقت کیوں نہ ہوتی لیکن زمانہ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ چرچ ان کے لیے تیار نہ تھا چنانچہ ارسطو کے پیرو کاروں اور بطلیموس کے مقلدین کے ساتھ اس کے جس تنازعہ کا آغاز ہوا وہ 1613ء تک اتنی شدت اختیار کر گیا کہ 1615ء میں پوپ پال پنجم نے اس بدعتی گلیلیو کے خیالات کی چھان پھٹک کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کر دیا جس

نے فروری 1615ء میں اسے مجرم قرار دیتے ہوئے اس کی زبان بندی کا حکم صادر کیا اگلے برس جس کی چرچ نے توثیق کر دی۔

"جدید تجربی سائنس کا — بانی گلیلیو:"

15۔ فروری 1564ء کو جنم لینے والا گلیلیو عمر بھر اپنے عہد کی مقلدانہ ذہنیت' غیر تخلیقی سوچ اور ذہنی جبر پر مبنی مذہبی رویوں کے خلاف صف آرا رہا۔ اس کی زندگی کا مطالعہ کریں تو جرات' بے باکی' ذہنی اپج' خلاقی اور طرز کہن پہ نہ اڑنا۔ اس کی شخصیت کے تشکیلی عناصر قرار پاتے ہیں۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے سائنس میں ظن و تخمین کے بجائے مشاہدات اور تجربات کی عملی اہمیت کا ادراک کیا۔ گلیلیو سے پہلے سائنس کے نام پر جو کچھ ملتا تھا وہ محض قیاسات' مفروضوں اور اندازوں پر مبنی تھا یا پھر ماضی کے حوالے سے کچھ مسلمات تھے اور ماضی کیا تھا وہ ارسطو اور دیگر سربر آوردہ یونانی مفکرین کے تصورات' افکار' آراء اور اقوال کے مترادف تھا بالخصوص ارسطو جسے معلم اول کہا جاتا تھا۔ اہل دانش' اہل تحقیق اور اہل علم پر اس کا کتنا اثر تھا اسے صرف اس ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ارسطو کی سند پر صدیوں سے یہ تسلیم کیا جاتا رہا تھا کہ مختلف الوزان اجسام کے بلندی سے زمین پر گرنے کی رفتار ان کے وزن کے تناسب سے ہو گی مگر 1592ء کی ایک سہانی صبح گلیلیو نے پیسا کے لیننگ ٹاور سے ایک اور دس پونڈ کے باٹ نیچے پھینک کر ارسطو کی عملاً تردید کر دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گلیلیو کے اس تجربی رجحان کو سراہتے ہوئے ماضی کے مسلمات کی چھان پھٹک کی جاتی مگر ہوا برعکس یعنی وہ ملزم قرار پایا:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

گلیلیو نے فلکی مشاہدات جاری رکھے۔ جب اس کا دوست اربن ہشتم پوپ بنا تو گلیلیو کو کچھ بہتری کی صورت نظر آئی چنانچہ اس نے چرچ کی پیشگی اجازت اور مسودہ کی منظوری کے بعد 1632ء میں وہ معرکتہ الاراء کتاب لکھی جو فلکیات میں نئی بوطیقا قرار پائی:

"Dialogue Concerning The Two Chief World Systems- Ptolematic And Coper Nican."

افلاطون کے مکالماتی اسلوب میں قلم بند کی گئی کتاب گلیلیو کی توقع سے بڑھ کر ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس کا انتساب پوپ کے نام تھا مگر پوپ ہی سب سے زیادہ بر افروختہ

تھا۔ 12 اپریل 1632ء کو مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا۔ کتاب ممنوع اور قابل سوختنی قرار پائی۔ عمر بھر کے لیے گھر میں نظربندی کا حکم سنایا گیا۔ عبرت کے لیے گلیلیو کا معافی نامہ تمام جامعات میں پڑھ کر سنایا گیا۔

نظربند گلیلیو نے گھر میں بھی مشاہدات فلک جاری رکھے' اس مرتبہ کتاب کا مسودہ ہالینڈ سمگل کیا گیا اور 1638ء میں لیڈن سے اس کا آخری اور عظیم کارنامہ شائع کیا گیا!

"Discourses And Mathematical Demonstorations
Relating To Two New Sciences."

اس کا انگریزی ترجمہ 1665ء میں اور لاطینی ترجمہ 1690ء میں کیا گیا۔

گلیلیو جس نے عمر بھر ستاروں سیاروں اور چاند سورج کا مشاہدہ کیا عمر کے آخری چار برس قوت بینائی سے محروم بسر کیے مگر 8 جنوری 1642ء کو انتقال والے دن تک وہ ایسا شخص بن چکا تھا جس نے تقلید کے کلٹ اور جہالت کی منطق پر سب سے پہلے اور سب سے کڑی ضرب لگائی۔ خود اس کے بقول ریاضی مکمل ترین منطق ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ ریاضی دروغ نہیں!

"علم الیقین بمقابلہ حق الیقین:"

صوفیاء نے علم کے تین ذرائع قرار دیئے ہیں علم الیقین' عین الیقین اور حق الیقین۔ خارجی شہادت پر کسی امر کا تسلیم کرنا علم الیقین ہے مثلاً کسی معتبر کی سند پر یہ باور کر لینا کہ فلاں مقام پر آگ لگی ہے' اگر اس مقام پر جا کر بچشم خود آگ کا مشاہدہ کریں تو یہ عین الیقین ہو گا جبکہ انگلی جلا کر آگ کا تجربہ کرنا حق الیقین ہے۔ بالفاظ دیگر حصول علم خبر' مشاہدہ اور تجربہ کا مرہون منت ہوتا ہے۔

راہ سلوک کے ان تین مراحل کو سائنسی جستجو پر منطبق کرنے پر کہا جا سکتا ہے کہ سائنس دان علم الیقین پر تو بالکل یقین نہیں رکھتا کہ یہ سائنسی رویہ کی روح ہی کے منافی ہے البتہ دینیات' الہیات' مذہبی افکار' ملفوظات وغیرہ کی زیادہ تر اساس اسی پر استوار ہوتی ہے۔ سائنس دان عین الیقین سے آغاز کار کرتے ہوئے خبر کی سند اور مفروضہ کے مسلمہ بن جانے کی توثیق/تردید/تکذیب کو سعی کناں ہوتا ہے جبھی تو کسی بھی مفروضہ کو اس وقت تک نظریہ کا مقام نہیں ملتا جب تک مشاہدات اور تجربات کی کسوٹی پر اسے اچھی طرح سے پرکھ نہیں لیا جاتا۔ اسی لیے سائنس دان مشاہدہ (عین الیقین) سے تحقیقی سفر کا آغاز کر کے تجربہ (حق الیقین) کی منزل تک پہنچ کر نتائج کا استخراج کرتا ہے۔

صوفی کا عین الیقین ظاہر کی آنکھ کا تماشا نہیں ہوتا بلکہ وہ باطن کی آنکھ (بصیرت) سے دنیا اور اس کے مظاہر میں وحدت اور کثرت کا کھیل دیکھتا ہے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

جبکہ نظیر اکبر آبادی کے بموجب:

نظیر سیکھے سے علم رسمی بشر کی ہوتی ہیں چار آنکھیں
پڑھے سے جس کے ہوں لاکھ آنکھیں وہ علم دل کی کتاب میں ہے

ظاہر کی آنکھ کمزور ہوتی ہے اس لیے سائنس دان اس کی تقویت کے لیے آلات تیار کرتا ہے جس کی ایک انتہا پر دوربین ہے تو دوسری پر خوردبین— اور پھر ان دو کے درمیان لاتعداد آلات اور تجربہ گاہیں- یہ سب عین الیقین کو حق الیقین کے قریب تر کرنے کے لیے ہے- اس عمل کی ایک انتہا پر نظریہ اضافیت ہے تو دوسری پر کوانٹم تھیوری!

آج گلیلو اسی لیے اہم ہے کہ اس نے سب سے پہلے ارسطو اور بطلیموس کی سند پر مبنی علم الیقین کے برعکس عین الیقین سے حق الیقین تک رسائی کی سعی کی ہے!

اگر اس تناظر میں دیکھیں تو پھر بنیاد پرستی علم الیقین بمقابلہ عین الیقین قرار پاتی ہے کہ خبر' سند' مسلمات ہی اساس فکر ہوتے ہیں- اسی لیے عین الیقین / حق الیقین کی سند علم الیقین تک محدود شخص کے لیے ناقابل تسلیم اور ناقابل قبول ہوتی ہے-

22 جون 1633ء سے اسی لیے— کم از کم یورپ کی حد تک— بنیاد پرستی کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے کہ اس دن عقل vs عقیدہ' علم vs جہل' روایت vs درایت' اجتہاد vs اعتقاد اور عالم vs پادری کی کشمکش کا واضح طور پر آغاز نظر آتا ہے- اگرچہ بظاہر اس دن عقل و علم اور سائنس کی شکست ہوئی مگر درحقیقت گلیلو کا معافی نامہ ہی چرچ کا اعتراف شکست تھا کہ زبان بندی مسئلہ کا حل نہیں' طاقت کا اظہار ہے اور طاقت ور کا ہمیشہ سچا ہونا لازم نہیں!

"تاریک یورپ تاریک اوہام:"

اگر اب تک کے لکھے سے یہ اندازہ ہو رہا ہو کہ صرف گلیلو ہی چرچ کے اس بے لچک رویہ کا شکار بنا تو یہ درست نہیں کیونکہ چرچ اور پادری ہمیشہ سے ہی بے لچک رہا ہے- ذہنی افلاس' علمی پسماندگی اور عمومی جہالت کے تاریک یورپ میں مذہب کے نام پر چرچ اور پوپ کے ہاتھوں خرد دشمنی پر مبنی جس رویہ نے فروغ پایا اور اس کے نتیجہ میں اوہام پرستی نے جس طرح یورپ کو اپنے پنجہ میں جکڑا اسے اب یورپ کی تہذیبی تاریخ میں "

پیش لفظ" کی حیثیت حاصل ہے۔

کولن ولسن عقلی رویوں کے ضمن میں "عیسائیت کو بربادی" قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہے:

"312 عیسوی میں بادشاہ کونسٹن ٹائن کے عیسایت قبول کر لینے کے بعد یہ زیر عتاب غریبوں کا مذہب نہ رہی کہ اچانک ہی عیسائی ارفع مقام پر جا پہنچے۔ اب عیسائیوں نے ظلم و تشدد کا ایسا بازار گرم کیا کہ نیرو بھی ان پر رشک کرتا ہو گا۔ سکندر کا کتب خانہ جس میں دیگر مواد کے ساتھ خود ارسطو کی ذاتی کتابوں کا ذخیرہ بھی محفوظ تھا۔ شاہ تھیوڈوسس (Theodosios) کی پشت پناہی سے سکندریہ کے آرچ بشپ نے نذر آتش کرا دیا کیونکہ علم شر تھا۔ کیا علم کی وجہ سے آدم جنت سے بیدخل نہ کیا گیا؟ ویسے بھی اس کتاب خانہ کے بعض محققین پر کیمیا گری کا شبہ تھا۔ وہ گھٹیا دھاتوں سے سونا بنا رہے تھے اور پارس پتھر (فلا سفرز سٹون) کی جستجو سے حیات ابدی کا بھید جاننے میں مشغول تھے۔"

"دآ کلٹ"

ص: 215).

جہالت اور اس کی پیدا کردہ اوہام پرستی کے متنوع مظاہر میں سے صرف "وچ ہنٹنگ" کی مثال ہی کافی ہے۔ بلا مبالغہ ہزاروں مردوں اور عورتوں کو جادوگر اور جادوگرنیاں قرار دے کر پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا گیا یا زندہ جلا دیا گیا (ان میں جون آف آرک بھی تھی) یہ سب اس لیے روا تھا کہ چرچ کے بمو جب شیطان اپنے سینگوں' لمبی دم اور کالی زبان کے ساتھ جسمانی طور پر موجود تھا۔ جادوگرنیاں اس کے ساتھ ہم بستری کرتی تھیں تو مرد اس کے پاس اپنی روح رہن رکھ کر اس سے جنسی قوت' مال و دولت اور دیگر شیطانی قوتیں حاصل کرتے تھے۔ بعض افراد میں شیطان حلول کر جاتا تھا بعض کو بد شکل اور بد ہیئت بنا ڈالتا جبکہ بعض کو جانوروں کا روپ دے کر ان سے جرائم کا ارتکاب کراتا۔ شیطان کی پوجا ہوتی تھی جس میں بکرا شیطان کی نیابت کرتا۔ ان خفیہ تقریبات میں اجتماعی جنس پرستی ہوتی' انسانی جانوں۔ بالعموم باکرہ دوشیزہ یا بچہ۔ کی بلی دی جاتی اور یوں شیطان کے چیلے بن کر مرادیں پاتے۔ یہ سب تھا یا نہیں اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ (اگرچہ کولن ولسن نے "آ کلٹ" میں اس ضمن میں بڑی دلچسپ تفصیلات فراہم کی ہیں) لگتا ہے کہ اس عہد کا پادری خدا کے مقابلہ میں شیطان میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ عام جاہل

فسانوں کی تو بات چھوڑیئے خود مارٹن لوتھر کو یقین تھا کہ اس کی ملاقات شیطان سے ہوئی تھی اور بعض مذہبی مسائل پر اس سے مباحثہ ہوا تھا۔(2)

اس ذہنی رویہ نے جب تخلیقی سطح پر اظہار پایا تو گوتھک ٹیلز' ویمپائر' مافوق الفطرت کردار' خارق عادات واقعات اور ہانٹڈ ہاؤسز کے فسانے تخلیق کیے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ گوئٹے کے "فاؤسٹ" کا محرک تخلیق بھی یہی رہا ہو اور شیکسپیئر نے بھی اس کے زیر اثر "میکبتھ" کے آغاز میں تین جادو گرنیوں کو پیش کیا ہو۔

ہم یورپ کی سائنس' ٹیکنالوجی' فلسفہ' تسخیر قمر اور خلائی تحقیقات سے بے حد مرعوب ہیں مگر جو خوف' اوہام یا عقائد اجتماعی لاشعور کا حصہ بن جائیں ان سے مفر تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے اور اس امر کا اندازہ شیطان کے سلسلہ میں بھی کیا جا سکتا ہے چونکا دینے والی یہ اخباری رپورٹ بلا تبصرہ پیش ہے:

اگر قیامت قریب ہونے کی علامتوں میں سے ایک علامت شیطان کا کسی نہ کسی شکل میں ظہور بھی ہے تو پھر گزشتہ 3 سالوں میں شیطان دنیا کے مختلف ممالک میں اپنی مکروہ خوفناک شکل میں ظاہر ہو چکا ہے اور قیامت کے قریب ہونے کا ثبوت ہے۔ وہ امریکہ کی ریاست میامی میں خوفناک سمندری طوفان اینڈریو کے دوران دیکھا گیا۔ سسلی میں ماؤنٹ ایٹنا کی چوٹی پر اڑتے ہوئے خوفناک بادلوں میں اس کی مکروہ منحوس شکل دیکھی گئی اور "نجات دہندہ" ڈیوڈ جولیس کے احاطے میں بھی وہی شیطانی شکل ایک دفعہ پھر نمودار ہوئی۔ اسے افغانستان کی ایک گہری غار سے نکلتا دیکھا گیا۔ سائبریا میں ڈرلنگ کے دوران ایک کریہہ النظر اور دہشت ناک شیطانی منظر سامنے آیا اور اسی طرح کا لرزہ انگیز واقعہ الاسکا میں بھی پیش آ چکا ہے اور اب ہیٹی کے دارالحکومت پورٹ اوپرنس میں شیطان اپنی پوری دہشت ناکیوں اور خوفناکیوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر نمودار ہوا ہے۔ واقعہ یوں بیان کیا جا رہا ہے کہ ہیٹی میں امریکی فوجوں کے پہنچنے سے تین روز پہلے پورٹ اوپرنس میں ایک ٹیکسٹائل مل میں آگ لگ جانے سے گہرے اور گھنے بادل بلند ہوتے گئے اور اچانک ان بادلوں میں پھر وہی مکروہ شکل نمودار ہو گئی۔ بائبل کا علم رکھنے والے اسے قیامت کے قریب ہونے کی علامت سمجھ رہے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق شیطان کا مکروہ ظہور اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہمارے مابین ہر وقت موجود اور اپنے ازلی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے

کے لیے ہماری تباہی پر تلا ہوا ہے۔ امریکہ کے ایک مشہور پادری بلی گراہم نے ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے شیطان حقیقت میں ہمارے مابین موجود ہے اور وہ اپنا تباہ کن اثر و رسوخ استعمال میں لاتے ہوئے انسان کی تباہی کے درپے ہے اسی دنیا میں نفرت اور تشدد کے واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ہمارے خلاف سرگرم عمل ہے۔ خیر و شر کا ازلی ڈرامہ جاری ہے لیکن روسی مصنف ذیسٹوو سکی کے بقول ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ جنگ انسان کے دل میں لڑی جا رہی ہے۔ انسان کو اپنا آلہ کار بنانے یا اسے تباہی کے غار میں دھکیلنے کے لئے ہر وقت مصروف ہے۔"

(روزنامہ جنگ لاہور، 8 نومبر 1994ء)

"خوف کی تثلیث:"

سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکا۔ صدائے احتجاج کیوں نہ بلند ہوئی، بغاوت کیوں نہ ہوئی؟

دراصل ہزار برس قبل کے یورپ کی جہالت، ذہنی پسماندگی، عقلی جمود اور ان سب کا باعث بننے والے چرچ کی قوت کا اندازہ لگانا بھی محال ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ یورپ میں مقدس تثلیث کے بر عکس خوف کی تثلیث ملتی تھی خدا— چرچ— حکومت! یہ تھے خوف کی اس تثلیث کے بے حد قوی خطوط اور زاویے۔ ان میں سے ہر ایک انفرادی حیثیت میں تو قوی تھا ہی مگر حصول مقصد اور امکانی افادہ کے لیے ان کا قوی اتحاد اور بھی خطرناک ثابت ہوتا تھا۔ چرچ نے خدا کے نام پر ہر ملک میں متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ پوپ مذہبی راہنما سے بڑھ کر ایسے پر قوت بادشاہ میں تبدیل ہو چکا تھا کہ بادشاہ بھی اس سے ٹکرانے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ خوف کی اس تثلیث کی اساس بائبل پر استوار تھی۔ اب جہاں تک عہد نامہ قدیم کا تعلق ہے تو تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح یہودیوں نے زبانی روایت کو عبرانی اور کوئنی (Koine : کلاسیکی یونانی کے بعد کی زبان) میں لکھنا شروع کیا اور مختلف اوقات میں مختلف نقول کی بنا پر آج عہد نامہ قدیم (اور اس کے ساتھ عہد نامہ جدید کو بھی شامل کر لیں) کا کوئی اصلی، حقیقی اور بنیادی نسخہ موجود نہیں۔ بائبل کے انگریزی تراجم کا سلسلہ کہیں چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے 1382ء میں Wycliffe کا پہلا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد بھی مختلف تراجم ہوئے حتیٰ کہ جیمز اول نے مستند نسخہ تیار کرایا اور یہی بالعموم مروج ہے۔ جہاں تک سب سے پہلے عہد نامہ

قدیم کا تعلق ہے تو "محققین کے بموجب دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمان کے عہد حکومت میں اسے "J" نے لکھا (خدا کے لیے عبرانی نام (Jehovah) عہد نامہ قدیم کے ابتدائی نسخوں میں کئی مقامات پر "J" کا نام آتا ہے" (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: لائف میگزین دی بائبل ایشو- 19 اپریل 1965ء)

ویسے اپنے مشرق میں بھی خوف کی اس تثلیث کا کافی سے زیادہ عمل دخل رہا ہے اور پاکستان کی حد تک تو (بالخصوص ضیاء کی آمریت کے عہد میں) اب بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے- خدا کی رحیمی اور کریمی کی صفات اجاگر کرنے کے برعکس طرح طرح کے عذابوں کے مسلسل تذکرہ سے مذہب کے نام پر خوف اور دہشت کی جو فضا قائم کی جاتی ہے اس میں "مرنے کے بعد کیا ہو گا" قسم کی کتابیں مزید اضافہ کرتی ہیں- ملائیت ہمارے ہاں وہی کردار ادا کرتی ہے جو تاریک یورپ میں چرچ کا تھا

عالمی تناظر میں خوف کی اس تثلیث کا مطالعہ کرنے پر یہ مسیحی اور اسلامی معاشروں ہی کی اساسی خصوصیت نظر نہیں آتی بلکہ ہر عہد کے ہر نوع کے معاشروں میں اس کی کارفرمائی تہذیبی، مذہبی اور سیاسی تاریخ کا حصہ رہی ہے- نام بدلتے رہتے ہیں، مقامات بدلتے رہتے ہیں، حالات بدلتے رہتے ہیں مگر اساسی کردار تبدیل نہیں ہوتا پادری، ملا، برہمن، ربی، پجاری، پروہت اور قدیم قبائل اور غیر متمدن معاشروں کا کاہن اور ساحر— سب ایک ہی رویہ کے مختلف نام ہیں- خوف کی یہ تثلیث بھی بنیاد پرستی کی اساس اور جواز فراہم کرتی ہے- معاشرہ بدل سکتا ہے مگر اساسی محرک نہیں بدلتا- بنیاد پرستی بطور ایک اصطلاح کم عمر ہی سہی مگر بطور رویہ، ہتھیار اور آلہ— یہ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ انسانی معاشرہ اور اس میں مذہب!

جہاں تک یورپ میں کلیسائی عدالتوں کی خوف سے پر خونیں تاریخ کا تعلق ہے تو یہ طویل بھی ہے اور دردناک بھی- مسیحیت جو کبھی غریبوں کے لیے غریبانہ مذہب تھی، کلیسا کے جبر کے نتیجہ میں مذہبی عفریت میں تبدیل ہو کر رہ گئی- اگرچہ چوتھی صدی عیسوی سے اس رویہ کے سراغ ملتے ہیں مگر دسویں تا سترھویں صدی تک کلیسا نے بدعتیوں، بے دینوں، ملحدوں، کافروں، جادوگروں اور جادوگرنیوں کی صورت میں بلا مبالغہ ہزاروں مرد و زن کو موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ پوپ انوسنٹ چہارم نے اذیتیں دینے اور پوپ

گریگری نہم نے موت کی سزا دینے کا قانون منظور کر لیا تھا۔ سزا دینے والے کی جائداد بحق چرچ ضبط کر لی جاتی تھی اس میں سے کچھ حصہ بادشاہ کو بھی ملتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اسے، سیاسی اور ذاتی مخالفین سے انتقام کا ذریعہ بھی بنا لیا گیا۔

اپنی سختی، اعتراف گناہ کے لئے روا رکھی وحشیانہ سزاؤں اور پر تشدد اموات کے لحاظ سے جرمنی اور سپین کے چرچ اور پادریوں نے خصوصی شہرت حاصل کی تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق 1700-1400ء میں کوئی پانچ لاکھ مرد و زن جادو گری کے جرم کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ 1316ء میں پوپ نے جادو گری کو کفر قرار دیا۔ یوں یہ خدا کے خلاف گناہ بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جسے چاہا پکڑ لیا اس پر شیطان سے ساز باز کا الزام عاید کیا۔ کافر قرار دیا اور آگ کے آلاؤ میں ڈال دیا۔ 1630ء میں سب سے پہلے سویڈن میں ان مذہبی عدالتوں کے اثرات ختم کیے گئے اور پھر آہستہ آہستہ یورپ کے دیگر ممالک بھی ان سزاؤں سے اجتناب کرنے لگے۔ 1736ء میں انگلستان میں جادو گرنیوں کے خلاف قانون کا خاتمہ کر دیا گیا۔ بقول کولن ولسن:

> "جادوگرنیاں موت کے گھاٹ اتارنے کا جنون کتنا خوفناک اور کس قدر وسیع پیمانہ پر تھا یہ انسانی تخیل سے بھی فزوں تر ہے... چار صدیوں تک قتل و غارت، جبر و تشدد اور اذیت دہی کی جو مہم روا رکھی گئی اس کا تصور بھی محال ہے۔"[3]

اس ضمن میں مزید معلومات کے لئے کولن ولسن کی محوالہ بالہ کتاب کے ساتھ ساتھ اس کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

"Encyelopedia of Witchcraft" by Rossell Hope Robbins

"خدا کا نائب:"

یورپ میں یسوع مسیح کے توسط سے پوپ خدا کا نائب تھا اور اس بنا پر مذہبی امور میں اقتدار کل کا حامل۔ ابتدا میں شاید چرچ غریبانہ رہا ہو گا لیکن دربار، امراء اور اہل ثروت کے عطیات نے اسے امیر ترین بنا دیا تھا اتنا کہ شائد چرچ کا خزانہ بادشاہ سے بھی زیادہ بڑا اور شاندار ہو گا۔ سبط حسن کے فراہم کردہ کوائف کے بموجب "یورپ کا سب سے دولت مند اور سب سے بڑا جاگیردار رومن کلیسا ہی تھا۔ اسپین میں ملک کی چوتھائی زمین کلیسا کی ملکیت تھی۔ برطانیہ میں زمین کا پانچواں حصہ، جرمنی میں تیسرا اور فرانس میں نصف رقبہ کلیسا کے قبضہ میں تھا۔ ضلع لانگر کا بشپ پورے ضلع کا مالک تھا۔ اٹلی کے شہر بولونیا کے دو

ہزار گاؤں کلیسا کی ملکیت تھے۔ اسپین میں کلیسا 64 قصبوں کا مالک تھا۔ فلدا کی خانقاہ پندرہ ہزار گاؤں کی مالک تھی۔ سینٹ گال کی خانقاہ کے پاس دو ہزار چاکر تھے۔ شرلور کے پاس بیس ہزار چاکر تھے۔ یہ سب زمینیں ایسی تھیں کہ جن پر کوئی محصول نہ تھا اور نہ حکومت ان کے معاملات میں کوئی مداخلت کر سکتی تھی ایک مورخ کے بقول "فیوڈل ازم نے کلیسا کو فیوڈل بنا دیا تھا۔" اس کے علاوہ اپنی آمدنی اور پیداوار کا دسواں حصہ مقامی کلیسا کو ادا کرنا ہر شخص کا قانونی فریضہ تھا' مزید بر آں صاحب جائداد افراد حتیٰ کہ مزارعوں سے بھی یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ مرتے وقت کلیسا کے نام کچھ نہ کچھ ترکہ میں چھوڑ جائیں ورنہ بے دین تصور کیے جائیں گے اور جہنم میں جلیں گے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جب وسطی اٹلی کا بہت بڑا علاقہ کلیسا کے قبضہ میں آگیا تو کلیسا ایک خود مختار ریاست بن گئی اور پوپ ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے یورپ کی سیاست میں براہ راست حصہ لینے لگے"(4)

سید علی عباس جلال پوری کی تالیف "روایات تمدن قدیم" سے فراعنہ مصر کے عہد حکومت میں مذہبی کاہنوں کی دولت و ثروت کے ضمن میں یہ معلومات ملتی ہیں:

> "رع میس کے عہد میں کاہنوں کا بڑا زور ہو گیا اسی کے زمانے کے ایک ہیرو غلیفی مسودہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لاکھ سات ہزار غلام رکھتے تھے جو مصر کی آبادی کا 1/3 حصہ تھے۔ ان کی املاک میں پانچ لاکھ مویشی تھے' ساڑھے سات لاکھ گھماؤں اراضی تھی جو ملک کے کاشت کردہ رقبہ کا 1/7 حصہ بنتی تھی۔ مصر اور شام کے 169 شہروں کی آمدنی ان کی جیب میں جاتی تھی اور اس تمام املاک پر سرکاری محصولات معاف تھے" (ص: 42)

"عہد احتساب:"

جب چرچ اور پوپ کی دولت اور اختیارات کا یہ عالم ہو تو پھر علم و دانش سے ان کی بیزاری کی وجہ سمجھنی دشوار نہیں۔ ہر دو باہم متضاد ہیں اسی لیے یورپ کے ہر ملک میں چرچ نے آئین نو سے ڈرتے ہوئے ہر ممکن طریقہ سے طرز کہن کا اثبات کیا۔ چنانچہ یورپ کی تہذیبی اور فکری تاریخ میں ایسے لا تعداد حضرات کا تذکرہ ملتا ہے جنہیں ان کی روشن خیالی' دانش وری' تخلیقی جدت' علم دوستی اور خرد پسندی کی پاداش میں ملحد اور دھریہ قرار دیا گیا' ادارۂ احتساب نے زبان اور قلم پر کیسے پہرے بٹھائے' کتنے قید ہوئے اور کتنے مارے گئے!

آج فرانس حریت افکار کی علامت ہے مگر اسی فرانس میں "صوبائی سائنوڈ" کے ایک حکم کی رو سے 1210ء میں پیرس یونیورسٹی میں ارسطو کی جملہ تصانیف کی تدریس ممنوع قرار دی

گئی تھی اور اگلی صدی تک یہی رویہ بر قرار رہا یہی نہیں بلکہ دو صدیاں پیشتر جب ڈینس دید یرو (Denis Dederot : 84- 1713) نے انسائیکلو پیڈیا کی تدوین کا کام شروع کیا تو اسے بے حد مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جلد کی اشاعت تو گوارا کر لی گئی مگر دوسری جلد کی اشاعت کے موقع پر ملحدانہ خیالات کی بنا پر اس کی کتابیں نذر آتش کی گئیں اور پھر زندان میں ڈال دیا گیا جہاں سے اسے بھی گلیلیو کی مانند توبہ نامہ کی بدولت رہائی ملی لیکن توبہ اور رہائی کے باوجود اس نے کام جاری رکھا۔ یہ ایک مثال ہے ورنہ ہر ملک میں چرچ یا اس کے ایماء پر حکومت یہی کچھ کرتی رہی ہے سید علی عباس جلال پوری کے بقول "یورپی ممالک میں سے ہالینڈ اور فرانس میں خرد افروز مفکرین نے بہت کام کیا ہالینڈ کے بیل (Bayl) نے ایک ڈکشنری لکھی جس میں مذہبی ریا کاری، تقلید بے جا اور جھوٹی مذہبیت پر بہت تنقید کی تھی۔ کبانے، قدوسے، والٹیر، ماتیکو، اور ہولباج وغیرہ نے فرانس میں یہ تحریک چلائی اور یہ عجیب بات ہے کہ فرانس کے محکمہ احتساب میں بھی ان کے کچھ حامی موجود تھے لوئی پانزدہم کی داشتہ ان سب کی سرپرستی کرتی تھی ان پر عیسائی عدالتوں میں مقدمے چلتے تو وہ ان کو بچا لیتی۔" (انٹرویو: "راوی۔" 1989ء)

"جہالت کی کشتی:"

علم و دانش، سائنس، فلسفہ اور ان کے ساتھ روشن خیالی، خرد افروزی اور عقلیت نے یورپ میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے لیے صدیوں تک طویل، صبر آزما اور جان لیوا جنگ لڑی ہے۔ اس عہد کی علمی روح، عقلی رویہ اور سائنسی تحقیقات کا جو عالم تھا اس کا اندازہ سینٹ آگسٹائن کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

> "جب ہم سے سوال کیا جاتا ہے کہ ہم مذہب میں کسی عقیدے پر ایمان لائیں تو یہ ضروری نہیں کہ ہم چیزوں کی ہیئت کا کھوج لگائیں جس طرح کہ ان یونانیوں نے کیا جنہیں فزیکائی کہتے ہیں۔ نہ ہی توانائی اور عناصر کی تعداد، سماوی اجرام کے گرہنوں کی حرکت اور ترتیب، آسمانوں کی ہیئت، حیوانوں، پودوں، پتھروں، دریاؤں اور پہاڑوں کی فطرت، تقویم اور ابعاد، آنے والے طوفانوں کے عنوانات اور دوسری ہزاروں چیزیں جن کے بارے میں وہ معلوم کر چکے ہیں یا ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس سے بے خبری پر عیسائیوں کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے۔ عیسائیوں کے لیے یہ کافی ہے کہ تمام مخلوق کی۔ خواہ دنیاوی ہو یا سماوی ــ علت ایک واحد اور سچے خدا کی صداقت ہے"(5)

یورپ کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ آج علم فلسفہ سائنس سب کا مطالعہ یورپ کے تناظر میں ہوتا ہے اور ہم بھی یورپ ہی کے خوشہ چین ہیں۔
ویسے اٹل حقیقت اور اس کے ساتھ تلخ بھی— یہی ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک کی تہذیب، تمدن، زبان اور سیاسی عہد کو لے لیں ہر جگہ کے تنگ نظر بے لچک اور خرد دشمن مذہبی راہنماؤں نے نئی سوچ پر پہرے لگائے اور سبھی جہالت کی کشتی میں سوار نظر آتے ہیں۔

"پرائشچت اور اس کے بعد:"

چرچ نے 350 سال کے بعد "پرائشچت" کر دیا۔ یوں خود کو مرکز کائنات سمجھنے والے انسان کو یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ ہماری یہ کہکشاں کائنات کی وسعتوں میں پھیلی لاکھوں کہکشاؤں میں سے محض ایک ہے۔ ایک لاکھ نوری سال پر محیط کروڑوں ستاروں سیاروں کی حامل یہ سپائرل گلیکسی آہستہ خرام ہے، ہمارا سورج اور اس سے مخصوص سیاروں کا نظام اس کہکشاں کے ایک خمیدہ بازو کے داخلی کنارہ کے قریب واقع ہے۔ فلکیات کی زبان میں سورج زرد رنگ اور درمیانی جسامت والا، کائنات کی قدامت کے لحاظ سے نسبتاً کم عمر ستارہ یعنی محض 60 لاکھ برس پرانا ایک عام سا ستارہ ہے جو ستاروں کی تیسری نسل سے تعلق رکھتا ہے اور یہی زرد اور داغ دار ستارہ ہزاروں برس تک زمین والوں کا دیوتا بنا رہا۔ مصریوں کا آمون رع اور ہوریس، ہندوؤں کا سوریہ، بابل والوں کا بعل اور شمش، (مردوک) یونانیوں کا اپالو اور ہیلیس، زرتشتیوں کا اہرمن اور ازتیق قوم کا توناتیاہ، انکا کا انتی۔ حضرت ابراہیم کو بھی اسی پر رب ہونے کا دھوکا ہوا تھا۔ اس کے نام پر مندر تعمیر ہوئے، صنم تراشے گئے، پوجا ہوئی اور انسانی مقدر اس سے وابستہ کیا گیا اور اب بھی یہ تقدیر کے زائچوں میں نمایاں ترین ہے۔
اب سائنس دان یہ خوش خبری سنا رہے ہیں کہ سورج، ہائیڈروجن، ہیلم اور دیگر گیسوں کا مجموعہ ہے اور جس رفتار سے یہ گیس خارج ہو رہی ہے اس کی بنا پر آج سے اندازاً" 6 لاکھ سال بعد ایک سہانی صبح اس کی تمام ہائیڈروجن ختم ہو جائے گی۔ جس طرح چراغ بجھنے سے پہلے لمحے بھر کو بھڑک اٹھتا ہے اسی طرح سورج بھی سیاہ اور مردہ ستارہ بننے سے پہلے آخری بھڑک کے طور پر لاکھوں ایٹم بموں جیسی تمازت کا اخراج کرے گا اور پھر ٹھنڈا ہو جائے گا— مردہ ستارہ!

تخلیق کائنات کی گھڑی:"

جیسا کہ ابتدا میں لکھا گیا آج کے مفہوم میں یورپ کی حد تک بنیاد پرستی کا آغاز گلیلیو کے معافی نامہ کی تاریخ 22 جون 1633ء سے سمجھا جا سکتا ہے ہرچند کہ یہ بے لچک غیر عقلی رویہ ہر عہد اور ہر معاشرہ میں ملتا ہے۔ جیسے جیسے یورپ میں سائنسی آلات بہتر ہوتے گئے' سائنسی انکشافات اور ایجادات میں اضافہ ہوتا گیا' کلیسا کو بنیادی عقاید اور بائبل کے تخلیق کائنات کے تصور کے تحفظ میں پیش آنے والی مشکلات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ بائبل کو کس کس سے بچاتے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ سینٹ آگسٹن کے بموجب حضرت عیسیٰ سے صرف پانچ ہزار برس قبل کائنات تخلیق کی گئی۔ ادھر "Origins" کے مولفین یہ بتاتے ہیں کہ آرچ بشپ آف آرماغ (Armagh) جیمز عشر (1581-1656 : James Ussher) نے بائبل میں حضرت آدم اور ان کے بعد کے واقعات کی روشنی میں حساب لگا کر 1650ء میں یہ بتایا کہ کائنات 4004 ق م میں تخلیق کی گئی۔ اس کے بعد سینٹ کیتھرین کالج کیمبرج کے ماسٹر ڈاکٹر جان لائیٹ فٹ (DR. John Light Foot) نے تخلیق کائنات کو قطعیت دیتے ہوئے 23- اکتوبر صبح کے نو بجے کے وقت کا تعین بھی کر دیا (ص: 31)

کومٹ جارجس ڈی بفون (Comte Georges De Buffon : 1707-78) نے بڑا حساب کتاب لگا کر زمین کی عمر اسی ہزار برس بتائی جبکہ آج سائنس یہ بتاتی ہے کہ کائنات تقریباً اربوں برس اور زمین کوئی لاکھوں برس قدیم ہے۔

بائبل کے مطابق تخلیق کائنات چھ دن میں مکمل ہوئی اگرچہ ہم دن کو اپنی گھڑیوں کے پیمانے سے ماپتے ہیں اور وقت کی اکائی سورج کے گرد زمین کی گردش پر مبنی ہے مگر ہمارے چوبیس گھنٹے کے دن رات بھی سائنس کی پیمائش کے بموجب خالص چوبیس گھنٹہ کے نہیں ہیں چنانچہ حالیہ تحقیقات کے بموجب:

> "گذشتہ 27 سو سال سے دن کی مدت میں لحہ لحہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈرہم یونیورسٹی کے سائنس دان ایف رچرڈ سٹیفن سن اور رائل گرین وچ خلائی رصد گاہ کی انچارج لیزلی وی مور سن نے گذشتہ دنوں ایک خصوصی سیمینار میں اپنا مشترکہ مقالہ پیش کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ جو لوگ دن کی مدت میں اضافہ کی شرح کے حساب سے اپنی گھڑی کے وقت کو درست کرنا چاہتے ہیں ان کی اطلاع کے لئے لکھا جاتا ہے کہ ہر صدی کے بعد دن کی

مدت میں 1.7 ملی سیکنڈ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجوہات سمندری لہروں میں اتار چڑھاؤ اور زمین کے فلیوڈ کور اور مینٹل میں الیکٹرو میگنیٹک انٹرایکشن ہیں۔"

اگر اس میں نظریہ اضافیت کو بھی شامل کر لیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

حقیقت اور فسانہ میں تصادم سے پیدا ہونے والی الجھنوں سے بچنے کا ایک حل یہ تلاش کیا گیا کہ بائبل کے اسلوب کو علامتی اور استعاراتی قرار دے دیا گیا جس کی رو سے خدا کے کائنات کو چھ دن میں بنانے کا مطلب کیلنڈر کے چھ دن نہیں کہ یہ سب تمثیلی ہے۔ ویسے قرآن مجید کے بموجب (سورۃ یونس آیت : 3) بھی تخلیق کائنات چھ یوم میں ہوئی تھی:

"بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا اور وہ ہر کام تدبیر سے کرتا ہے۔"

سورہ فرقان (آیات : 59- 58) میں بھی ارشاد باری ہے : (اے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اس اللہ پر بھروسہ کیجئے جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہئے اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب واقف ہے وہ (اللہ) جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، پھر آپ ہی (کائنات کے تخت سلطنت) عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ وہ بڑا مہربان ہے، اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھو۔ اسی طرح سورہ سجدہ (آیات 4 تا 6) میں بھی ارشاد ربانی ہے : "وہ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا، اس کے سوا نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے والا، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ اللہ ہی آسمان سے زمین تک دنیا کے تمام معاملات کی تدبیر کرتا ہے پھر تدبیر کی روداد اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔ وہی پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے، زبردست ہے، رحیم ہے۔"

سورۃ حم السجدہ سے ان کے ساتھ یہ آیات بھی ملاحظہ ہوں:

"آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہہ دیجئے، کیا تم اس اللہ (کی توحید) سے انکار کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو (باوجود

اتنی بڑی وسعت کے) دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی (اللہ) تو سارے جہان والوں کا رب ہے اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس (زمین) میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔" (109)

سورۃ حم السجدہ میں مزید ارشاد باری تعالیٰ:

"پھر (اللہ) آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا "تم دونوں وجود میں آجاؤ' خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے۔" دونوں نے کہا کہا "ہم خوشی سے آ گئے فرمانبرداروں کی طرح" پھر اللہ نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا ڈالے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب اپنا حکم بھیج دیا اور آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں کے ذریعے سے رونق بھی دی اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب ایک زبردست اور خوب جاننے والے (اللہ) کے مقرر کردہ اندازے ہیں۔" (12-11)

واضح رہے کہ یہاں بھی کیلنڈر وقت کی بات نہیں کی جا رہی سورۃ حج (آیات 48—) کی رو سے:

"مگر تمہارے رب کے پاس کا ایک دن تم لوگوں کے شمار کے موافق ایک ہزار برس کے برابر ہے۔"

"یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے:"

کولن ولسن "آکلٹ" (ص: 21) میں لکھتا ہے:

"عیسائیت کی ابتدائی تاریخ قلم بند کرتے وقت مورخ گبن خود کو یوں طنز کرنے سے باز نہ رکھ سکا کہ "چرچ کی سہولت اور فائدہ کی خاطر بالعموم قوانین فطرت کو حسب منشا توڑ مروڑ لیا جاتا تھا۔" اس ضمن میں متعلقہ دستاویزات دیکھ کر واقعی ایسا محسوس نہ کرنا بہت مشکل ہے۔ عیسائیت مذہب کے برعکس ایک وبا تھی چنانچہ خوف' جہالت اور اعصابی خلل (ہسٹریا) کے لئے باعث کشش ثابت ہوئی۔ مغربی دنیا میں عیسائیت کا فروغ اس کی حقانیت کی بنا پر نہ ہوا بلکہ اس لئے کہ انسان بنیادی طور پر احمق اور توہم پرست ہوتا ہے... شیاطین کا جم غفیر محض اس لئے ایجاد کیا گیا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ چند عبادات کی مدد سے

سینٹ ان پر غلبہ حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں — مگر کب تک؟"
بائبل کی حقانیت کو بچانے کے لیے احتساب، جبر، زبان بندی اور تعزیر ناکافی ثابت ہونے پر اور علم و آگہی اور سائنس پر مبنی کوائف معلومات اور شواہد کی بڑھتی ہوئی اور کثیر تعداد کی بنا پر ایک وقت ایسا آگیا کہ سائنس بمقابلہ عیسائیت کی جنگ میں کافر، بدعتی اور جہنمی قرار دینے کے ہتھیار کند ثابت ہونے پر پوپ نے جدید علوم سے سمجھوتا کر لیا چنانچہ "9 مئی 1983ء کو ویٹیکن کے مقام پر ایک خصوصی تقریب ہوئی جس میں ہز ہولی نس دی پوپ جان پال نے اعلان کیا:

"گلیلیو کے مقابلہ میں کلیسا کا تجربہ اور اس کے مابعد اس بات کا سبب ہے کہ زیادہ پختہ رویہ اختیار کیا جائے۔ کلیسا خود بھی اس تجربہ سے سیکھتا ہے اور اب اس پر یہ معانی بہتر طور پر واضح ہو گئے ہیں کہ تحقیق کو زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیے... یہ تحقیق ہی ہے جس کے ذریعہ انسان صداقت تک رسائی حاصل کرتا ہے... اس لیے اب کلیسا کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ سائنس اور ایمان میں حقیقی طور پر کوئی تضاد موجود نہیں۔ بہر صورت یہ منکسرانہ اور مستقل مزاج مطالعہ ہی ہے جس کے ذریعہ (کلیسا) یہ تربیت حاصل کرتا ہے کہ کس طرح ایمان کے لازمات کو موجودہ عہد کے نظام سے الگ کیا جائے۔"(6)

یہی نہیں بلکہ جون 1994ء میں ویٹی کن نے گلیلیو کے دو یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیے۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

1929ء میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل (Edwin Hubble) نے عظیم دھماکہ (Big Bang) اور پھیلتی کائنات (Expanding Universe) کا تصور پیش کیا تو فلکیات کی دنیا میں گویا بھونچال آگیا۔ اس موقع پر اس کی تفصیل میں جائے بغیر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ 1951ء میں چرچ نے اسے بھی درست تسلیم کر کے بائبل کے مطابق قرار دے دیا۔ مسلم مفکرین بھی اس نظریہ کو درست تسلیم کرتے ہیں کیونکہ یہ "کن فیکون" کے مطابق ہے۔

"اسلوب خشونت:"

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک ایسے ملاؤں کی کمی نہیں جو تسخیر قمر کو محض افواہ سمجھتے ہیں بلکہ دیکھا جائے تو خاصی معقول تعداد میں مسلم محققین، دینی دانشور اور علماء — سائنسی امور میں ذہنی لحاظ سے اور علمی طور پر ابھی تک کلیسائی رویہ کے حامل نظر

آتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے ایک مسلم ملک کے ایک دینی عالم کے بارے میں لکھا ہے جس نے 1982ء میں یہ اعلان کیا کہ گلیلیو کی مانند زمین کی حرکت اور سورج کے ساکن ہونے کو درست تسلیم کرنے والے مسلمان کو حلقہ اسلام سے نکال باہر کرنا چاہیے اور اس کو ملحد قرار دیا جانا چاہیے اور اس کے لیے دردناک موت ہونی چاہیے اور اس کی جائداد کو ضبط کر لینا چاہیے(7) ڈاکٹر عبدالسلام نے دینی عالم کا نام نہیں بتایا لیکن یہ اسلوب خشونت پاکستان ہی کے کسی دینی عالم کا ٹریڈ مارک معلوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی روزنامہ "جنگ" (لاہور، 15۔ جنوری 1994ء) کی یہ خبر بھی ملاحظہ کیجئے جس میں "قرآن اور سائنس" کے مولف حاجی غلام حسن نے "نظام شمسی کے دسویں سیارے کی باقاعدہ حساب سے قرآن اور موجودہ سائنس کی روشنی میں دریافت کی ہے اور اس دریافت کی بنیاد موجودہ فلکیاتی سائنس کو بتایا گیا ہے مصنف نے اس سیارے کا نام "الحسن" رکھا ہے۔ دیئے گئے حساب کے مطابق اس نئے سیارے کا سورج سے فاصلہ 11 ارب 26 کروڑ 50 لاکھ میل ہے۔ اس کا قطر 7040 میل ہے جبکہ اس کی کشش ثقل زمین کی نسبت 7 ہے۔ اس کی سورج کے گرد گردش کی رفتار 1682ء میل فی سیکنڈ ہے۔ اس طرح نظام شمسی کے دیگر سیاروں میں قائم میزان کا انکشاف بھی کیا گیا ہے۔ کتاب میں زمین سے عرش کے فاصلہ کا حساب بھی بتایا گیا ہے جس کے مطابق یہ فاصلہ ایک ہزار نوری سال ہے۔ قرآن کی روشنی میں سیارہ "الجنت" جو کہ عرش کے گرد متحرک ہے اس کا قطر بھی دریافت کیا گیا ہے جو کہ 8160 میل ہے جبکہ جنت کی کشش ثقل زمین کی نسبت ۱ء اگنا ہے۔ کتاب میں دیگر انکشاف بھی کیے گئے ہیں۔ مصنف کے مطابق آج تک قرآنی آیات اور موجودہ سائنس کی روشنی میں ایسی تحقیق نہیں ہوئی اور اس کتاب میں بہت سے فلکیاتی رموز کا انکشاف کیا گیا ہے۔"

حواشی

1۔ مطبوعہ "فکر و نظر" (اسلام آباد۔ جولائی ستمبر 1993ء)
2۔ "ذہن انسانی کی اسیری" از نیاز فتح پوری مطبوعہ "روشن خیال" (کراچی: جنوری 1993ء)
3۔ Wilson Colin By "The Occult" P. 424
4۔ "کلیسا کی مذہبی عدالتیں" از سبط حسن مطبوعہ "روشن خیال" (کراچی: جلد 1 شمارہ 4)
5۔ "جدید سائنس کا آغاز" (مترجم: رشید ملک) ص 53
6۔ بحوالہ: "ارمان اور حقیقت"، ص: 90۔ 89
7۔ ایضاً ص: 394

3- "منطق کے گھاؤ"

"عقاید کا صنم خانہ:"

سوال یہ ہے کہ کیسے انسان کے ذہن میں عقاید کا صنم خانہ آباد ہو جاتا ہے کہ وہ عمر بھر ان ہی کا زناری بن کر رہ جاتا ہے اس حد تک کہ عقیدہ/ نظریہ/ تصور کے تحفظ کے لیے وہ جان لینے اور دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس بے لچک رویہ کی تشکیل میں منطق کی کنڈیشننگ اساسی کردار ادا کرتی ہے۔

جہاں تک منطق کا تعلق ہے تو ارسطو سے منسوب استخراجی منطق (Deductive Logic) سے سبھی آگاہ ہیں کہ کیسے ایک مفروضہ کو اساسی صداقت کا حامل سمجھ کر اس سے خود کار قسم کے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں، سیدھی سی مثال سے استخراجی منطق کے طریق کار کی وضاحت ہو جاتی ہے:

الف۔ انسان فانی ہے

ب۔ اب ج د۔۔۔ سب انسان ہیں

ج۔ اب ج د۔۔۔ سب فانی ہیں

"پاولوف کا کتا:"

ہمارے ادب میں خواجہ سگ پرست اور سگ لیلیٰ کا خاصہ تذکرہ ملتا ہے۔ ایک کتا ہز ماسٹرز وائس کی وجہ سے مشہور ہوا مگر سائنس کی دنیا میں بھی ایک کتے نے شہرت حاصل کی اور وہ ہے مشہور روسی ماہر عضویات اور نوبل انعام یافتہ ایوان پیٹروچ پاولوف (Ivan Petrovich Pavlov ; 1849- 1936) کا کتا۔ پاولوف نے اس کتے پر ایسا تجربہ کیا جس کی اہمیت میں آنے والے زمانوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور حکومت، پراپیگنڈہ، مخالف کی کردار کشی، نفسیاتی جنگ، پرسنلیٹی کلٹ، فیشن اور اشتہارات تک میں اس کی کار فرمائیوں کا مطالعہ کیا گیا۔

پاولوف کتے کو غذا دینے کے ساتھ گھنٹی بجاتا تھا جس کے باعث کتے کے اعصاب کے

لیے گھنٹی اور غذا لازم و ملزوم ہو گئے چنانچہ ہر گھنٹی اور غذا سے اس کا منہ لعاب سے بھر جاتا۔ یہ عمل چندے جاری رہا حتیٰ کہ گھنٹی غذا سے مشروط ہو کر رہ گئی جس کے نتیجہ میں کچھ عرصہ بعد کتے کا یہ عالم ہو گیا کہ غذا کے بغیر صرف گھنٹی کی آواز سنتے ہی رال ٹپکنے لگتی۔ اسے Conditioned Rreflex کہتے ہیں۔

"ثمر خار دار:"

جب استخراجی منطق سے اخذ شدہ عقاید و تصورات کی مذہب سے کنڈیشننگ ہو جاتی ہے تو وہ جز و ایمان نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنے پر یہ آشکار ہو جائے گا کہ جن نظریات، تصورات، رسوم اور روایات کو ہم نے حرزجان بنا رکھا ہے وہ ہماری مخصوص سماجی اور معاشرتی صورت حال کی کنڈیشننگ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں اور جن مسلمات کی حفاظت کے ہم شدت سے قائل ہیں وہ منطقی مغالطہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ ہمارے پالتو تعصبات، ہماری سماجی نفرتیں، ہماری سیاسی کدورتیں اور عقاید پر مبنی ہماری دشمنیاں بھی اسی منطق اور کنڈیشننگ کے ثمر خاردار ہیں۔

"مذہب میں عقل نہیں"! کا بھی یہی مطلب ہے بلکہ ہمارے ہاں تو نقلی اور عقلی علوم کی تقسیم بھی اس امر کی شاہد ہے۔ اسلامی فکر پر اس منطق کے اثرات کے ضمن میں مولانا محمد حنیف ندوی نے یہ لکھا ہے:

> "یوں تو منطق کی اشاعت و فروغ سے کم و بیش سارے ہی علوم ہمارے ہاں متاثر ہوئے ہیں حتیٰ کہ نحو کے دامن پر بھی اس کے چھینٹوں کے داغ ہیں مگر خصوصیت سے جس فن نے اس کے اثرات کو قبول کیا وہ اصول فقہ ہے۔ اس میں دلالت الفاظ کی باریک بحثیں، عام و خاص کی تفریق اور وصل و تفریع کے قاعدے، تمام تر منطقی رنگ و روغن لیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح استدلال و استنباط کے پیمانوں کی تعین، ترتیب اور مصطلحات تک میں بھی اس کی شوخیوں کی جھلک ہے مثلاً قیاس، علت، حکم، طرز، دوران، اور تنقیح المناط وغیرہ یہ تمام انداز ایسے ہیں جن پر منطق کی چھاپ نمایاں ہے"(۱)

مابعد الطبیعیات، فلسفہ، تصوف، الٰہیات، دینیات ان سب کی اساس استخراجی منطق پر ہی استوار ہے۔

اسی طرح ہر نوع کی اتھارٹی کو بھی اسی سے سہارا ملتا ہے (مثال: شاہ ظل سبحانی ہے) گروہی تعصبات، سیاسی عصبیت، مذہبی نفرت، ذات، رنگ و نسل کے امتیاز اور کسی اسی نوع

کے دیگر سیاسی مظاہر جن کا قومی کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی منفی کردار بطور خاص واضح کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے یہ سب اسی منطق کے باعث ہے کہ عقل' تجربہ' مشاہدہ کو کسوٹی بنائے بغیر ہی کچھ مفروضوں کو حقائق تسلیم کر کے انھیں ہی افراد بلکہ اقوام تک کی پرکھ کا معیار بنا لیا جاتا ہے اور جب یہ ایک مرتبہ راسخ ہو جائیں تو پھر ایسے بے لچک رویے پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں جن کی اساس ہی اپنے صحیح ہونے اور دوسرے کے غلط ہونے پر استوار ہوتی ہے۔ صرف میرا خدا ہی سچا ہے' صرف میرا عقیدہ ہی سچا ہے' صرف میرا قائد ہی سچا ہے' صرف میں ہی سچا ہوں۔ لہٰذا اس کے بر عکس سب غلط ہے' فریب ہے' دغا ہے' کفر ہے' ہمارے غیر جمہوری معاشرہ میں اس منطق نے جو ستم توڑے اور جو گھاؤ لگائے ہیں بطور خاص ان کی وضاحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔

"شجربار آور:"

اس کے بر عکس عقلی' علمی' سائنسی رویہ کی اساس استقرائی (Inductive) منطق پر استوار سمجھی جاتی ہے اگرچہ اس کا اولین سراغ سقراط کے اس مخصوص اسلوب گفتار میں ملتا ہے کہ کیسے وہ مخاطب سے ایک بات کا دعویٰ کراتا اور پھر سوالات کرتا جاتا حتیٰ کہ مخاطب خود ہی اپنی تردید کر دیتا تاہم انگلستان میں راجر بیکن (1494ء- 1414ء) اور مشہور انشائیہ نگار سرفرانسس بیکن (1626- 1561) کی بدولت اس کی اساس مستحکم ہوئی۔ استقرائی منطق میں استخراجی کے بر عکس کل سے جزو کی جانب جا کر معین نتیجہ اخذ کرنے کے بجائے جزو سے کل کی جانب جا کر ایسا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے جس کی تجربہ' مشاہدہ' حقائق اور کوائف کی روشنی میں توثیق ممکن ہو۔ اس طریق استدلال کی سیدھی سی مثال یوں ہے:

الف: اب ج سب مر گئے

ب: اب ج سب انسان تھے

ج: لہٰذا انسان فانی ہے

استخراجی منطق پر فلسفہ اور استقرائی پر سائنس استوار سمجھی جاتی ہے۔ فرانس بیکن نے اپنے مخصوص انشائی اسلوب میں استخراجی اور استقرائی منطق کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے اول الذکر کے پیروکاروں کو مکڑیوں اور چیونٹیوں سے تشبیہ دی تھی کہ مکڑیاں اپنے جسم سے تار نکالتیں اور جالے بناتی ہیں اور چیونٹیاں ہمیشہ حصول خوراک میں بھٹک رہی ہیں جبکہ ان کے بر عکس شہد کی مکھیاں پھول پھول کا رس جمع کر کے شہد و موم تیار کرتی ہیں۔ یہ ہے استقرائی منطق پر مبنی رویہ۔

فلسفی کے بر عکس سائنس دان مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ سے کسی امر کے بارے میں مختلف النوع شواہد جمع کرتا' ان کی چھان پھٹک کرتا' ان کے مابہ الامتیاز خصائص کی گروہ بندی کرتا اور تب کہیں جا کر وہ کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے لیکن ان کی دائمی صداقت پر زور دینے کے بر عکس یہ ہر طرح کے شکوک و شبہات اور تنقید و تبصرہ کے لیے حاضر ہوتا ہے۔ چنانچہ تحقیقات کی آزمائش سے گزرنے کے بعد ہی وہ نتیجہ تصور یا نظریہ کی صورت اختیار کرتا ہے اس ضمن میں سائنس دان ڈاکٹر سعید اختر درانی کا یہ بیان بھی قابل غور ہے:

"سائنس اور سائنس دان تو بہت منکسرالمزاج لوگ ہیں وہ اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ بہت سے میدان مثلاً یقین' مقاصد و اقدار ان کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس کے بر عکس مذہب اور فلسفے یا میٹافزکس کے بعض علم بردار اور پرچارک ان مسالک کو اس قدر ہمہ گیر مانتے اور گردانتے ہیں کہ گویا دنیا کی ہر چیز بشمول سائنس اور اس کے طریق ہائے کار اور اس کے تجربات' نتائج' نظریات سب کے سب مذہب یا میٹافزکس کی باندیاں ہیں۔ تو پھر بتایئے کہ Arrogant یا طناز و خودسر کون ہوا؟ مذہب یا سائنس' عالمان دین یا سائنس دان۔؟"(2)

"سائنس کا انکسار:"

یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ سائنس کی بصیرت اور نتائج خارج کے بر عکس اس کے طریقہ کار سے اخذ کردہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے سائنسی تصورات میں صرف تغیر ہی کو دوام نظر آتا ہے جس پر علامہ اقبال نے لینن کی زبان سے یہ اعتراض کرایا تھا:

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سائنس کی بقا کا راز ہی اسی میں مضمر ہے کہ جب تک اس کے تصورات— معلومات' کوائف' تجربات' مشاہدات اور حقائق کا ساتھ دے سکتے ہیں یہ درست تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن غلط ثابت ہوتے ہی متروک قرار پا جانے پر پھر ماضی' عظیم شخصیت' روایت یا اتھارٹی کے نام پر انہیں زندہ کرنے کی کوشش نہیں جاتی کہ علمی ترقی میں اپنی استعداد کے مطابق یہ اپنا کردار ادا کر چکے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید اختر درانی محولا بالا مقالہ "مذہب اور سائنس" میں اس ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں

"سائنس کے انکسار کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ سائنس کبھی قطعیت کا دعویٰ نہیں کرتی بلکہ سائنس کا ایک بہت ہی اہم اور بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ اپنے کسی نظریہ کو حتمی طور سے صحیح ہونے اور اس کو ثابت کر سکنے سے انکاری ہے... بلکہ اس امر پر نازاں ہے کہ جونہی اسے اپنی غلطی کا علم ہوا وہ اسے بخوشی تسلیم کر لے گی اور اپنے نظریہ کو بدل دے گی اور یہ مقولہ غالباً White Head کا ہے کہ "سائنس کی تاریخ اس کی غلطیوں کی تاریخ ہے" غلطی کو تسلیم کرنا بھی دلیل عقل ہے لیکن استخراجی منطق کا خوگر یہ کبھی نہ کرے گا کہ یہ اس کی ذہنی تربیت کے خلاف ہوتا ہے جبکہ استقرائی منطق کا آغاز اسی سے ہوتا ہے کہ غلطی کا امکان مسترد نہیں کیا جا سکتا۔"

"منطق بمقابلہ منطق:"

یوں دیکھیں تو چرچ اور گلیلیو کا جھگڑا دراصل استخراجی اور استقرائی رویوں کے باعث تھا شاید اسی لیے بعض محققین ابتدا سے سائنسی طریق کار کی ابتدا کرتے ہوئے اس کا تعلق استقرائی منطق سے جوڑتے ہیں چنانچہ آئزک آسی موف (Isac Asimov) کے بقول:

"اسی (یعنی گلیلیو) کے انقلاب کی بنیاد یہی تھی کہ اس نے استقرائیہ (Induction) کو استخراجیہ (Deduction) پر ایک منطقی طریق کار کے طور پر سائنس میں فوقیت دی فرضی عمومیوں (generalizations) پر نتائج کی عمارت تعمیر کرنے کی بجائے"(6)

جبکہ گلیلیو کے معافی نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے گلیلیو پر اپنے مقالہ میں برٹرینڈ رسل نے یہ لکھا:

"گلیلیو اور مذہبی منصفوں کے درمیان یہ تصادم محض آزاد خیالی اور ہٹ دھرمی یا سائنس اور مذہب کے درمیان ہی تصادم نہیں تھا بلکہ یہ روح استقرائیہ اور روح استخراجیہ کے مابین بھی تھا۔"(5)

علامہ اقبال نے "خطبات" میں اسلامی فقہ کی اساس سے بحث کرتے ہوئے ان ہی منطقی رویوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا:

"یہ دراصل قانونی تحقیق و تفتیش میں استخراج اور استقراء کا نزاع تھا" (ص:

"ٹوپی بمقابلہ فرمہ:"

استقرائی منطق یورپ میں نشاۃ الثانیہ کی نوید تھی کیونکہ استخراجی منطق جامد فکر کی "منطقی اساس" مہیا کرنے کے علاوہ اور کسی مصرف کی نہ رہی تھی جبکہ اس کے بر عکس استخراجی منطق حریت فکر اور علوم میں تحریک کی موجب بنی اور اسی نے سائنسی فکر کی بنیاد استوار کرتے ہوئے تجزیہ و تحلیل اور تحقیق و تجسس کی راہیں منور کرتے ہوئے فکر نو کے چراغ فروزاں کیے۔ مگر یہ استخراجی منطق کا چراغ گل نہ کر سکی کیونکہ فلسفہ مذاہب' الہیات اور اخلاق عامہ میں اسی کا سکہ چلتا رہا یہی نہیں بلکہ عملی زندگی' عوامی سوچ' عمومی فیصلوں اور اجتماعی رویوں کے ساتھ ساتھ انفرادی حیثیت میں ہم خود بھی استخراجی استدلال کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں بلکہ اس میں اتنے رنگے جا چکے ہیں کہ ہمیں شعوری طور پر کبھی یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم دن رات استخراج کی عینک سے اپنے علاوہ تمام افراد و اشیاء اور وقوعات و تصورات کو دیکھتے' سمجھتے اور پرکھتے ہیں اور یہی باعث خرابی ہے کہ پہلے سے ایک مفروضہ کو غلو' جہالت بلکہ انتہا پسندی کی بنا پر اساسی یا ابدی حقیقت سمجھ کر رد و قبول کا آخری معیار قرار دے دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں فرمہ پر ٹوپی نہیں بلکہ ٹوپی پر فرمہ فٹ کیا جاتا ہے۔ انداز استدلال یوں ہوتا ہے:

الف- یہ ٹوپی ہر لحاظ سے درست ہے۔

ب- فرمہ ٹوپی کے مطابق نہیں

ج- لہذا فرمہ غلط ہے۔

اب آپ فرمہ کی جگہ نظریہ' تصور' عقیدہ' معیار' شخصیت حتیٰ کہ سر کر دیں استدلال کی رو سے ساری دنیا اور "ٹوپی" ہی صحیح رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خود پرست فرد (یاقوم) کی منطق ان کے لیے نرگسی آئینہ ثابت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ماضی جواز عظیم ثابت ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں پدرم سلطان بود کے رجحان کو تقویت ملتی ہے۔ ویسے بھی علامہ اقبال کے الفاظ میں "ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں" ("خطبات" ص 274) جس کے سلبی اثرات کی بنا پر فرد (یاقوم) کے لیے ماضی ہی سچا اور کھرا ہوتا ہے۔ وہ حال کو ماضی پر پرکھ کر اسے اس بنا پر مسترد کرتے رہتے ہیں کہ یہ ماضی کیوں نہیں۔ اس ضمن میں ملائیت (بطور ادارہ) نمایاں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ جب ملا علامہ اقبال جیسے اسلامی مفکر کے خلاف

بھی فتویٰ دے دیتا ہے تو اس کا استدلال وہی فرمہ کو مسترد کرنے والا ہوتا ہے شاید اسی لیے علامہ اقبال نے ملا کو کرگس کہہ کر اس کی ہمیشہ مذمت کی کیونکہ حرکی فکر اور برقی افکار کی بنا پر علامہ اقبال ملا کی مردہ شخصیت اور فکر جامد کی "ٹوپی" کی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ استخراجی منطق کے پیدا کردہ فکری جمود سے بھی آگاہ تھے چنانچہ "خطبات" میں انہوں نے لکھا ہے:

> "ارسطا طالیسی منطق کی عینک سے دیکھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی ایک کل ہے جس میں حرکت کا کوئی اندرونی اصول بجائے خود کار فرما نہیں" (ص: 272)

"زندہ باد! مردہ باد!"

اس کے برعکس استقرائی منطق کی رو سے فرمہ تو نہیں بلکہ ٹوپی کو مسترد کیا جائے گا۔ اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے صداقت پرست رویہ، معتدل شخصیت اور غیر جذباتی مزاج کی ضرورت ہے مگر استقرائی منطق سے ان ہی کی تسکین نہیں ہوتی لہٰذا برعکس صورت یعنی استخراجی منطق اختیار کی جاتی ہے جو تعصب و خشونت، نفرت و حقارت، کوتاہ بینی، کج نگاہی اور خام خیالی سب کی آسودگی کا باعث بن سکتی ہے لیکن یہ آسودگی مصنوعی اور منفی ہوتی ہے اسی لیے انفرادی جذباتیت کے لیے تیل کا کام کرتی ہے۔

منطق راست فکر کی اساس اور دلائل و براہین کی پرکھ کا علم ہے، منطق عالم کا ہتھیار بھی ہے اور ڈھال بھی! لیکن عصر اور معاصرین کو دیکھنے سے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا اب منطق محض دو دھاری ہتھیار میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ مثالوں کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں کسی بھی ملا یا لیڈر کی تقریر سن لیجئے منطق کے منفی استعمال میں تنوع کا اندازہ ہو جائے گا۔ تقریر تو خیر بہت طویل ہو جاتی ہے صرف نعروں کا تجزیاتی مطالعہ کر لیں خاصے عبرت ناک ثابت ہوں گے، منفی کی مدد سے کیسے ان سے جوش و اشتعال کا کام لیا جاتا ہے مگر حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی راہنماؤں اور حاکموں کے خطابات و القابات بھی قابل توجہ ہیں کہ کیسے ایک لفظ کو ان کی شخصیت کا استعارہ بنا دیا جاتا ہے اس ضمن میں سب سے زیادہ زیادتی شیر اور علامہ اقبال کے شاہین سے کی جاتی ہے یوں کہ شیر پالتو بلی اور شاہین گویا چڑیا میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہر لیڈر کے لیے زندہ باد کے نعرے لگتے ہیں یہ زندہ باد کیا ہے، ہمارا لیڈر ہی سب سے افضل اور برتر ہے لہٰذا صرف وہی "زندہ" رہنے کا مستحق ہے لہٰذا بقیہ تمام "مردہ باد"!

حالانکہ تمام سیاسی کیریئر کو ملحوظ رکھنے پر محض چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر اکثریت بے اصولی، بد دیانتی، جاہ پرستی، طالع آزمائی، زر پرستی اور عمومی کذب و افتراء کی بنا پر زندہ باد کے بر عکس کی مستحق نظر آئے گی۔ مردہ باد کہنا نعروں کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ اب کردار کشی کے لیے سیاست اور صحافت میں مخالفین کے لیے طرح طرح کے خطابات موجود ہیں چنانچہ ہر عہد میں یہ یا اسی نوع کے الفاظ کی گونج سنائی دیتی رہتی ہے: وطن فروش، غدار، ملک دشمن، روسی ایجنٹ، بھارتی ایجنٹ، یہودی لابی، سوشلسٹ، کیمونسٹ، سرخا، ملحد، دھریہ، کافر، مغرب زدہ (خواتین)— ان کا استعمال اس کثرت اور تواتر سے کیا جاتا ہے کہ ہر دوسرا شخص گردن زدنی نظر آتا ہے۔ عدالت نے کبھی بھی کسی کو ان جرائم کا مجرم نہیں قرار دیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ حکومت یا حکمران کی تبدیلی کے ساتھ ہی غدار اور وطن دشمن، وطن دوست اور وطن کے رکھوالے ثابت ہوتے ہیں اور اب یہ اپنے مخالفین پر ان ہی خطابات کے تیر چلاتے ہیں جن کا ہدف کبھی یہ خود رہے تھے۔

"محلات کی لونڈی:"

استخراجی منطق شاہوں اور آمروں کے محلات کی لونڈی ثابت ہوتی ہے اس لیے ہر نوع کے غیر جمہوری معاشروں میں اسے فروغ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے ہر وہ استدلال رواج پا جاتا ہے جس سے حاکم کی کرسی کو استحکام ملتا ہے۔ "مضبوط مرکز" بظاہر کتنی عام (بلکہ عامیانہ) بات معلوم ہوتی ہے مگر اس کے مضمرات پر غور کریں تو لاشوں تک جا پہنچتی ہے۔ قبیلہ کا سردار ہو یا علاقہ کا جاگیر دار، کنبہ کا سربراہ ہو یا ملک کا، کرسی چھوٹی ہو یا بڑی، تخت طاؤس ہو یا ٹین کا تاج۔ یہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر "مضبوط مرکز" ہی کی علامات بنتی ہیں۔

ہم جمہوریت کو محض حصول اقتدار، ووٹ فروشی، سیاسی قتل اور مال بنانے کا ذریعہ جانتے ہیں جبکہ جمہوریت ان سب کے بر عکس مخصوص طرز فکر اور خاص طرز زیست کا نام ہے۔ اس لیے جمہوریت میں یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص عسکریت کے بل پر اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو کر خود کو افضل ترین اور اکمل ترین سمجھنے لگے اور مخالفین پر چڑھائی کر کے محتسب اور واعظ بھی بن بیٹھے۔ واضح رہے کہ خود محتسب اور واعظ بھی معاشرہ میں اسی منطق کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ جب معاشرہ میں طویل مدت تک غیر عقلی رویوں کا سکہ چلتا رہے، غیر جمہوری ادارے پھلتے پھولتے رہیں اور آمریت مسلط رہے تو عمومی زبان بندی، سنسر شپ اور قدغنوں کے ذریعہ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر جی حضوری کی جو فضا

تشکیل پا جاتی ہے اس میں سائنس کی راست فکر کے بجائے واہموں ہی کا چلن عام ہو گا۔ آزاد فکر کی جگہ کورانہ تقلید لے لے گی اور ان کے نتیجہ میں تحقیق و تفحص اپنے حقیقی معانی گنوا دیں گے۔

"منطق کی دلدل:"

استخراجی منطق سے جامد تصورات کیسے صدیوں تک مسلمات اور "ناقابل تردید" کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اس کی ایک مثال ہماری طب میں ملتی ہے جسے بالعموم طب یونانی کہا جاتا ہے اور یہ صحیح بھی ہے کہ یہ طب یونانیوں کی استخراجی منطق کا مکمل ترین نمونہ ہے۔ انسان کو قطعی نوعیت کی چار طبائع — گرم، سرد، بلغمی اور صفراوی میں تقسیم کر کے ان طبائع کی مناسبت سے علاج کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سے زیادہ غیر سائنسی بات ہو ہی نہیں سکتی مگر اڑھائی ہزار برس سے یہی طریقہ چل رہا ہے۔ سائنس اور اس کی مدد سے جدید میڈیکل میں تحقیقات اور تجربات کا عمل جاری رہتا ہے۔ کلئے بنتے ہیں، غلط ثابت ہوتے ہیں اور متروک قرار پاتے ہیں، ادویاء ایجاد ہوتی ہیں استعمال ہوتی ہیں ناقص ثابت ہوتی ہیں اور ممنوع قرار پاتی ہیں۔ کسی امر کو محض اس لئے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ یہ ماضی میں درست تھا یا اس پر کسی بڑے نام کا لیبل لگا ہے جبکہ طب یونانی کا تحقیق اور تجربات کے بر عکس سارا دار و مدار "بیاض" پر ہوتا ہے اور نسخہ کی تاثیر کا انحصار اس کی قدامت اور "آزمودہ" ہونے پر ہوتا ہے اس لیے یہ بیاضیں اور ان کے مستند نسخے کم از کم لقمان اور افلاطون سے منسوب ملتے ہیں۔ یہ ہے جامد فکر کا کمال!

مسلم معاشروں میں بحیثیت مجموعی فکر نو کا جو کال ملتا ہے اور علامہ اقبال جیسی استثنائی مثال سے قطع نظر اور بیجنل فلاسفر یا ڈاکٹر عبدالسلام کی ایک اور استثنائی مثال سے قطع نظر اختراعی ذہن رکھنے والے سائنس دان نہیں ملتے تو متعدد وجوہ میں سے ایک وجہ شہنشاہیت اور آمریت بھی ہے۔ ایسے ہی غیر جمہوری معاشروں میں ملائیت فروغ پاتی ہے جس کے نتیجہ میں فتویٰ فروشی عام ہوتی ہے، اور یوں بالاخر جہالت کا ایک کلٹ بنا لیا جاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ آج ذہنی بنجرپن کی جس پست سطح تک آ پہنچا ہے اس سے زیادہ پستی کا تصور بھی محال ہے لیکن ہمارے ہاں جہالت کے نام پر جن تصورات کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے ان میں عقل و منطق کی کسوٹی بے کار ثابت ہوتی ہے۔ بین الاقوامی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے پر ہم کنویں کے مینڈک کی مثال نظر آتے ہیں۔ ذہنی افلاس، تنگ نظری، تعصب اور ملائیت کے محدود دائرہ میں محبوس ہم خود کو بے کنار سمجھتے ہیں اور اس احساس کو تقویت ملتی ہے پدرم

سلطان بود کے رویہ اور ماضی پرستی سے ! اسی لیے کہنہ رواجات' مردہ مسلمات اور نیگیٹو ٹیبوز ہم پر راج کرتے ہیں اور ہم اس امر پر غور کیے بغیر ہی ان کے اسیر رہتے ہیں کہ ان کی حقانیت کس نے طے کی تھی۔ ان کا عمومی جواز "تمام دنیا یہی کہا کرتی ہے" میں ملتا ہے حالانکہ تمام دنیا محض شاعرانہ اصطلاح میں مجاز مرسل (کل کہہ کر جزو مراد لینا) کا بھونڈا استعمال ہے۔ یوں عمومی جواز عمومی معیار میں تبدیل ہو گیا۔

حواشی

1- محمد حنیف ندوی' مولانا " عقلیات ابن تیمیہ" ص : 16

2- مقالہ بعنوان : "مذہب اور سائنس" مطبوعہ فنون جون جولائی 1989ء

3- ایضاً

4- "تخلیقی رویے" ص : 30

5- ایضاً ص : 48

4- مگروہ علم کے موتی"

اب تک جو لکھا گیا وہ صرف مغرب کے حوالہ سے تھا کہ خود ہمارے فلسفہ، سائنس اور متنوع علوم کا تناظر مغرب ہی سے تشکیل پاتا ہے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر تہذ یبیں اور معاشرے ایسے بنیاد پرستانہ رویوں سے آزاد رہے ہوں گے۔ مشرق میں ایران، چین، ہندوستان اور مصر کی بڑی تہذ یبیں ہو گزری ہیں اور ان سب میں بھی یہ کرداری رویے ملتے ہوں گے۔ ہاں ان کے اظہار کے لیے شاید سائنس نہ ہو مگر سوچنے سمجھنے والے آزاد خیال حضرات ہر عہد میں رہے ہیں لہٰذا تصادم کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رہی ہو گی اور نہیں تو بتوں کو خدا نہ سمجھنے کے باعث بھی ایسا ہو سکتا تھا یا پھر پجاریوں، پروہتوں کے اختیارات کے حوالہ سے یا ان رسوم کی بنا پر جو مذہبی نہ ہوتے ہوئے بھی مذہب کا جزو بنا دی جائیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ وجوہ، مسائل، مباحث، علوم، طرز فکر میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر انسانی معاشرہ سے قدیم اور جدید کی آویزش ختم نہیں ہو سکتی اور طرز کہن آئین نو سے ہمیشہ بر سرپیکار رہی ہے۔

ہم جہالت کا "کلٹ" بنائے بیٹھے ہیں جبکہ غیر ہمارے ماضی کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں چنانچہ تامس گولڈ سٹائن "جدید سائنس کا آغاز" میں پر جوش اسلوب میں "ارمغان اسلام" کے عنوان تلے یوں لکھتا ہے:

> "حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سائنس ان تمام تہذیبوں کے علوم کا لب لباب تھی جو مشرق و مغرب میں اسلام سے پہلے گزر چکی تھیں۔ اس طرح تاریخ پر اور قدیم دنیا پر ایک دریچہ وا ہو گیا، مشرق کی خوشبوئیں اور رنگ، بیرونی دنیا اور ماضی کے مناظر، یہاں تک کہ نیچر کی اپنی خوشبوئیں اور مناظر سیلاب کی طرح کیتھڈرل سکولز کے راہبانہ مطالعات میں امڈ پڑے" (ص: 84)

"متاع کارواں:"

جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو یورپ کے سبھی غیر جانبدار محققین اور غیر متعصب مفکرین نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ اگر مسلمانوں نے یونانی، لاطینی اور سنسکرت کتابیں عربی میں

ترجمہ نہ کی ہوتیں تو ان میں سے بیشتر کا آج کوئی نام بھی نہ جانتا ہوتا۔ بغداد، مصر، اندلس اور ہندوستان میں تراجم کے ضمن میں جو وقیع کام ہوا اس کی وسعت اور اہمیت کا احساس کرانے کے لیے مفصل کتاب کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے۔

مسلمانوں میں فلسفہ اور سائنس کی ترقی کا عرصہ محض ساڑھے تین سو برس پر محیط ہے یعنی اندازاً" 750 تا 1100ء تک۔۔۔ اگرچہ قوموں کی علمی ترقی، تہذیبی نشو و نما اور فروغ علم کے لحاظ سے یہ کوئی بہت زیادہ طویل مدت نہیں تاہم اس عرصہ میں کیا گیا اور بیشتر کام تعداد اور معیار کے لحاظ سے کم تر نہیں ثابت ہوتا چنانچہ طب، ہیئت، ریاضی، فلکیات، تاریخ، جغرافیہ اور فلسفہ کے ضمن میں کیے گئے کام کو آج بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ہم آج اس پر تو خوش ہوتے ہیں کہ ابن سینا، ابن رشد، فارابی الکندی نے صدیوں تک یورپ کی درسگاہوں پر راج کیا مگر ان کے حوالہ سے موجودہ صورت حال کے تضاد کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔ ہم اسلامی مفکرین کی جن کتابوں کے فخریہ نام گنواتے ہیں ہم میں سے اکثریت نے ان کی صورت تک نہیں دیکھی، ان پر تحقیقی کام نہیں کیا، شاید اسی لیے کسی میسنون کو منصور حلاج پر کام کرنا پڑتا ہے تو کسی رینان ساں کو ابن رشد پر! اقبال پون صدی قبل رویا تھا:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی !
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

اور آج بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔

جس قوم کے ماضی کی فلسفہ، سائنس اور دیگر علوم میں آج بھی عالمی سطح پر اہمیت تسلیم کی جاتی ہے(۱) اسے علم و عقل، سائنس اور فلسفہ سے بے گانہ رکھنے کی اتنی کامیاب کوشش کی گئی کہ سائنس کی تمام ترقیوں سے بہرہ ور ہونے اور مادی فوائد کے حصول کے باوجود دینی علماء کی اکثریت ہنوز سائنس کو مذہب کا دشمن سمجھتی ہے اور سائنسی رویہ اور اسی پر مبنی استدلال کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کبھی کبھی تحقیقات سے ماضی کی کسی ایسی بات کا علم ہو جاتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ اگر مسلمانوں نے عقل و خرد، علم و ہنر، اور فلسفہ و منطق سے بیگانگی اختیار نہ کی ہوتی تو اور فلسفیانہ فکر اور سائنسی تحقیقات کا دھارا جاری رہتا تو آج ہم کہاں ہوتے۔ "اخوان الصفا" کے حوالے سے ایک مثال پیش کرتا ہوں جنہوں نے بقول ڈاکٹر آغا افتخار حسین "حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ بھی پیش کیا یعنی یہ کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان ارتقا کے تدریجی منازل ہیں۔ یہ نظریہ تو

نیا نہیں تھا لیکن ایک بات اخوان الصفا نے ایسی کہہ دی جو حیرت انگیز حد تک جدید ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے لکھا کہ ارتقا میں حیوانات کی آخری منزل اور انسان کی پہلی منزل "قرد" یعنی بندر ہے جو صورت اور عمل کے اعتبار سے انسان سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ تعجب ہے کہ ڈارون سے ایک ہزار قبل یہ گستاخ لیکن (سائنٹفک) نظریہ پیش کرنے کی اخوان الصفا کو کیسے جرات ہوئی۔"(2)

بغداد میں نصیرالدین طوسی جیسے محقق کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک سازش کی بنا پر 15 برس زندان میں بند رکھا جاتا ہے اور رہا کون کرتا ہے ہلاکو خان' اسی ہلاکو نے تبریز (قدیم نام : مراغہ) میں طوسی سے فلکیات کی تحقیقات کے لیے ایک رصدگاہ قائم کرائی۔ یورپ کے ریاضی دانوں اور ماہرین علم ہیئت نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس رصدگاہ میں اجرام فلکی کے مشاہدے' نیز ریاضی اور اقلیدس کے مسائل حل کرنے کے لیے ایسے آلات استعمال ہوتے تھے جو یورپ میں کئی صدیوں بعد کوپر نیکس (Coper Nicus) وغیرہ کے زمانے تک ناپید تھے۔ اسی رصد گاہ میں محقق طوسی نے ریاضی کے ایسے مسائل پر مقالے لکھے جن پر عرصے تک اہل یورپ کی نظر نہیں گئی تھی.... چنانچہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "اصول اقلیدس" میں طوسی نے خطوط متوازی کے مصادر (Parallel Postulate) کا نظریہ پیش کیا جس پر پانچ صدیوں تک یورپ کے ریاضی دان بحث کرتے رہے۔"(3)

وائے نادانی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

"قرآن مجید کی تلقین:"

یہ ہمارے دینی مفکرین' علماء کرام اور جمعہ کے خطیبوں کا کمال ہے کہ انہوں نے خرد دشمنی اور عقل کی تکذیب کے لیے استدلال بھی قرآن مجید ہی سے حاصل کیا اس امر کے باوجود کہ قرآن مجید کی جن آیات میں نماز روزہ کی تلقین کی گئی ان کی تعداد 250 ہے جبکہ 756 آیات میں زندگی اور اس کے مختلف مظاہر کے مطالعہ اور کرۂ ارض اور کائنات پر غور و فکر کی تلقین کی گئی۔ یہ تو تھے غلام جیلانی برق(4) جبکہ دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد اعجاز الخطیب بھی اپنے طور پر اسی نتیجہ پر پہنچے تھے جس کا ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان پلاننگ کمیشن کے اجلاس (منعقدہ 22 جون 1989ء) میں "پاکستان میں سائنس" کے موضوع پر خطبہ میں ان الفاظ میں حوالہ دیا ہے:

"قانون سازی کے متعلق 250 آیات کے مقابلے میں قرآن کریم میں 750(5) آیات۔ جو کل قرآن کریم کا آٹھواں حصہ ہیں۔ اہل ایمان سے یہ کہتی ہیں کہ وہ فطرت کے مطالعے کے لیے کوشاں ہوں، غور کریں، عقل کا بہترین استعمال کریں اور سائنسی عزم کو اپنی معاشرتی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں"(6)

ہم 250 آیات مقدسہ کے مقرر کردہ اعلیٰ اخلاقی معیار کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکتے تھے لہٰذا انہیں فراموش کیا اور علم و عقل کی تلقین کرنے والی 756 آیات سے بھی گزرے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ یاد رکھنے کے باوجود یہ فراموش کر بیٹھے کہ انہوں نے حصول علم پر کتنا زور دیا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟

"حسن قرات کے رسیا:"

مختلف سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور فکری اسباب میں سے میری دانست میں ایک عمومی وجہ (کم از کم برصغیر کی حد تک) یہ رہی ہے کہ قرآن مجید کو ترجمہ سے پڑھنے کے بجائے تلاوت پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ عربی پڑھنے سے ثواب دارین حاصل ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کی اور کیا بد قسمتی ہو سکتی ہے کہ وہ عمر عزیز کی نصف صدی جس کتاب مقدس کے مطالعہ میں گزار دیتا ہے مرتے دم تک اسے یہ علم ہی نہیں ہو پاتا کہ میں کیا پڑھتا رہا۔ حسن قرات کے رسیا سامعین یہ نہیں جانتے کہ وہ کس وجہ سے وجد میں آ رہے ہیں، سر دھن رہے ہیں اور جزاک اللہ کہہ رہے ہیں۔ قرآن مجید کے معانی پر غور کرنے ہی سے اللہ کا وہ درست ادراک ممکن ہے جب یہ نہیں تو پھر جزاک اللہ کس بات پر؟ اسی لیے مسلمانوں کی اکثریت کو دین کا شعور نہیں اور اقبال نے جو کہا تھا وہ آج بھی سچ ہے کہ ہم قرآنی معیار کے برعکس زندگی بسر کرتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن !
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

علامہ اقبال اس امر کے کتنے قائل تھے اس کا اندازہ ان کے "خطبات" کے اس اقتباس سے بھی ہو سکتا ہے:

"صوفیہ اسلام میں ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب تک مومن کے دل پر بھی کتاب کا نزول ویسے نہ ہو جائے جیسے آنحضرت صلعم پر ہوا تھا اس کا سمجھنا محال ہے" (ص: 279)

اسی خیال کو علامہ نے یوں جامہ شعر پہنایا!

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

"قلم، علم، عقل، اور ہم:"

جس دین کے رسول پر پہلی وحی ہی یہ ہو "اقراء باسم ربک الذی" اور جس کتاب مبین میں ایک سورت کا عنوان "قلم" ہو اور قلم کی قسم کھا کر اللہ یہ کہتا ہو:

"قلم کی قسم اور ان تحریروں کی قسم جو قلم سے نکلیں گی کہ تم اللہ کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔" (قلم: 3-1)

قرآن مجید میں بار بار آسمان، چاند، سورج، ستاروں، بارش، نباتات، حیوانات، تولید، روئیدگی، نمو اور دیگر مظاہر فطرت کے بارے میں آنکھیں کھول کر غور و فکر کی جو دعوت دی گئی اسے دینی شخصیات، مذہبی محققین، علماء اور اسلامی نصاب سازوں نے بطور خاص اجاگر کرنے کی کبھی بھی کوشش نہ کی۔ بعض کی دانست میں تو یہ سب "علم الکلام" تھا اور علم الکلام اگر مقہور نہیں تو کم از کم مشکوک ضرور رہا ہے۔ ان حالات میں ایسی آیات مقدسہ کی اہمیت کیسے اجاگر ہو سکتی تھی:

"دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں ایک مردہ قوم کے دل بے حس ہو جاتے ہیں" (حج: 46)

"ارض و سما میں کتنی ہی ایسی آیات ہیں جن سے یہ لوگ منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں"(یوسف: 105)

"کیا یہ لوگ آسمان و زمین وغیرہ کی تخلیق پر غور نہیں کرتے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت قریب آگئی ہے" (اعراف: 185)

"اے رسول! ان سے کہہ دو کیا اہل علم اور بے علم کبھی ایک جیسے ہو سکتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی ان ہی لوگوں کی سمجھ میں آسکے گی جو عقل و فکر سے کام لیں" (سورۃ 36 آیت: 2)

"جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو، علم سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی سماعت اور بصارت (حواس) کے ذریعہ معلومات حاصل کر کے کامل غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچو یاد رکھو! اس بات میں تم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اسی طرح علم حاصل کر لیا تھا یا

یوں ہی کسی بات کے پیچھے پڑ گئے تھے" (بنی اسرائیل: 36- 17)

"قانون خداوندی کی رو سے بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے" (سورۃ 8: آیت 22)

"ان سے کہو کہ (مجھے بتاؤ) کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں" (سورۃ 6 آیت 50)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لیے تخلیق کائنات اور گردش لیل و نہار میں قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی نشانیاں ہیں" (سورۃ 3 آیت 189)(6)

"اس (اللہ) کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے خوف بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے۔ اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس (پانی) کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ بیشک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں"(روم: 25- 24)

کیا کسی ملا نے جمعہ کے خطبہ میں یہ اور ایسے ہی ارشادات کی حامل آیات بتانے کی کوشش کی ؟جس دین کے رسول نے یہ دعا مانگی:

"رب زدنی علما" (اے رب میرے علم میں اضافہ کر!) اس رسول کے پیرو کار جہالت کے پجاری ثابت ہوں اس امر کے باوجود کہ مختلف مواقع پر فرمایا گیا:

"غور و فکر سے کام لینے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں" (سورۃ 45- آیت 8)

شاید اسی لیے علامہ اقبال نے کہا:

منزل مقصود قرآں دیگر است
رسم و آئین مسلماں دیگر است

بقول ڈاکٹر عبدالسلام:

"ایک سائنس دان کی حیثیت سے قرآن مجید مجھ سے کلام کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ میں قوانین قدرت پر غور کروں اور اس سلسلہ میں کونیات، طبیعیات، حیاتیات اور علم طب کی مثالیں بطور نشانیاں دیتا ہے چنانچہ: تو کیا لوگ بادلوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی

گئی" (سورۃ 88 : آیت 17)

" اور پھر "زمین اور آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں" (سورۃ 13- آیت : 90)(7)

اس ضمن میں آئن سٹائن کے خیالات سے آگہی بھی سود مند ثابت ہو سکتی ہے جس کی رائے کے مطابق مذہب اور سائنس میں کسی طرح کی بھی مغائرت نہیں۔ ہنفے تھیولنے نے آئن سٹائن پر مضمون "چھچھوندر اور تتلی" میں اس کے حوالے سے لکھا ہے:

"حقیقی سائنس دان "کائناتی مذہبی احساس" سے سرتا سر لبریز ہوتا ہے۔ ان کے مطابق یہ مذہبی زندگی کا تیسرا درجہ ہے پہلے دو درجے علی الترتیب مذہبی خوف اور مذہبی اخلاقیات ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائناتی مذہبیت سائنسی تحقیق کے لیے سب سے طاقت ور اور شریفانہ محرک ہے۔ صرف کوئی ایسا شخص ہی جو بے پایاں جدوجہد اور اس سے بھی بڑھ کر بے غرض و الہانہ انہماک کا متحمل ہو سکتا ہو اور جس کے بغیر تحقیقات ممکن نہیں اس احساس کی قوت کو محسوس کر سکتا ہے جو اس قسم کے کام کی تنہا محرک بن سکتی ہے اور جو روزمرہ کی زندگی سے بے تعلق ہو۔ یہ کائناتی مذہبی احساس ہی ہے جو انسان کو ایسی توانائی عطا کرتا ہے" (مطبوعہ "پیامی" کراچی اگست 1979ء_ ترجمہ: سحر انصاری)

علامہ اقبال نے بھی "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں دو ٹوک الفاظ میں لکھا ہے:

"دراصل مذہب اور سائنس کی منزل مقصود، گو ان کے منہاجات ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک ہے، دونوں کو آرزو ہے کہ حقیقت کی تہ اور کنہ تک پہنچیں حتیٰ کہ مذہب... سائنس سے بھی کہیں بڑھ کر حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کا خواہش مند ہے" (ص: 303)

"معتزلہ اور مابعد:"

مسلمانوں میں عقل اور اس کے مظہر فلسفہ سے مغائرت کا آغاز ملائیت کے برعکس معتزلہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ معتزلہ ہی نے عقل کا کلٹ بنایا تھا۔ اگر بات محض دنیوی امور تک محدود رہتی تو شاید اتنی خرابی نہ ہوتی مگر ہوا یہ کہ انہوں نے حضور کی حیات، معراج شریف، قرآن مجید، روح، فرشتوں، جنت و دوزخ، ابلیس اور خود اللہ کے بارے میں ایسے سوالات اٹھائے جن سے دین کے بعض بنیادی عقاید ہی متزلزل ہونے لگے۔

نیاز فتح پوری نے اپنے مقالے بعنوان "اسلام کے متفرق فرقے اور فرقہ اعتزال" میں اعتزال کے رویے کو محض اس تحریک سے مخصوص قرار دینے کے بر عکس اس کا آغاز صحابہ کے زمانہ سے قرار دیتے ہوئے لکھا:

"اس کی ابتدا عہد اسلام ہی میں پڑ چکی تھی کیونکہ میرے نزدیک جس وقت سے اسلام اور مسائل اسلام میں چوں و چرا کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اس وقت سے اعتزال شروع ہو گیا تھا۔ پھر یہ سب کو معلوم ہے کہ عقائد و اعمال کے متعلق لوگوں کے درمیان اختلاف ابتدا ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ اور صحابہ کے درمیان معراج جسمانی کے متعلق اختلاف پیدا ہونا' سماع موتی کے متعلق عبداللہؓ بن عمر اور دوسرے صحابہؓ میں اتفاق نہ ہونا' رونے سے مردہ پر عذاب ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان عدم اتفاق' اسی طرح اوقات نماز' ترکیب وضو وغیرہ کے متعلق صحابہؓ کے درمیان اختلاف' یہ سب اسی امر کا ثبوت ہے کہ مذہبیات میں عقل و نقل سے استدلال کا رواج ابتدا ہی میں ہو گیا تھا اور حقیقتاً یہی بنیاد تھی اعتزال کی —"(8)

جہاں تک اس کے ایک دبستان بننے کا تعلق ہے تو اس کا آغاز بصرہ میں (100- 110 ہجری میں) ایک ایرانی واصل بن عطا سے سمجھا جاتا ہے جو کسی مسئلہ پر اختلاف کر کے حسن بصری کے درس سے الگ ہو گیا اور "معتزلہ" (الگ ہو جانے والا) کہلوایا' اس کے ساتھ عمرو بن عبید بھی شامل تھا۔ اس دبستان سے وابستہ دیگر مفکرین میں یہ اصحاب نمایاں ہیں ابوالہذیل' العلاف' نظام' ابو علی الاسواری' ابو موسیٰ المردار' ابو ہاشم' معمر بن عباد' ثمامہ بن سرس' ابوالحسن الخیاط' ابن فارس' زمخشری' ابو علی جبائی' غیلان دمشقی اور جاحظ۔!

معتزلہ کا دبستان فکر اپنے وقت میں بھی نزاعی تھا اور آج بھی' اس کے حق اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تاہم جہاں تک اس کے علمی' عقلی اور منطقی پہلو کا تعلق ہے تو اسے مسلمانوں کی فکری تاریخ میں جداگانہ باب کی حیثیت حاصل ہے اس امر کے باوجود کہ مخالف آراء کے حامل علماء پر تشدد بھی کیا گیا اور گردنیں بھی ماری گئیں۔ "تاریخ معتزلہ" کے مولف زہدی حسن جار اللہ کے الفاظ میں:

"جب معتزلہ کا شغف فلسفے سے زیادہ بڑھا وہ بیش از بیش اس سے متاثر ہونے لگے۔ عقل بشری کی عظمت کا کلمہ پڑھنے لگے' اس کی قوت پر ایمان لے آئے'

ادراک اشیاء اور امور کے مابین تطابق دینے کی قدرت یعنی عقل پر ان کا اعتماد اور زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ یہیں سے وہ اس منزل کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں جس نے ان سے وہ مشہور قاعدہ وضع کرایا جو دنیائے دانش میں "فکر قبل حدود سمع" کے نام سے مشہور ہے۔ تمام معتزلہ اس بات پر متفق ہیں کہ انسان عاقل ہے اور ورود شر سے پہلے بھی وہ اشیاء کے حسن و قبح کی تمیز اور خیر و شر کے مابین تفریق پر قادر تھا اور اگر اس معرفت میں قاصر رہتا تو ، اس پر دائمی عقوبت واجب ہوتی "(9)

اس اقتباس کی آخری سطریں بے حد معنی خیز ہیں کہ ان ہی میں "عقل کل" کے اس تصور کی ابتدائی صورت ملتی ہے جس نے اپنی منطقی انتہا پر پہنچ کر خلق قرآن اور جسمانی معراج جیسے معاملات پر تشدد کو روا رکھا اور جس کے نتیجہ میں معتزلہ کو کافر، دھریہ اور زندیق جیسے القابات سے نوازا گیا۔

معتزلہ کی تاریخ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عقل پرستی کے داعی ہونے کے باوجود اپنے افکار و تصورات کے نفاذ میں یہ کسی بھی بنیاد پرست اور متعصب ملا سے کم نہ ثابت ہوئے حالانکہ عقل پرستی کی اساس بھی اسی پر استوار ہونی چاہیے کہ دیگر قویٰ انسانی کی مانند عقل کی بھی حدود ہیں اور منطق ایک دائرہ میں سفر کرتی ہے۔ اپنے مخصوص تصورات — جنہیں ایک طرح سے اسلام کے بنیادی ارکان کی حیثیت دے دی گئی تھی — کے نفاذ کے ضمن میں شدت پسندی سے قطع نظر معتزلہ کے دبستان سے وابستہ اہم دانش ور کئی امور میں مغرب کے بعض جدید فلسفیوں کے پیش رو نظر آتے ہیں۔ چنانچہ "تاریخ معتزلہ" کے مولف کے بقول:

"وہ دور جدید کے مذاہب فلسفہ پر سبقت رکھتے ہیں کیونکہ معتزلہ کا یہ قول ہے کہ معارف ضرورۃ ثابت ہیں وہ اس فلسفہ عقلیہ (Rationalism) سے بہت قریب ہیں جن کا قافلہ سالار ڈیکارٹ، اسپائنوزا اور کانٹ وغیرہ ہیں اور جس معتزلہ کا یہ قول ہے کہ معارف ضرورۃ ثابت نہیں کسبی ہیں وہ فلسفہ تجربی (Empiricism) سے بہت قریب ہیں جن کے علم بردار ہیوم اور برکلے وغیرہ ہیں۔"(10)

"روح اعتزال:"

اگرچہ بدلے سیاسی حالات کے باعث معتزلہ کو زوال آگیا یہی نہیں بلکہ مسائل و مباحث

میں اختلافات کے نتیجہ میں یہ خود بھی 22 فرقوں میں تقسیم ہو گئی(۱۱) تاہم عقلیت کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی واحد تحریک تھی۔ اس امر کے باوجود کہ اس نے دینی دانش وروں کو ایسا خوفزدہ کیا کہ پھر مسلمانوں میں عقل پر استوار کوئی دبستان معرض وجود میں نہ آسکا۔ اسلامی دانش وروں' دینی راہنماؤں' مذہبی محققین اور مصلحین' سائنس' منطق' جدید علوم اور تصورات نو سے اگر خوفزدہ رہے اور انھیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں تو تحت الشعور میں معتزلہ کا خوف بھی تھا جو الحاد اور بے دینی کی علامت بن چکے تھے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ "نقلیت" کی انتہا میں توازن پیدا کرنے کے لیے جس "عقلیت" کی ضرورت تھی وہ میسر نہ آئی حالانکہ مسلمانوں کی ذہنی تاریخ کی ہر کروٹ کے موقع پر روح اعتزال کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے اور آج کے پاکستان میں تو شاید سب سے زیادہ' علی عباس جلال پوری کی بھی یہی رائے ہے:

> "ہم لوگ قرون وسطی کے زمانے میں بس رہے ہیں۔ ہمارے ہاں نہ تو نشاۃ الثانیہ ہوئی نہ اصلاح مذہب کی تحریک چلی' نہ ہی خرد افروزی پر کچھ کام ہوا۔ چند گھسے پٹے مسائل ہیں جن پر بحث ہوتی رہتی ہے۔ دنیائے اسلام میں ہر سال سینکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں لیکن سب ایک ہزار سال پہلے کے مسائل سے متعلق ہیں۔ کوئی کتاب آج کے مسائل سے بحث نہیں کرتی.... معتزلہ کی تحریک کا احیاء ہی مسلم خرد افروزی کا سبب بن سکتا ہے۔ کام یہیں سے شروع کرنا پڑے تو کچھ علمی ترقی ہو سکتی ہے.. غزالی کے افکار کے احیاء کے مقابلے میں معتزلہ تحریک کا احیاء کرنا چاہیے کیونکہ یہی ہماری خرد افروزی کی تحریک بن سکتی ہے۔ جب تک لوگوں کا عقل و خرد پر اعتماد محکم نہیں ہوتا اس وقت تک ہم حقیقت پسندی اور سائنسی سوچ نہیں اپنا سکتے...." (انٹرویو مطبوعہ: "راوی" 1989ء)

"اہل سنت بمقابلہ حکماء:"

اسلام نے صحرائے عرب کے بدوی معاشرہ میں جنم لیا جو بیشتر امور میں دو ٹوک قسم کا معاشرہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پاک صاف اور احسن اخلاق پر مبنی زندگی اور قرآن مجید کی واضح تعلیمات تو مسلمانوں کے لیے کافی تھیں لیکن فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے باعث جب متنوع اور قدیم تہذیبیں اسلامی ممالک میں شامل ہوتی گئیں تو ان کے مخصوص فلسفے' تصورات حیات اور افکار بھی بھیس بدل کر اسلامی فکر کے دھارے میں

شامل ہوتے گئے جس کا اظہار فرقوں کی صورت میں بھی ہوا۔ بحیثیت مجموعی جنہیں عقلی اور نقلی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی عقاید اور فکر (فلسفہ، منطق علوم، سائنس وغیرہ) پر استوار!

مسلمانوں میں یہ فرقے نسبتاً مشہور رہے ہیں۔ جبریہ، قدریہ، متکلمین، ماتریدیہ، معتزلہ اور مرجیۂ (لفظی مطلب: نزاعی دینی امور میں توقف یعنی عقل و فکر سے کام لینا) مرجیہ کے بموجب دین کے اساسی اصولوں پر ایمان لانا اور اپنے اعمال سے انکا اثبات دو جداگانہ امور تھے کہ یوں بد اعمالی کا جواز مل جاتا تھا جبکہ خوارج ان کے برعکس دوسری انتہا پر تھے۔

ادھر سائنس سے دلچسپی بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ یونانیوں کے لیے زمین ساکت تھی، کائنات جامد تھی لہٰذا ان کا تصور خدا بھی ان ہی کا عکس تھا جبکہ اسلام حرکی تصور زیست کا حامل تھا کہ خدا نے "کُن" کہہ کر کائنات تخلیق کی، علامہ اقبال بھی اسی تصور کے قائل تھے چنانچہ انہوں نے چھٹے خطبے کا آغاز یوں کیا ہے:

"مذہب و ثقافت کی نظر سے دیکھاجائے تو بحیثیت ایک تحریک اسلام نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے بر عکس اس کے وہ اسے متحرک قرار دیتا ہے" ("تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" ص: 223)

یونانی فلسفہ کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام کے حرکی تصور زیست اور خالق کائنات کی خود مختار فضلیت کو ارسطو کے تصورات کی روشنی میں پرکھتے ہوئے فارابی اور ابن سینا نے جو کچھ کہا وہ عام لوگوں کے لیے الحاد اور زندقہ سے کم نہ تھا۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد حنیف ندوی کے بقول:

"اہل سنت اور حکماء میں بالعموم ٹھن گئی چنانچہ ائمہ اہل سنت نے تو حکماء کو ملحد و زندیق ٹھہرایا اور پوری پوری کوشش کی کہ اسلامی مدارس، معاشرہ اور عوام ان کے خیالات سے متاثر نہ ہوں۔ دوسری طرف حکماء نے انہیں فلسفہ و حکمت کے تقاضوں سے بے خبراور اسلام کی فکری و عقلی ثروت سے عاری قرار دیا...

ابن اثیر نے "الکامل" میں عبداللہ بن باقیا کے بارے میں لکھا:

شرائع پر زبان طعن دراز کرتا تھا"

یا جیسا کہ یاقوت احمد النند جوری سے متعلق کہا ہے:

"ملحدانہ افکار کو اپنا۔۔ الا جس نے کبھی ان خیالات کو چھپانے کی ضرورت

محسوس نہیں کی"

"فلسفہ بے وقوفی کی بنیاد:"

"علوم عقلیہ کے فروغ و ارتقا نے اسلامی معاشرہ میں ملحدانہ فتنوں کو کس درجہ ابھار دیا تھا اعمال میں تساہل' اسلامی عقاید کا استخفاف' جبر و قدر اور صفات سے متعلق لاطائل اور بے سود بحثیں' یہ تھے وہ عوامل جنہوں نے فقہا' محدثین اور صوفیاء کی صفوں میں ناراضی اور عناد کی لہر دوڑا دی۔ اس نزاع کو علامہ ابن الصلاح کے مخالفانہ فتویٰ نے اور تیز کر دیا۔ فلسفہ کے بارے میں انہوں نے کہا:

"فلسفہ بے وقوفی کی بنیاد ہے ضعف و اضمحلال کی جڑ ہے تحیر و گمراہی کا خمیر ہے اور الحاد و زندقہ کے فتنوں کو ابھارنے والا ہے اور جس نے بھی فلسفہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اس کی بصارت ضائع ہو گئی اور اس کی بصیرت سے اس شریعت پاک کے محاسن یکسراوجھل ہو گئے کہ جس کو کھلے ہوئے اور واضح دلائل کی حمایت حاصل ہے۔"(12)

مولانا حنیف ندوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے علوم منطق و علوم عقلیہ کے خلاف قلم اٹھایا وہ فکر و نظر کے مختلف مدارس سے تعلق رکھتے تھے ان میں ابو سعید نیرانی' سہروردی' ابولبرکات نو بختی' امام الحرمین جوینی' جبائی' ابوھاشم' ابن حزم اور قاضی ابوبکر بن الطیب کے نام نامی بہت مشہور ہیں۔"(13)

علامہ ابن الصلاح نے فلسفہ کے ساتھ ساتھ منطق کو بھی مردود قرار دیتے ہوئے کہا:

" جہاں تک منطق کا تعلق ہے اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ یہ حصول فلسفہ کا سبب ہے اور شر کے سبب اور ذریعے کو بھی شر ہی کہنا چاہیے"(14)

مسلمان دانشوروں نے منطق سوزی کا شعار بنایا اور اسے گمراہ کرنے والی لہٰذا مردود سمجھنے والے حضرات کی اب بھی کمی نہیں جبکہ یورپین محققین جدید منطق پر مسلمان حکماء کے اثرات دریافت اور تسلیم کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر فواد سیزگین مقالہ بعنوان "عربی و اسلامی علوم کا یورپ کی تحریک احیائے علوم پر اثر" میں لکھتے ہیں:

"راجر بیکن (Roger Bacon) اور رابرٹ گروسٹے کا انحصار الکندی' ابن رشد' ابن سینا اور بعض اور عرب مولفین پر رہا اور بیکن کو تو عربوں کا شاگرد کہنا چاہیے۔ اس کی شہرت بعض ایسی اہم دریافتوں کے حوالے سے ہوئی جو سب کی

سب اس نے عربوں سے اخذ کیں۔ اس کی یہ شہرت کہ وہ پہلا عالم ہے جس نے علم کے لیے تجربے سے استفادہ کیا ہے بے سوچے سمجھے قبول نہ کر لینی چاہیے کیونکہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہونے والی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ البیرونی اور ابن الہیثم جیسے علما کو (اس سلسلے میں) سبقت زمانی حاصل ہے اور بیکن گویا ان کا شاگرد تھا جو اپنے اساتذہ کی سطح تک پہنچنے سے قاصر رہا۔"

(ترجمہ : ڈاکٹر خورشید رضوی، مقالہ مطبوعہ "فکر و نظر" اسلام آباد، جولائی ستمبر 1993ء)

ادھو ابن تیمیہ نے یہ کہا کر منطق کو رد کر دیا :

" ذہین آدمی کو اس کی ضرورت نہیں اور غبی اس سے استفادہ نہیں کر پاتا۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ خود ابن تیمیہ کی یہ دلیل یونانی منطق کے مشہور طرز استدلال Delimma پر مبنی ہے۔

اگرچہ ابن سینا جیسے حضرات بھی ملتے ہیں جو منطق کو انسانی ذہن کی اعلیٰ کارکردگی کے مترادف گردانتے تھے اور جن کی دانست میں :

"منطق ایک آلہ ہے جو انسان کو تصورات و تصدیقات کے معاملے میں سہو و لغزش سے بچانے والا، اعتقاد صحیح کی جانب پہنچانے والا ہے۔"(15)

مگر علماء کی اکثریت منطق اس کی حامل عقل اور اس پر مبنی فلسفہ سے متنفر ہی رہی۔ منطق مخالفین میں ان حضرات کے اسماء نمایاں ہیں، الاشعری، نظام، ابن تیمیہ، الکندی، ابن حزم، ابن الہیثم اور الغزالی وغیرہ۔

"غزالی بمقابلہ ابن رشد :"

فلسفہ دشمنی میں امام غزالی (1058-1111ء) خصوصی شہرت کے حامل ہیں انہوں نے "تہافتہ الفلاسفہ" میں یونانی فلسفہ، منطق، ارسطو اور اس کے مقلدین پر اعتراضات کرتے ہوئے فلسفہ اور منطق کو کفر اور الحاد کا باعث قرار دیا۔ امام غزالی کی موثر شخصیت اور علمیت فلسفہ و منطق کے خلاف ایک زندہ دبستان کی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ ان کے زیر اثر فلسفہ کی کتابیں قابل سوختنی قرار دی گئیں۔

امام غزالی فلسفہ، علوم اور تصوف کے لحاظ سے بھی نزاعی شخصیت رہے ہیں اور ان کی ستائش اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے تاہم مولانا مودودی نے ان کی "علمی، فکری

حیثیت سے چند نقائص" کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں- ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں پیدا ہوئے (یہاں مولانا نے حاشیہ میں لکھا ہے "تاج الدین سبکی نے طبقات الشافیہ میں ایسی تمام احادیث کو جمع کر دیا ہے جنہیں امام غزالی نے احیاء العلوم میں درج کیا ہے اور جن کی کوئی سند نہیں ملتی— ملاحظہ ہو طبقات حصہ چہارم صفحہ 145 تا 186) دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے-"(16)

ابن رشد (1198- 1126) نے امام غزالی کو "مرتد فلسفہ" قرار دیتے ہوئے "تہافتہ التہافتہ" قلم بند کر کے فلسفہ پر غزالی کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا' مگر زمانہ کی یہ روش نہ تھی چنانچہ اس کی کتابیں جلائی گئیں' قرطبہ سے جلا وطن کیا گیا اور عمومی تذلیل ہوئی- جس کا اندازہ معاصر شاعر ابوالحسن ابن جبیر کی اس ہجو سے لگایا جا سکتا ہے:

"اب ابن رشد کو یقین ہو گیا کہ اس کی تصنیفات کیسے مضر شے ہیں- اے وہ شخص! جس نے خود اپنے تئیں بے حرمت کیا ذرا سوچ تو سہی کہ اب کوئی ایک شخص بھی ہے جو تیرا دوست بننا پسند کرتا ہے؟ اے ابن رشد! جب تیری کوششیں اس صدی میں اس قدر بلند پروازی کرنے لگیں تو تو رشد و ہدایت کی راہ پر قائم نہیں رہا' تو نے مذہب سے دغا کی' تیرے دادا کا طریق عمل یہ نہ تھا- تقدیر نے ان تمام مکذبین مذہب کو جو فلسفہ کو مذہب سے ملاتے رہتے ہیں اور الحاد کی تعلیم دیتے ہیں نیچے گرا دیا' وہ منطق میں مشغول ہوئے اور یہ بات سچ ثابت ہو گئی کہ منطق ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہے"(17)

ابن رشد ارسطو کا غیر مشروط مداح تھا اور اسی لیے اس کا بہترین شارح بھی' موسیو رنیاں ساں کے الفاظ میں "بلا خوف تردید وہ تمام فلاسفہ عرب اندلس میں سب سے کم تصوف کی طرف مائل تھا- وہ با آواز بلند کہتا ہے کہ ہم اس اتصال کو صرف حکمت سے حاصل کر سکتے ہیں- اس کی نگاہ میں ارتقاء انسانی کا بلند ترین مقام وہ ہے جہاں قوائے انسانی اپنی تمام انتہائی استعداد امکانی حاصل کر چکی ہوتی ہیں- آدمی جب غور و فکر کی مدد سے اس پردہ کے اندر داخل ہو گیا جو اشیاء کی حقیقت پر پڑا ہوا ہے تو وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے-

یہاں حقائق علویہ اسے رو در رو نظر آتے ہیں۔ صوفی کی ریاضت بے کار و بے سود ہے۔ آدمی کی اعلیٰ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اپنے نفس کے جزو اعلیٰ کو اپنے احساسات پر غالب رکھے، اگر یہ مرتبہ حاصل ہو گیا تو بہشت حاصل ہو گئی۔ خواہ آدمی کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو لیکن یہ نعمت بہت کم یاب اور صرف بڑے لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے۔" (18)

اگرچہ ابن رشد کے راسخ العقیدہ معاصرین اسے ملحد اور دھریہ سمجھتے تھے مگر یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلمان میں نہیں تھے۔ اگرچہ وہ فلسفہ کو مذہب کی "دودھ شریک بہن" قرار دیتا تھا اور منطق کے بارے میں اس کی یہ رائے تھی کہ "یہی ہے جس کی مدد سے موجودات اور ان میں پوشیدہ صناعت کے اشاروں پر غور و فکر کے قابل ہوتے ہیں" (19) تاہم وہ مذہب دشمن نہ تھا جو شخص مذہب کے بارے میں ایسا معتدل تصور رکھتا ہو اسے کیسے کافر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابن رشد "تہافتہ التہافہ" میں لکھتا ہے:

"ایک عالم آدمی کی فضیلت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان نظریات کو نہ ٹھکرائے جن کے درمیان رہ کر اس کی پرورش ہوئی ہے اور یہ کہ اسے نہایت انصاف سے ان نظریات کی تشریح کرنا چاہیے اور یہ کہ اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ ان نظریات کی روح ان کے آفاقی کردار میں پنہاں ہے ان کی شخصیت میں نہیں اور یہ کہ اگر وہ ان مذہبی اصولوں کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرتا ہے جن کے درمیان اس کی پرورش ہوئی ہے یا ان کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ وہ پیغمبروں کے مخالف معلوم ہوں اور ان (پیغمبروں) کے راستے سے منحرف ہو جائے وہ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہے کہ کافر کی اصطلاح اس پر منطبق کی جائے اور وہ اس سزا کا سزاوار ہو جاتا ہے جو اس مذہب میں کفر کے لیے قائم کی گئی ہے جس میں اس کی پرورش ہوئی" (20)

ابن رشد کے مقابلے میں تو ابوبکر الرازی کہیں زیادہ انتہا پسند تھا۔ جس نے مذہب کو بنائے فساد قرار دے کر اس کی مذمت کی' وہ مذہب پر فلسفہ اور وحی پر عقل کی برتری کا قائل تھا اور پھر ابن خلدون بھی ملتا ہے جو تمام تر روشن خیالی کے باوجود سائنسی علوم کا قائل نہ تھا' طبیعیات کے بارے میں اس کا یہ قول ڈاکٹر عبدالسلام نے نقل کیا ہے:

"یہ بات واضح ہے کہ طبیعیات کے مسائل ہمارے مذہبی امور کے لیے کسی بھی اہمیت کے حامل نہیں ہیں اس لیے ہمیں ان ہی پر چھوڑ دینا چاہیے۔" (21)

حواشی:

حواشی:

1- ایک روسی دانشور لونسکیا (Levinskaya) اپنی تالیف "Scientific Religion" میں مسلمانوں کی سائنس اور سائنسی خدمات پر بحث کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آسمانی صحائف میں قرآن مجید ہی ایسی کتاب ہے جس میں مذہب اور سائنس میں مفاہمت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ قرآن مجید مسیح سے چھ صدیاں بعد آیا تاہم اس میں متعدد جدید علوم جیسے فزکس، جیولوجی، بایولوجی، اسٹرونومی وغیرہ کے بارے میں مواد ملتا ہے وہ مزید رقم طراز ہے:

> "صرف قرآن مجید ہی کے ذریعہ سے آج کے اس اہم ترین مسئلہ کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے کہ اب سائنسی ایجادات کو کیسے خالق کونین کے قوانین کے تابع کر کے جدید دور کے ذہنی خلفشار اور تناؤ کا خاتمہ کیا جا سکے"

2- "قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ" ص: 143

3- ایضاً ص: 37

4- "دو قرآن" ص: 11

5- "ارمان اور حقیقت" ص: 358

شیخ طنطاوی کی تفسیر کے دیباچہ میں بھی علوم کے ضمن میں قرآنی آیات کی یہی تعداد بتائی گئی ہے

6- ان آیات کے تراجم بحوالہ "اسلام میں توسیع فکر کی اہمیت" از غلام احمد پرویز۔ مطبوعہ "ماہ نو" لاہور۔ خاص نمبر مئی 1980ء

7- "ارمان اور حقیقت" ص: 185

8- مقالہ مطبوعہ "نگار پاکستان" جشن طلائی نمبر 1983ء

9- زہدی حسن جاراللہ: "تاریخ معتزلہ" مترجم۔ رئیس احمد جعفری ص: 228

10- ایضاً ص: 28-27

11- ایضاً ص: 453

12- "عقلیات ابن تیمیہ" ص: 19-18

13- ایضاً ص: 192

14 ایضاً ص: 19

15- ایضاً ص: 21

16- تجدید و احیائے دین" ص: 73—72

17- رینان سال، موسیو "ابن رشد و فلسفہ ابن رشد" مترجم: مولوی معشوق حسین خاں (علیگ) ص: 20

18- ایضاً ص: 109

19- 20- خلیل احمد "ابن رشد اور مذہب و فلسفہ کا نزاع" مقالہ مطبوعہ "فنون" جنوری مارچ 1991ء

21- "ارمان اور حقیقت" ص: 355

5- اک صورت خرابی کی:"

"فلسفہ نزول مصیبت"

مسلمانوں کی علمی ترقی کی تاریخ کی یہ عجیب پر تضاد صورت حال رہی ہے کہ اگر ایک طرف علم پرور بادشاہوں نے اہل علم کی سرپرستی کی، فروغ علم کے لیے مدارس قایم کیے، کتب خانوں کا اہتمام کیا، علماء کے وظائف مقرر کیے اور یونانی، لاطینی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت کے علمی اور ادبی شاہکاروں کے تراجم سے ذہنی آفاق میں وسعت پیدا کرنے کی سعی کی، وہاں یہ بھی حقیقت ہے عقیدہ کے نام پر اہل علم ذلیل ہوئے، داخل زندان کیے گئے، جلاوطن کیے گئے اور چوراہوں پر کتب سوزی بھی کی گئی۔

علمی ترقی کا آغاز بغداد میں عباسی خلفاء کے علم پرور رویہ کی بنا پر ممکن ہوا، خلیفہ منصور نے 762ء اور خلیفہ مامون الرشید نے 832ء میں کتب خانوں، رصد گاہوں اور تراجم کتب کا اہتمام کیا۔ یوں دنیا بھر کی زبانوں کے علمی نوادر عربی میں منتقل ہونے لگے اور اسی بنا پر آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ بھی رہ گئے— اس علمی سرپرستی کا اجر کیا ملا؟ اس کا اندازہ خلیفہ مامون الرشد کے بارے میں ابن تیمیہ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

> "میں نہیں سمجھتا کہ خدا تعالیٰ مامون سے غافل رہے گا بلکہ اس امت پر اس (یعنی مامون الرشید) نے جو مصیبت (فلسفہ) نازل کی اس کا بدلہ اللہ ضرور اس سے لے گا"

اس انداز فکر کی بنا پر فلسفہ، منطق اور دیگر عقلی علوم اسلام کے بنیادی عقاید سے متصادم قرار دئے گئے اور ان کا مطالعہ ناپسندیدہ اور ممنوع قرار پایا جس کے باعث بغداد، سکندریہ اور قرطبہ نے علمی سرگرمیوں کے مراکز ہونے کے ساتھ ساتھ علم کشی، میں بھی نام پیدا کیا۔ مسلمانوں میں عقل کشی، خرد دشمنی اور فلسفہ، منطق اور سائنس سے نفرت کا موضوع قدیم بھی ہے اور تلخ بھی— اور اس پر خاصی خامہ فرسائی بھی ہو چکی ہے۔

"ہم ایسی سب کتابیں..."

فرانسیسی مستشرق موسیو رینان ساں مسلمانوں کی علمی بربادی کے ضمن میں اپنی تالیف "

ابن رشد و فلسفہ ابن رشد" میں یوں رقم طراز ہے:

"قرطبہ کی مساجد جہاں طلبہ ہزاروں کی تعداد میں تھے علمی و فلسفی تنظیموں کی پر جوش مرکز بن گئی تھیں مگر وہ مسلک سبب جو مسلمانوں میں ہمیشہ تہذیب و ارتقا ذہنی کا مانع رہا یعنی مذہبی تعصب— وہ اندر ہی اندر الحکم کے کارہائے نمایاں کی بربادی کا انتظام کر رہا تھا۔ دارالعلوم بغداد کے علمائے مذہب نے مامون الرشید کی نجات آخروی کے بارے میں شبہ کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس نے فلسفہ یونان کو پھیلا کر اسلامی عقاید میں تزلزل پیدا کر دیا تھا۔ اندلس کے متعصب اہل مذہب نے بھی اس سے کم سختی کا برتاؤ نہیں کیا" (ص: 90) "حاجب المنصور... نے الحکم کے کتب خانے کو جو اتنی محنت سے جمع کیا گیا تھا تمام کھنگال ڈالا اور فلسفہ' ہیئت اور قدما کی دیگر علوم کی کتابوں کو قرطبہ کے عام منظر پر جمع کر کے آگ لگا دی اور جو بچ رہیں انھیں دریا برد کر ڈالا یا محل شاہی کے حوض میں ڈبو دیا۔ صرف دینیات' صرف و نحو اور طب کی کتابیں اس دستبرد سے بچ رہیں...." (ص: 9)

"(خلیفہ منصور) نے ساتھ ساتھ ہی تمام صوبہ جات میں احکام جاری کیے کہ اس قسم (یعنی فلسفہ) کی خطرناک تعلیم کی ممانعت کر دی جائے اور جن کتابوں سے طبیعت اس طرف مائل ہوتی ہے انھیں جلا دیا جائے" (ص: 19) "اس موقعہ پر باشندگان مراکش اور سلطنت کے دیگر بڑے بڑے شہروں کے لوگوں کو سنانے کے لیے (جو فرمان) روانہ کیا گیا اس کی ہر سطر سے اس نفرت کا اظہار ہوتا ہے جس کے بھڑکانے والے آزاد خیال طلبائے حکمت و فلسفہ تھے" (ص: 19) "ابن حبیب اشبیلی کو صرف اس علت میں سزائے موت دی گئی کہ وہ فلسفہ پڑھا کرتا تھا۔" (ص: 24)

قیاس کن زگلستان من بہار مرا— کہ بقول موسیو رینان ساں:

"خلیفہ الحکم کا زمانہ گو فلسفہ کے لیے بہترین زمانہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں ایک بھی بڑے آدمی کا نام نظر نہیں آتا برخلاف اس تعصب کے جو علماء و حکماء کے ساتھ اس زمانے میں کیا جاتا تھا ابن باجہ' ابو بکر رازی' ابن زہرہ اور ابن رشد کے خیالات اہل یورپ کی زندگی کی موجوں میں جو اصلی حقیقی زندگی ہے نمایاں نظر آتے ہیں" (ص: 10)

جہاں تک مسلمانوں میں مذہب، عقاید، شریعت اور رسوم کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق اور سائنسی شعور کے تصادم کا تعلق ہے تو یہ تلخ کے ساتھ ساتھ جان لیوا بھی ثابت ہوا۔ اس نے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ، ثقافتی اقدار، تحقیقی صلاحیتوں، تعلیمی مقاصد، تمدنی امور اور فکری رویوں کی تشکیل یا پھر عدم تشکیل میں اساسی نوعیت کا جو کردار ادا کیا بعض امور کے لحاظ سے تو اس کی باز گشت آج بھی سنائی دے جاتی ہے۔ اسے ملائیت کہیں، تنگ نظری، جہل مرکب، علمی تعصب یا جدید اصطلاح بنیاد پرستی— یہ عمل مسلمانوں میں ہمیشہ سے ہی جاری رہا ہے۔ اہل خرد، اہل علم، اہل دانش، اہل فلسفہ اور آزاد خیال ہمیشہ سے ہی اقلیت میں رہے ہیں جبکہ کم نظر اور کوتاہ بین کی ہمیشہ ہی اکثریت رہی ہے۔ وہی سونے اور لوہے کی مثال!

"شہادت:"

انتظار حسین نے "نیاز فتح پوری" ("شب خون" الہ آباد، مارچ مئی 1986ء) میں گلیلو کی مذہبی عدالت میں توبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کی معذرت پر:

"آدرش پسند شاگرد بہت بے مزہ ہوئے اور بولے بد نصیب ہے وہ قوم جس میں شہید پیدا نہیں ہوتے۔ گلیلو نے جواب میں کہا بدنصیب وہ قوم ہے جسے شہیدوں کی ضرورت رہتی ہے۔ پتہ نہیں دونوں میں سے صحیح کون ہے؟ شاید دونوں ہی اپنی جگہ سچے ہوں اور اگر یوں ہے تو ہم مسلمان لوگ خالی بد نصیب نہیں ساتھ ہی خوش نصیب بھی ہیں۔ ہم بدنصیب ہیں کہ ہمیں ہر زمانہ میں شہیدوں کی ضرورت رہی ہے، ہم خوش نصیب ہیں کہ ہر زمانے میں ہمارے درمیان شہید ظہور کرتے رہے ہیں۔ تو یوں ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ میں فکر و احساس کی، ذہن و قلم کی آزادی کی روایت قائم کر سکوں ہوں یا نہ کر سکے ہوں، انہوں نے بہرحال اس قیمتی اضافی قدر کے لیے شہادت پیش کرنے کی روایت ضرور قائم کر رکھی۔"

یہ وہی بات ہے جسے غالب اور فیض نے اپنے اپنے زمانے میں شاعرانہ اسلوب میں بیان کیا ہے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

"اجتہاد یا معصیت:؟"

دوسری صدی ہجری میں اسلام میں چار بڑے امام یعنی آئمہ اربعہ کے اسماء یہ ہیں: امام ابو حنیفہ (767- 699ء) امام مالک (798- 714ء) امام شافعی (854- 767ء) امام احمد بن حنبل (855- 780ء) یہ تو وہ شخصیات ہیں جنہوں نے اسلام کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور فقہ کے ان دبستانوں کی بنیاد ڈالی جو آج تک فعال ہیں۔ ان کے بر عکس صورت حال کیا تھی اس کا منظر مولانا مودودی نے "تجدید و احیائے دین" (ص: 75- 73) میں ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"نئے تاتاری حملہ آور اگرچہ اسلام قبول کرتے چلے جا رہے تھے مگر جاہلیت میں یہ حکمران اپنے پیش رو ترکی فرماں رواؤں سے بھی کئی قدم آگے تھے۔ ان کے زیر اثر آکر عوام اور علماء و مشائخ اور فقہاء و قضاۃ کے اخلاق اور بھی زیادہ گرنے لگے۔ تقلید جامد اس حد تک پہنچ گئی کہ مختلف فقہی و کلامی مذاہب گویا مستقل دین بن گئے۔ اجتہاد معصیت بن کر رہ گیا۔"

مولانا نے اس ضمن میں حاشیہ میں یہ بھی تحریر کیا ہے:

"اس وقت کے علماء کی حالت یہ تھی کہ ہلاکو خان نے بغداد پر تسلط جمانے کے بعد علماء سے فتویٰ طلب کیا کہ سلطان کافر عادل اور سلطان مسلم ظالم میں سے کون افضل ہے؟ تو علمائے کرام نے بلا تکلف یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ سلطان کافر عادل افضل ہے۔"

"حقیقت خرافات میں کھو گئی:"

ہم مسلمان ہندوؤں اور بعض دیگر اقوام کی اساطیر کو "خرافات" قرار دیتے ہوئے ان کی غیر عقلی توجیہات کا مضحکہ اڑاتے ہیں مگر ہم بھی "اسطور سازی" میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اگر مذہب کے نام پر مسلمانوں میں پائی جانے والی باتوں، تمثیلوں، روایات اور حکایات کا علمی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اچھی خاصی سائنسی فکشن کا مزا آجائے۔

نیاز فتح پوری نے "نگار پاکستان" (کراچی: جنوری 1966ء) میں کوہ قاف کے بارے میں باب الاستفسار میں یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں مگر اس سے پہلے انہوں نے تمہید میں یہ بھی

لکھا:

"جب کوئی مذہب اپنے ابتدائی دور سے گزر جاتا ہے اور قوت عمل ضعیف ہو کر صرف قوت خیال پر معتقدات کی بنیاد قائم ہوتی ہے تو بعض نہایت عجیب و غریب صورتیں پیدا ہو جاتیں ہیں اور ایک محقق کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اصل ہیئت کسی مذہب کی کیا تھی اور بعد کو اس میں کیا کیا اضافے کیے گئے اور کس طرح اس کو مسخ کیا گیا- نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیاسات و توہمات اصل مذہب قرار دئے جاتے ہیں اور صرف عجوبہ پرستی ہی سے اس کا وقار قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے- چنانچہ مذہب اسلام پر ایک ایسا ہی زمانہ گزر چکا ہے جب چاروں طرف کا خار و خس لا لا کر اس چشمہ میں ڈالا گیا- یہاں تک کہ شفاف پانی کی سطح نظروں سے چھپ گئی اور لوگوں نے اس کی گندگی کو اصل مذہب قرار دے لیا-"

"اس تمہید کے بعد وہ "طلسم ہوشربا" قسم کی داستان یوں بیان کرتے ہیں:

"کوہ قاف کے لیے روایت ہے کہ یہ ایک پہاڑ ہے جو تمام روئے زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے- میں نے احاطہ کا لفظ صحیح استعمال نہیں کیا کیونکہ قدیم عبرانیوں اور یونانیوں کی طرح اہل عرب بھی زمین کو چپٹا باور کرتے تھے- مدعا یہ کہ کوہ قاف زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چاروں طرف چلا گیا ہے لیکن اس کے اور زمین کے درمیان ایک ایسا زبردست حلقہ تاریکی کا ہے جس کو انسان عبور نہیں کر سکتا اور اگر عبور کرے بھی تو کم از کم چار مہینے درکار(1) ہوں- بعض روایات کی رو سے یہ حلقہ محض تاریکی کا نہیں ہے بلکہ نہایت ہی متعفن و تاریک پانی کا ہے جس کے ساحل ناپید ہیں— اس کا نام بحرالمحیط یا اوقیانوس ہے(2)

کہا جاتا ہے کہ کوہ قاف تمام زمین کو مع اس کے سمندروں کے اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہے جیسے انگوٹھی انگلی کا احاطہ کر لیتی ہے— قزوینی اور ابن الوردی کا بیان ہے کہ کوہ قاف زمرد سبز کا ہے اور آسمان نیلگوں نظر آتا ہے اسی کے عکس کی وجہ سے ہے-

بعض کی تحقیق یہ ہے کہ وہ چٹان جس پر پہاڑ قائم ہے زمرد کی ہے- اس چٹان کو وتد (3) کہتے ہیں کیونکہ خدا نے اسی کے ذریعہ سے زمین کو تھام رکھا ہے-

طبری کا بیان ہے کہ اگر کوہ قاف زمین کو تھامے نہ ہوتا تو زمین ہر وقت لرزش میں رہتی

اور کوئی شخص اس پر سکونت نہ کر سکتا۔ قزوینی کا بیان ہے کہ زمین پہلے ہر وقت ہلتی ڈولتی رہتی تھی اس لیے خدا نے ایک فرشتہ پیدا کیا جس نے اسے اپنے شانوں پر رکھ کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ فرشتہ ایک مربع قطعہ یاقوت غفرانی پر کھڑا ہے جسے ایک بڑا بیل سینگوں پر سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بیل ایک مچھلی کی پشت پر قائم ہے جو پانی پر تیرتی رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کوہ قاف دنیا کے تمام پہاڑوں کی بیخ و بن ہے اور سب پہاڑ اندر ہی اندر آ کر اس سے مل گئے ہیں اور جب خدا کسی قطعہ زمین کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اندرونی سلسلہ کوہ کو جنبش میں لے آتا ہے جس سے زلزلہ پیدا ہو کر لوگ مر جاتے ہیں۔ بعض نے زلزلہ کی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ بیل جو زمین کو سنبھالے ہوئے ہے کبھی کبھی کانپ اٹھتا ہے اور اس کی کپکپی سے زمین بھی تھرا اٹھتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوہ قاف زمین کی انتہائی حد ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہے لیکن ابن الوردی کا بیان ہے کہ ماوراء قاف سے دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے اس کی زمین چاندی کی ہے اور فرشتے یہاں قیام رکھتے ہیں۔ ایک حدیث نبوی کی بنا پر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ماوراء قاف اور بہت سی زمینیں ہیں۔ ایک زمین سونے کی ہے، ستر زمینیں چاندی کی ہیں، سات مشک کی ہیں اور ہر زمین دس ہزار دن کی مسافت کی ہے۔ جہاں فرشتے ہی فرشتے رہتے ہیں۔

آپ نے کرۂ ارض کی حقیقت، کوہ قاف کی اصلیت اور زلزلہ کی ماہیت سن لی جسے ہمارے یہاں کے مورخین و محققین بیان کرتے ہیں اور جس کے ثبوت میں قرآن کی آیات و احادیث نبوی پیش کی جاتی ہیں۔ اچھا اب غور کیجئے کہ اس سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

ہر وہ شخص جو مسلمان ہو یا مسلمان رہنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ان باتوں پر ایمان لائے کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اکابر اسلام کی تحقیق ہے اور تحقیق بھی وہ جس کی بنیاد قرآن و احادیث پر قائم ہے۔

1- ان باتوں سے انکار کرنا گویا قرآن و احادیث سے انکار کرنا ہے اور قرآن و احادیث کا منکر کافر ہے۔

2- اگر آج کوئی شخص کہے کہ یہ تمام روایتیں بالکل لغو و مہمل ہیں نہ قرآن سے ان کا ثبوت مل سکتا ہے نہ احادیث سے تو فوراً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا ہمارے یہاں کے اکابر جو سب سے بہتر نقاد قرآن و حدیث کے تھے تمہارے برابر بھی عقل نہ رکھتے تھے اور کیا انہوں نے بغیر غور و تحقیق کے یوں ہی اس قسم کی احادیث کو صحیح باور کر

لیا تھا۔

3- ایک شخص کے سامنے جب اسلام پیش کیا جاتا ہے تب معہ ان تمام روایات کے پیش کیا جاتا ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں اور یہ کہہ کر کہ اب مزید تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اسلام اور اسلامی لٹریچر کے سمجھنے والے اب موجود نہیں ہیں اور ہم آپ کو آنکھ بند کر کے ان کی تحقیق پر عمل کرنا چاہیے۔

4- مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی مذہبی روایات میں دیگر مذاہب کے خرافات (میتھالوجی) نہیں پائے جاتے' لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا علم الاصنام کسی اور چیز کا نام ہے' کیا خرافات' ان روایتوں سے علیحدہ کوئی اور چیز ہو سکتی ہے اور کیا مسلمانوں میں جو اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں وہ واقعی دوسرے مذاہب خرافات سے استعارہ نہیں کی گئی ہیں۔

آیئے اب اسی کوہ قاف کی روایت پر غور کیجئے کہ ان کا اصل ماخذ کیا ہے۔

قدیم ایران کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ البرز جسے قدیم پہلوی زبان میں برابرزائتی (یعنی اونچا پہاڑ) کہتے تھے' بالکل اسی قسم کی روایات اپنے سے متعلق رکھتا تھا اور قدیم یونانیوں کے کوہ اولمپس کی طرح اسے بھی خداؤں یا دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا تھا۔

اس پہاڑ کے متعلق اوستا لٹریچر میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زمین کے تمام پہاڑوں کی بنیاد ہے جو زمین کے اندر ہی اندر اس سے نکل کر پھیل گئے ہیں۔ اسی پہاڑ میں ایک جھیل در وکشا بھی پائی جاتی ہے۔ اس پہاڑ کا دوسرا نام قاف بھی ہے۔ صاحب معجم البلدان نے بھی کہا ہے کہ قاف کو پہلے البرز کہتے تھے۔ ہندوؤں کے پران میں بھی ایک ایسے پہاڑ کا ذکر موجود ہے جس کا نام لوکا لوگ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پہاڑ اس دنیا کو اس دنیا سے علیحدہ کرتا ہے اور اس کی دوسری طرف سوا تاریکی کے کچھ نہیں ہے۔ چینی مذہب والوں کی روایات میں بھی ایک پہاڑ مانو سوز ایسا پایا جاتا ہے جو انسانی آبادی کی آخری حد سمجھا جاتا ہے۔

مند اپنی قوم میں بھی ایک روایت پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا سمجھتے تھے اور تین طرف پانی سے گھرا ہوا باور کرتے تھے شمال کی طرف وہ ایک ایسے پہاڑ کا وجود مانتے تھے جو زمرد کا بنا ہوا تھا اور جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا تھا۔

الغرض تمام مشرقی قوموں میں شمال کی طرف ایک پہاڑ کا پایا جانا باور کیا جاتا تھا اور غالباً

یہ خیال اہل بابل سے لیا گیا تھا۔ قدیم عبرانی میں بھی قریب قریب اسی قسم کی روایتیں رائج تھیں جیسا کہ توریت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ کوہ قاف وہی ہے جسے ایرانی البرز کہتے تھے اور جو روایت اس کے متعلق ان کے یہاں پائی جاتی تھیں وہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیں۔ اور متعدد حدیثیں رسول اللہ سے ایسی منسوب کر دیں جن سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہے لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اور مذاہب کی تو تمام روایات خرافات میں شامل کی جائیں گی لیکن اپنی روایات کو بالکل صحیح بتایا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ نے ایسا بیان کیا ہے پھر اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے کوہ قاف کو انہیں خصوصیات کے ساتھ تسلیم کیا جائے جو احادیث میں پائی جاتی ہیں یا ان سے انکار کر کے کافر و مرتد بننا گوارا کیا جائے۔

اب رہا یہ امر کا لفظ ق جو قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کے سمجھانے کے لیے یہ تمام روایتیں گھڑی گئی ہیں کیا مفہوم رکھتا ہے غالباً ہمارے موضوع سے علیحدہ ہے اور اس کے سمجھنے کے لیے یہ لازم نہیں کہ ایک شخص ان تمام روایتوں پر ایمان لائے۔

اب ہم جبرائیل یا ملک الموت کی حقیقت پر اکابر اسلام کی تحقیق پیش کرتے ہیں جو کوہ قاف کی تحقیق سے کم حیرت انگیز نہیں۔

(1) عزرائیل اتنا چوڑا چکلا اور اتنا زبردست فرشتہ ہے کہ اگر دنیا کے تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی اس کے سر پر ڈالا جائے تو ایک قطرہ بھی زمین تک نہ پہنچے۔ اس کا نورانی تخت چوتھے یا ساتویں آسمان پر ہے جہاں اس کا ایک پاؤں نکا ہوا ہے اور دوسرا پاؤں اس پل پر ہے جو دوزخ اور بہشت کے درمیان بنایا گیا ہے۔ اس کے ستر ہزار پاؤں ہیں۔

(2) اول اول عزرائیل بھی دوسرے فرشتوں کی طرح تھا لیکن جب اللہ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے جبرائیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور زمین سے ایک مٹھی عناصر ان اجزاء کے لے آؤ جن سے انسان کی تعمیر ہو سکے لیکن جب جبرائیل زمین پر پہنچے تو ابلیس مانع آیا اور جبرائیل ناکام آئے، اس کے بعد میکائیل اور اسرائیل بھیجے گئے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ آخر میں عزرائیل کو بھیجا گیا اور یہ کامیاب واپس آیا اور اللہ نے اس کو فرشتہ موت بنا دیا کیونکہ اس میں رحم کی کمی تھی۔

(3) جب اللہ نے موت کو پیدا کیا تو فرشتوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی طرف دیکھو لیکن جب انہوں نے اس کی غیر معمولی قوت کو دیکھا تو حیران رہ گئے اور بے ہوش ہو کر

زمین پر ہزاروں سال تک گرے ہوئے پڑے رہے اس کے بعد جب انہیں ہوش آیا تو ایک زبان ہو کر بولے کہ "بے شک موت بڑی زبردست تخلیق ہے" خدا نے یہ سن کر فرمایا کہ "میں نے عزرائیل کو اس پر قابو دے دیا ہے۔"

(4) جبرائیل کے پاس تمام انسانوں کی فہرست موجود رہتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں رہتا کہ کب کس کی موت آئے گی' وہ لوگ جو نجات پانے والے ہیں ان کے نام کے گرد ایک نورانی حلقہ ہوتا ہے اور جو دوزخی ہیں ان کے نام کے گرد سیاہ حلقہ ہوتا ہے۔

(5) جب موت کا دن آتا ہے تو اللہ اس درخت سے جو عرش کے نیچے ہے ایک پتہ توڑ کر گرا دیتا ہے جس پر مرنے والے کا نام منقوش ہوتا ہے اور یہ پتہ جبرائیل کے آغوش میں آکر گرتا ہے اور یہ نام پڑھ لیتا ہے اور 40 دن کے بعد روح نکال لیتا ہے۔

(6) مرنے والوں میں بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو جبرائیل کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ عزرائیل نہایت سختی سے جان نکالتا ہے۔ جبرائیل اس مقابلہ کو دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور سارا حال بیان کرتا ہے' خدا یہ سن کر فردوس کا ایک سیب اس کو دیتا ہے جس پر بسم اللہ لکھی ہوتی ہے عزرائیل یہ سیب لے کر اس جھگڑالو مرنے والے کو سنگھا دیتا ہے اور وہ فوراً جان دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے لیکن یہ عمل صرف نیک بندوں کے لیے جائز رکھا گیا ہے۔ کافروں کی جان چاہے کیسی ہی سختی سے نکلے پروا نہیں ہوتی۔

(7) بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب عزرائیل روح نکالنے کے لیے حلق کے اندر جانا چاہتا ہے تو بندہ کسی ذکر کے ذریعہ سے حلق کے اندر جانے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ فرشتہ موت یہ دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور تمام حال عرض کرتا ہے' وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اس کے ہاتھ دیکھو اگر اس نے اپنی عمر میں صدقہ دیا ہے تو بھی جان نکالنا دشوار ہوتا ہے اور پھر جبرائیل اس کے ہاتھ پر اللہ کا نام لکھ دیتا ہے اور فرشتہ اندر گھس کر روح نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

(8) جب کسی مسلمان یا مومن کی روح نکالی جاتی ہے تو ملک الموت نہایت نرمی و آہستگی سے کام لیتا ہے اور روح نکال کر اپنے نائب فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے جو اسے حلہ بہشتی میں لپیٹ کر آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے عرش خداوندی تک پہنچتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ اس روح کو اس قبر میں لے جاؤ جہاں وہ دفن کیا گیا ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم کافر مرنے والا ہوتا ہے تو اس کی روح نہایت سختی و بے رحمی

سے نکالی جاتی ہے اور جب آسمان کے دروازے اس کے لیے نہیں کھلتے تو فرشتہ اسے وہیں زمین کی طرف پھینک دیتا ہے۔

(9) ادریس، الیاس، عیسیٰ اور خضر موت سے آشنا نہیں ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ موسیٰ کے پاس جب ملک الموت آیا تو انہوں نے ایک تھپڑ مارا جس سے اس کی آنکھ مجروح ہو گئی، جب فرشتہ شکایت لے کر خدا کے پاس آیا تو خدا نے بہشت کا سیب اس کو دیا اور اس کو سونگھ کر وہ جان دینے پر راضی ہو گئے۔

(10) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی جان نکالنے والا فرشتہ اور ہوتا ہے اور دوسرے آدمیوں کی روح نکالنے والا کوئی اور فرشتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مومن و کافر کی جان نکالنے کے لیے علیحدہ علیحدہ فرشتہ ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے اکابر اسلام کی تحقیق فرشتہ موت کے متعلق جو حسب ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہے:

مشکوۃ شریف (حدیث)۔ بخاری شریف (حدیث)_ مروج الذہب (المسعودی) درالفاخرہ (الغزالی) عجائب الملکوت (الکسائی) تاریخ طبری، تاریخ ابن اثیر، تاریخ الخمیس، (دیار بکری) قصص الانبیاء (ثعلبی) کتاب الانس الجلیل (مجید الدین حنبلی) کتاب البلد و تاریخ (طاہر مقدسی)(4)

تماشہ یہ ہے کہ یہ تمام بیانات رسول اللہ سے منسوب کیے جاتے ہیں اور کسی کا خیال اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ سب باتیں بعد کی گھڑی ہوئی ہیں اور رسول اللہ سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔

ملک الموت کے متعلق اس طرح کی حیرت انگیز روایات یہود میں رائج چلی آرہی تھیں کہ اس کے چار ہزار بازو ہیں۔ اس کے جسم میں زبان اور آنکھ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یعنی جتنے آدمی ہیں اتنی ہی آنکھیں اور زبانیں اس کے جسم میں بھی ہیں۔ اس کے چار چہرے ہیں وغیرہ وغیرہ اور بعد کو مسلمانوں نے انہیں روایات پر اعتماد کر کے اپنے یہاں لے لیا اور لوگوں کو یقین دلانے کے لیے رسول سے منسوب کر دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانے میں بھی ان روایات پر یقین کیا جا سکتا ہے اور کیا ادنیٰ فہم و عقل کا انسان بھی کبھی باور کر سکتا ہے کہ روح نکالنے کے لئے یہ تمام لا یعنی حرکتیں کی جاتی ہیں۔

پھر افسوس ہے ہمارے علماء کرام پر جو اب بھی مواعظ میں اس طرح کی روایتیں بیان

کرتے ہیں اور صد ہزار افسوس ہے۔ ان کی جسارت بیجا۔

یہ اقتباس خاصہ طویل ہو گیا لیکن یہ اس امر کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مذہب کے نام پر خلاف عقل، خلاف واقعہ، خلاف مشاہدہ اور خلاف منطق سب کچھ نہ صرف تسلیم کر لیا جاتا ہے بلکہ کچھ عرصہ بعد یہ سب مذہبی روایات کی صورت اختیار کر کے بعض عقاید کے لیے بنیادی حیثیت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان نام نہاد مذہبی روایات سے جس اساطیر کی تشکیل ہوتی ہے اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی اور اسی تناظر میں علامہ اقبال کے اس شعر کے درست معانی سمجھ میں آ سکتے ہیں:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

"صدا بصحرا:"

"ہر جماعت کی نظم و ترتیب اور اصلاح کے لیے ایک رئیس کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم نے اپنے بھائیوں کی جماعت کے لئے اپنا رئیس عقل کو مقرر کیا ہے"

مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر چوتھی صدی ہجری تک عقل کے خوف، ذہنی بنجرپن اور علوم کی پسماندگی نے جہاں عمومی طور پر مسلم دانشوروں، صاحبان علم اور علماء و فضلاء کو محض روایت پرست اور ماضی کا مقلد بنائے رکھا تھا وہاں محدود اقلیت میں ایسے دانش ور بھی تھے جنہوں نے سائنس، فلسفہ، منطق اور ان کی پیدا کردہ نئی سوچ سے خوفزدہ ہو جانے کے بر عکس فروغ علم اور خرد افروزی کے لیے خفیہ سلسلہ تالیفات شروع کیا جو اب رسائل "اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہیں ان کی تعداد 52- 51- 50 تسلیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ ان رسائل کے مولفین نے فساد خلق کے باعث اپنے نام خفیہ رکھنے کی کوشش کی تاہم محققین ابو سلیمان محمد بن معشر، ابو احمد الطہر جانی عونی، المقدس، ابوالحسن علی بن ہارون زنجانی اور زید بن رفاعہ کے اسماء کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن ان رسائل کے مباحث کے علمی تنوع کی بنا پر یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ مزید اہل قلم بھی شامل تالیف رہے ہوں گے مگر اب ان کے اسماء ہمیشہ کے لیے مخفی ہی رہیں گے شاید اسی لیے بعد میں ان رسائل کے مولفین کے بارے میں پر اسرار روایات مشہور ہو گئیں جیسے یہ حضرت علی کے کسی امام / کسی شیعہ عالم / کسی اسماعیلی / کسی معتزلہ / کسی بے دین کی تالیف ہیں۔

یہ رسائل آج کی اصطلاح میں دنیا میں انسائیکلوپیڈیا کی اولین اور قدیم ترین صورت قرار دیئے جا سکتے ہیں اور یورپ کے محققین اور مستشرقین نے ان کا اسی حیثیت میں تحقیقی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ یوں دیکھیں تو دسویں صدی عیسوی کے ان گمنام مولفین کے رسائل کی آج بھی اہمیت ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ 373ھ/983ء میں تالیف کیے گئے ان تمام رسائل کا خلاصہ "الجامعہ" کے نام سے ایک جلد میں مدون کیا گیا اور پھر اس کی تلخیص "الجامعۃ الجامعہ" کے نام سے بھی کی گئی جو انسائیکلو پیڈیا کی جدید تکنیک کے عین مطابق ہے۔ اردو دائرہ معارف (جامعہ پنجاب) اور ڈاکٹر آغا افتخار حسین کی "قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ" میں درج کوائف سے "اخوان الصفا" کے بارے میں مختصراً درج ہے۔

اخوان الصفا اختصار ہے اس طویل نام کا: اخوان الصفاء و خلان الوفاء و اہل العدل و ابناء الحمد"

اخوان الصفا کی فکری اساس فلسفہ، سائنس، عقل، منطق اور تحقیق پر استوار تھی بلکہ یوں سمجھئے کہ عقلیت پر مبنی سائنسی سوچ کا ظہور ان ہی رسائل میں نظر آتا ہے۔ آغاز میں درج اور یہ اقتباس ایک طرح سے ان کی علمی مساعی کا منشور قرار پاتا ہے:

"شریعت اسلامی جہالت اور گمراہی سے آلودہ ہو گئی ہے اور اس کی صفائی صرف فلسفہ ہی سے ممکن ہے کیونکہ فلسفہ، حکمت اعتقادیہ اور مصلحت اجتہادیہ پر حاوی ہے اور جس وقت فلسفۂ یونان اور شریعت محمدی میں امتزاج پیدا ہو جائے گا تو اس وقت (علم اور قوم کو) کمال حاصل ہو جائے گا"

ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے رسائل کے موضوعات کی جو فہرست دی ہے اسی سے علمی مطالعہ کے تنوع اور وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ریاضی (علم الاعداد، جیومیٹری، فلکیات، جغرافیہ، موسیقی، نظری اور علمی فنون، اخلاقیات)
طبعیات (حقیقت مادہ، شکل، حرکت زمان و مکان، آسمان، معدنیات، حقیقت فطرت، نباتات، حیوانات، جسم انسانی، حواس، زندگی اور موت، لذت اور اذیت، لسانیات)
مابعد الطبعیات (نفسیاتی عقلیت، دینیات، نفس، محبت، حیات بعد ممات، علت و معلول، ایمان، قانون ایزدی، نبوت، تشکیل کائنات اور جادو وغیرہ) (ص: 141)

یہ عقل پسند مولفین بعض امور میں تو ڈارون اور آئن شائن کے پیش رو قرار پاتے ہیں کہ ڈارون سے ہزار برس قبل وہ یہ لکھ رہے تھے:

"ارتقا میں حیوانات کی آخری منزل اور انسان کی پہلی منزل "قرد" (بندر) ہے جو صورت و عمل کے اعتبار سے انسان سے مشابہت رکھتا ہے"

انہوں نے وقت کے قطعی اور مطلق تصور کو مسترد کرتے ہوئے یہ لکھا:

"وقت کی کوئی خارجی حقیقت نہیں ہے ہمیں وقت گزرتا ہوا صرف اس صورت میں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے آس پاس کوئی چیز حرکت میں ہو... ہم جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں وہ صرف اشیاء کی حرکت ہے وقت کوئی چیز نہیں۔"

واضح رہے کہ اس نکتہ کی تشریح آئن شائن نے ریل گاڑی میں سفر کی مثال سے کی تھی کہ ہم خود حالت سکون میں ہوتے ہیں مگر خارج میں بھاگتی اشیاء کی وجہ سے ہم خود کو بھی حرکت میں محسوس کرتے ہیں۔

اخوان الصفا کے بارے میں اور بھی کئی دلچسپ باتیں ملتی ہیں مثلاً وزن کے سلسلے میں انہوں نے نیوٹن سے پہلے کشش اجسام کی بات کی اور اس کے منطقی نتیجہ کو بے وزنی سے واضح کیا۔۔۔ عشق کو انہوں نے مالیخولیا قرار دیا۔ اسی طرح جدید نفسیات دانوں سے صدیوں پہلے انہوں نے انسانی شخصیت کی اساس قلب کی بجائے ذہن پر استوار کرتے ہوئے بالواسطہ طور پر اعصابی کارکردگی کی طرف اشارہ کیا۔

الغرض! اخوان الصفا کے زاویہ نگاہ کی اساس عقل پر استوار تھی۔۔۔ وہ عقل جو فلسفہ کو فکر، منطق کو اساس اور سائنس کو تجربہ کا اہل بناتی ہے۔ یہ سرتاپا عقلیت کے داعی تھے اس حد تک کہ "ان کے نظریے کے مطابق ذات باری کی سب سے پہلی تخلیق عقل ہی ہے جو ابتدائے آفرینش سے تا ابد قائم رہے گی، عقل کا وجود اور اس کی ابدیت ذات باری کا اہم ترین عطیہ ہے، روح، عصر اور مادہ بھی عقل ہی سے تخلیق ہوئے، اس طرح کائنات کی تخلیق کا منبع بھی عقل ہے جو ذات باری کی محکوم ہے کسی اور ہستی کی محکوم نہیں" (ایضاً ص: 142)۔۔۔ اس اقتباس کی آخری سطروں سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خدا اور دین سے منکر نہ تھی بلکہ عقل کے ذریعہ سے ان کے اثبات کے داعی تھے۔

اگرچہ مشرق میں یہ رسائل بالعموم غیر ممنوعہ ہی رہے مگر مغرب میں ان پر خاصی ریسرچ کی گئی اور لندن (1861ء) اور جرمنی (1886ء) سے شائع کیے گئے۔

مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو "اخوان الصفا۔ ایک تحقیقی مطالعہ" از سید شبیر حسین شاہ زاہد مطبوعہ "المعارف" (لاہور مئی جون 1993ء)

"کافر تر است زاہد..."

کون چھینے بت کو توڑے برہمن کے دل کو کون
اینٹ کی خاطر کوئی کافر ہی مسجد ڈھائے گا
(آتش)

صوفیائے کرام کی صورت میں ایک طبقہ ایسا بھی ملتا ہے جس نے خود کو شعوری طور پر نقلی اور عقلی مباحث سے دور رکھتے ہوئے روحانی مسلک اختیار کر کے دل کی آنکھ سے خدا اور مظاہر کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کی۔ تصوف کے آغاز، ارتقا، افادیت اور عدم افادیت کے مباحث میں الجھے بغیر صرف اتنا اشارہ کیا جاتا ہے کہ اہل شریعت نے اہل طریقت کو ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا تو صوفیاء نے بھی بے لچک رویہ، منافقت، خشونت طبع، جاہ طلبی اور سطحیت کی بنا پر اہل شریعت کو کبھی پسند نہ کیا۔ صوفیاء نے خدا کو فلسفہ یا منطق سے سمجھنے کے بغیر اس سے محبت کی، ایسی محبت کہ اللہ کی ہستی میں خود کو سمو دینا ہی صوفی کی معراج قرار پائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہب، فلسفہ اور منطق کی تلخ ترین بحثوں کے متوازی صوفیاء اور شعراء نے جذباتی اور تخلیقی سطح پر اہل شریعت کے ساتھ محاذ آرائی جاری رکھی یوں کہ ملا، مولوی، شیخ، محتسب، واعظ، ناصح وغیرہ نے اپنے لغوی مفہوم سے بلند ہو کر علامتی حیثیت اختیار کر لی۔ پہلے فارسی میں پھر اردو میں اور ان کے پہلو بہ پہلو پنجابی، سرائیکی، سندھی وغیرہ میں بھی۔

فارسی سے چند مثالیں پیش ہیں حافظ شیرازی کے بموجب:

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست
نان حلال شیخ ز آب حرام ما
بادہ نوشی کہ درو روی و ریای نبود
بہتر از زہد فروشی کہ درد روی و ریاست
فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوی داد
کہ می حرام ولی بہ زمال اوقاف است
حافظا می خور و رندی کن و خوش باش ولی
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

آتش زہد و ریا خرمن دیں خواہد سوخت
حافظ ایں خرقہ پشمینہ بینداز و برد
گرچہ بر واعظ شہر ایں سخن آساں نبود
تا ریا درزد و سالوس' مسلماں نبود

— عرفی کے خیال میں:

کافر تر است زاہد از برہمن ولیکن
او را بت است در سر' در آستیں ندارد

— خیام کی رباعی ملاحظہ کیجئے:

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتا "مستی
بگُسل ز کہ بکستی و چوں پیوستی"
زن گفت "چناں کہ می نمایم ہستم
تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟"

اے زاہد شہر! از تو پرکار تریم
با ایں ہمہ مستی ز تو ہشیار تریم
تو خون کساں خوری و ما خون رزاں
انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

ایسے اشعار کا نفسیاتی افادہ کیتھارسس میں مضمر ہے کہ شاعر کے ساتھ ساتھ قاری بھی ان سے خاص نوع کی نفسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ حضرت واعظ اور حضرت ناصح جن حضرات کی علامت ہیں ان کا منہ بند تو نہیں کر سکتے لہٰذا طنز سے کسی حد تک اعصابی تناؤ میں کمی کر سکتے ہیں کہ بقول میر:

مت ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو !
کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مست

حواشی:

1- ملاحظہ ہو طبری جس نے اس کے ثبوت میں رسول اللہ کی حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔
2- ملاحظہ ہو ابوا لفداء ا لقزوینی ابن الواردی
3- سورۃ نباء آیت 7، 8 **الم نجعل الارض مھادا" و الجبال او تادا"** (کیا ہم نے زمین کو برابر مسطح اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا)
4- قدیم یونانیوں کے یہاں بھی اس قسم کی روایت پائی جاتی ہے کہ اٹلس دیوتا زمین کو اپنے شانے پر لیے ہوئے ہے (حواشی از نیاز)

6- "بنیاد پرستی"

"آغاز:"

اگرچہ ہمارے ہاں بلکہ یوں سمجھئے کہ عالمی سطح پر بھی بنیاد پرستی کی اصطلاح کا آٹھویں دھائی میں زیادہ چرچا ہوا تاہم جہاں تک بنیاد پرستی کا تعلق ہے تو موجودہ صدی کے آغاز میں شمالی امریکہ میں اس کا باضابطہ آغاز /Bapitists /Presbytrians
Methodists/Disciples of Christ جیسے سبھی مسالک کی اس مساعی کی صورت میں ہوتا ہے جس کی رو سے مندرجہ ذیل امور کو لفظی و معنوی طور پر ہر عہد کے لیے ابدی صداقت قرار دے دیا گیا:

الف- بائبل الہامی ہے
ب- ہر عہد کے لیے ابدی صداقت کی حامل ہے
ج- عقیدۂ تثلیث
د- حضرت عیسیٰ کی بن باپ پیدائش
ر- تخلیق کائنات کا تصور بائبل درست ہے
س- سقوط آدم
ش- مصلوب ہو کر مسیح نے تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔
ص- مصلوب ہو جانے کے بعد حضرت عیسیٰ کی جسمانی حیات نو اور پھر آسمان کو پرواز
ک- مسیح کی آسمان سے زمین پر واپسی اور پھر ہزار برس تک دنیا پر حکمرانی
گ- موت کے بعد سچے عیسائیوں کی حیات نو اور پھر جسمانی وجود کے ساتھ آسمان پر جزا اور سزا حاصل کرنا

دراصل انیسویں صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے آغاز میں نئے علمی تصورات، سائنسی انکشافات اور فلسفیانہ افکار مسیحیت کے روایتی تصورات اور بائبل کے لیے بہت بڑا چیلنج ثابت ہو رہے تھے۔ تخلیق کائنات کا بائبل کا تصور متروک ہوا اور پھر ڈارون نے انسانی فضیلت اور اشرف المخلوق ہونے کے احساس تفاخر پر مبنی تصور کو دھچکہ پہنچایا چنانچہ

ان سب کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے تو Prophetic Conferences کی صورت میں بائبل کی ابدی حقانیت کا اثبات کیا گیا اور پھر اس سلسلہ کو مزید تقویت دینے کے لیے سالانہ بائبل کانفرنسیں کی جاتیں اور دینی تعلیم کے لیے بائبل سکول قائم کیے گئے۔ اور ان سب پر مستزاد مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے چرچ اور ایسے پادری جو آزاد خیال دانشوروں کو "بدعتی" (Heresy) قرار دینے میں مصروف رہتے۔ آزاد خیالی کی بدعتوں اور مسیحیت کے بنیادی عقاید کے تحفظ کے لیے 1915ء-1909ء تک رسالوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا جاتا رہا ان رسائل کا مشترک عنوان یہ تھا:

"The Fundamentals: A Testimony to the Truth"

بنیاد پرستی کے ضمن میں 1919ء کا سال سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس برس "World Christian Fundamental Association" کی تشکیل کی گئی جس نے آزاد خیال پادریوں کو چرچ سے خارج کیا اور ہر سطح پر نئے فلسفیانہ تصورات اور سائنسی انکشافات کے خلاف محاذ قائم کیا گیا اس حد تک کہ 1925ء میں ریاست ٹینسی کے سرکاری مدارس میں ڈارون کے نظریہ کی تعلیم ممنوع قرار دے کر ریاست ٹینسی کے ایک قصبہ Dayton کے سائنس ٹیچر پر اسی جرم میں مقدمہ چلایا گیا (یہ مقدمہ Scope's Case کے نام سے مشہور ہے) فاضل عدالت نے بنیاد پرستوں کے حق میں فیصلہ دیا۔

اس عہد کے بنیاد پرستوں کا یہ نعرہ تھا:

"Exorcism of Modernism and All Its Associated Demons"

("جدیدیت اور اس سے وابستہ شیاطین کا بھوت اتارنا") (1)

عیسائیوں کے ہاں اوریجنل سن (Original Sin) کے تصور کے باعث جہنم ضروری ہے جس میں گنہگار ڈالے جائیں گے اور اس لیے بھی کہ حضرت عیسیٰ نے صلیب قبول کر کے گنہگاروں کا کفارہ ادا کر دیا جبکہ حضرت عیسیٰ کا جسمانی طور پر ظہور ثانی بھی عیسائیت کے بنیادی عقاید میں شامل رہا ہے مگر اب مسیحی بھی ان کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ روزنامہ جنگ لاہور 2 دسمبر 1993ء میں ڈیلی ٹیلی "گراف" (لندن) کے حوالہ سے مطبوعہ خبر پیش ہے:

"لندن (پی اے) بشپ آف درہم ڈاکٹر ڈیوڈ جینکنز کے متنازع بیان پر پادریوں اور عیسائی حلقوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے ڈیلی ٹیلی گراف کے مطابق ڈاکٹر ڈیوڈ نے اینجلیکن کانفرنس میں دعویٰ کیا تھا جہنم میں دائمی عذاب نہیں ہو گا اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کا دوبارہ ظہور ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ کوئی دائمی دوزخ نہیں ہے کیونکہ ہمارا خدا اتنا ظالم نہیں ہو سکتا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے بخشش کا ہر موقع ضائع کر دیا ہے ان کے لیے نیستی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس بات پر یقین کر لینا ممکن نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہو گا یا دنیا ختم ہو جائے گی۔ ان کے خیالات پر ممتاز پادریوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے بشپ آف شفیلڈ ڈیوڈ مون نے کہا ہے کہ عیسائیت میں یہ بات ضروری نہیں کہ دوزخ کے طبعی عذاب پر یقین کر لیا جائے لیکن یہ بات کہنا بھی درست نہیں کہ دوزخ سرے سے ہے ہی نہیں۔ بشپ آف سوڈور نوئیل جونز نے ڈاکٹر ڈیوڈ پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے عیسائیت کے بنیادی عقاید کو جھٹلایا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا دوبارہ ظہور بنیادی عقیدہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر ڈیوڈ آئندہ سال ریٹائرڈ ہونے والے ہیں۔"

جہاں تک بنیاد پرستی کی اصطلاح سے پہلے اس سے وابستہ تصورات کا تعلق ہے تو اردو میں اس مقصد کے لیے راسخ العقیدہ، راسخ الاعتقاد، ماضی پرستی، قدامت پرستی، کٹر مذہبیت، عقیدہ پرستی، بے لچک مذہب پرستی، مذہبی جنون، غیر عقلی مذہبیت، رجعت پرستی، روایت پرستی اور مقبول عام ملائیت جیسے الفاظ مستعمل رہے ہیں۔ علمی کتابوں میں زیادہ تر راسخ الاعتقادیت یا راسخ العقیدگی استعمال ہوتی رہی ہیں۔

"جمادات کی طرح:"

بنیاد پرست بنیادی طور پر خوفزدہ انسان بلکہ کئی امور کے لحاظ سے تو "Paranoid" بھی ہوتا ہے۔ اسے ہر دم عقیدہ کی بنیادیں ڈانوا ڈول نظر آتی ہیں، بنیادیں کس سے ڈانوا ڈول نظر آتی ہیں؟ فلسفہ، منطق اور سائنس پر مبنی تصورات اور انکشافات سے۔ قدیم زمانہ میں مذہب کو کسی نئے مذہب سے خطرہ لاحق ہوتا تھا چنانچہ ہر ممکن طریقہ سے اپنے مذہب، مسلک، عقیدہ کا دفاع کیا جاتا اور تعزیرات رکھی جاتیں بلکہ عبرت کے لیے بعض اوقات تو مذہبی تعزیرات عوامی روپ اختیار کر لیتیں، تمام مذاہب اس نوع کی مثالیں پیش کرتے ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے صحابہ پر اہل مکہ نے جو مظالم روا رکھے ان کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے وہ درست تھے کہ ان کے باپ دادا کے عقاید کی تکذیب ہو رہی تھی لہٰذا اپنے خداؤں (ہمارے لیے جھوٹے بت) کے تحفظ میں ابوجہل (اصل نام: عمرو بن ہشام) ابو لہب (اصل نام: عبد العزیٰ) اور راہ رسول میں خار مغیلاں بکھیرنے والی اس کی اہلیہ جمیلہ (ام جمیل)۔ آج کی اصطلاح میں بنیاد پرست کہے جا سکتے ہیں کہ وہ کٹر ماضی

پرستی اور بے جواز مخالفت کی بنا پر الہامی دین اسلام کی صداقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہے اور یہی ہر عہد کے بنیاد پرست کا المیہ ہے کہ وہ "قدیم" سے اپنی کنڈیشننگ کے باعث "جدید" کو ہمیشہ مشکوک، غلط اور گمراہی ہی سمجھتا ہے اور بیشتر امور ــ بالخصوص عقلی امور میں یہی اس کی ناکامی کا باعث بنتا ہے بقول جسٹس دین محمد ہمایوں:

اٹھو! وگرنہ حشر ہو گا نہ پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح
اک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا

یوں دیکھیں تو موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون، حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرنے والے یہودی، جادوگرنیوں کو زندہ جلانے والے پادری، منصور حلاج کا مثلہ اور سرمد کو قتل کرنے والے، سقراط کو زہر پلانے والے اور بابری مسجد گرا کر رام مندر تعمیر کرنے والے ــ سبھی بنیاد پرست قرار پاتے ہیں۔ نام اور مقام میں فرق ہو سکتا ہے کام میں نہیں کہ بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانہ میں!

"اپنے خدا سے غداری:"

مذہبی بنیاد پرستی اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود مذہب چنانچہ اولڈسٹ پروفیشن کی مانند اسے بھی Oldest Creed قرار دیا جا سکتا ہے۔

تاہم خدا بمقابلہ خدا، مذہب بمقابلہ مذہب، عقیدہ بمقابلہ عقیدہ، روایت بمقابلہ روایت، اور مسلمات بمقابلہ مسلمات کی صورت میں صرف ایک محاذ تھا۔ مختلف خدا/ مذہب/ عقیدہ / روایت/ مسلمات کا خاتمہ کر دو، اپنا خدا / مذہب/ عقیدہ/ روایت/ مسلمات محفوظ رہیں گے یعنی یہ تحفظ ہی منفی پر استوار تھا۔ مخالف عقیدہ اور برعکس تصور کے خاتمہ میں اپنے عقیدہ اور تصور کی بقا نظر آتی تھی لیکن عقل، علوم، فلسفہ، منطق اور سائنس کے تصورات، نظریات، شواہد، حقائق، کوائف اور ایجادات کی صورت میں بنیاد پرستی کو متعدد محاذوں پر جنگ آزما ہونا پڑا اور یہ ایسی جنگ تھی جس میں شکست بنیاد پرستی کا مقدر تھی کہ اب وہ زمانے لد گئے تھے جب کافر، بدعتی اور جادوگر قرار دے کر گردن ماری جا سکتی تھی کتنے گلیلیوں کی زبان بندی کرتے۔

مذہب جب ایک مرتبہ منظم ہو جائے تو پھر تصور خدا، اساسی عقاید، مذہبی رسوم اور

اخلاقی اقدار کی صورت میں بلا ترمیم و تنسیخ صورت دوام پا لیتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ بدلتے مذہبی معیارات کے باعث وہ مذہب کے برعکس محض نظریہ ضرورت بن کر رہ جائے گا۔ اس لئے حقائق و واقعات مذہب کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی صداقت طے کی جاتی ہے نہ کہ برعکس!

اینٹ پر اینٹ رکھ کر بڑی احتیاط اور مضبوطی سے دیوار چنی جاتی ہے۔ ایک بھی روزن دیوار' دیوار کی کمزوری کا باعث بن سکتا ہے اسی لیے ہر قیمت پر مذہب اور بنیادی عقاید کا تحفظ کیا جاتا ہے جان لے کر بھی اور جان دے کر بھی!

مذہبی شخص کی نفسیات میں بنیاد پرستی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی شخصیت کے مخصوص نفسیاتی تقاضوں کی بنا پر ہر قیمت پر مذہب کا دفاع لازم ہے جبکہ ایسا نہ کرنا اپنے خدا سے غداری اور اپنے مذہب سے روگردانی کے مترادف ہو گا۔ ہمیں اس کا عمل یا رد عمل نہ بھائے مگر ہم اس کے خلوص نیت پر شبہ نہیں کر سکتے لیکن ـــ اور یہ "لیکن" بہت بڑی ہے خرابی اس وقت شروع ہوتی ہے جب دوسرے نقطۂ نظر کو جانچے اور پرکھے بغیر محض اس لیے مسترد کر دیا جاتا ہے کہ میرے نقطۂ نظر سے متصادم ہونے کے باعث یہ غلط ہے لہٰذا اس کے اظہار کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس سے میرے نقطۂ نظر کو ضعف پہنچے گا میں نے نقطۂ نظر جیسا معتدل لفظ استعمال کیا ہے اس کی جگہ دیوتا' مذہب' مسلک' عقیدہ' تصور زیست' نظریہ حیات ـــ کچھ بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اس رویہ کی اساس استخراجی منطق بنتی ہے کہ پہلے سے حق تسلیم کی گئی بات سے نتائج کا استخراج ہوتا ہے ـــ بنیاد پرست اپنے نقطۂ نظر کو حق مانے۔ یہ اس کا حق ہے مگر جب وہ دوسرے کو یہ حق نہیں دیتا تو یہ منفی عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ منفعیت جب شخصیت کا جزو عظیم بن جاتی ہے تو اس کے وسیع کل میں اثبات کے دیگر پہلو بھی ڈوب جاتے ہیں اور یہی باعث خرابی ہوتا ہے۔ ایک بنیاد پرست کے برعکس والٹیر جیسا دھریہ یہ بات کہنے کا ظرف رکھتا ہے کہ اگرچہ میں تمہاری بات سے متفق نہیں مگر یہ بات کہنے کا حق دلانے کی خاطر میں اپنی جان تک بھی دے سکتا ہوں ـــ مخالف نقطۂ نظر کے لیے اگر یہ احترام روا رکھا جائے تو معاشرے کے لاتعداد ایسے مسائل' جھگڑے اور تنازعے ختم ہو جائیں جو اپنی اصل میں بے بنیاد ہوتے ہوئے بھی انسانی تعلقات کے لیے سرطان کا کام کر رہے ہیں۔

"جہالت مسلک فکر:"

ہمارے ہاں جہالت نے جو ایک مسلک فکر اور طرز حیات کی صورت اختیار کر لی ہے تو

اس کا بنیادی سبب بھی اسی استخراجی منطق کے پیدا کردہ فکری رویوں اور ان سے جنم لینے والے کرداری سانچوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ہم مشرقیوں کی بالعموم اور مسلمانوں کی بالخصوص ذہنی پسماندگی اور تخلیقی بنجرپن کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ہم آئین نو سے ڈرتے اور طرز کہن پر اڑتے ہیں۔ "پدرم سلطان بود" روایات اور مسلمات اس جہالت کو مزید تقویت دیتے ہیں اور اب حال یہ ہو رہا ہے کہ فکری کجی کے کنوئیں سے باہر نکلنا محال ہو چکا ہے۔ ذہنی لحاظ سے ہم چمگادڑوں میں تبدیل ہو چکے ہیں کہ اپنی تاریک دنیا کی تاریک پرچھائیوں ہی کو چاند سورج سمجھتے ہیں جس کے نتیجہ میں اندھیرے کی خوگر آنکھیں علم کی روشنی میں اندھی ہو جاتی ہیں حالانکہ اصل رویہ فیض کے بقول یہ ہوتا:

کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

"برصغیر میں بنیاد پرستی:"

جہاں تک برصغیر میں بنیاد پرستی کا تعلق ہے تو شاید پہلی مسلم حکومت کے قیام کے ساتھ ہی اس آغاز ہو گیا ہو گا۔ اچھے، برے، روشن خیال، تنگ نظر، مدبر اور غیر مدبر بادشاہوں کے لحاظ سے اگرچہ صورت حال میں تغیرات آتے رہتے ہوں گے تاہم مذہبی شخصیات میں سے کم از کم ایک طبقہ ایسا ضرور رہا ہے جو غیر مسلموں کو کافر سمجھ کر ان سے وہی سلوک روا رکھنے کا قائل تھا جو کفار کے ساتھ روا رکھا جانا چاہیے۔ اگرچہ اس انداز سے بالعموم معاصر تواریخ میں زیادہ مواد نہیں ملتا یعنی اسلامی عقاید اور ہندو دھرم کے درمیان اگر کوئی چپقلش تھی تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ ان دونوں مذاہب میں بنیادی نوعیت کے اتنے اختلافات ہیں کہ تصادم ناگزیر تھا صرف گاؤ کشی ہی کو لے لیں جو ہمیشہ سے باعث نزاع رہی ہے۔ البتہ صوفیاء ان جھگڑوں سے لاتعلق رہ کر درس محبت دیتے رہے اور ان ہی کی میٹھی شخصیت کے زیر اثر لوگ مسلمان ہوتے گئے ادھر بادشاہوں نے حکومت چلانی تھی اور وہ کاروبار مملکت سے ہندوؤں کو یکسر خارج بھی نہ کر سکتے تھے۔

"صحیفہ نعت محمدی" کے مولف کے بموجب سلطان شمس الدین التمش کے پاس دھلی کے جید علماء دین کے ایک وفد نے آکر کہا "کہ ہندوؤں کے ساتھ "اما القتل و اما الاسلام" کا طریقہ اختیار کیا جائے" بادشاہ نے وزیر نظام الملک جنیدی سے کہا کہ وہ ان علماء سے بات کر کے انہیں مطمئن کرے۔ وزیر باتدبیر نے اپنے دلائل سے انہیں یہ کام موخر کرنے پر رضا

مند کر لیا۔ (2)

تحقیق سے اس انداز کی مزید مثالیں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں' دراصل یہاں کے بادشاہ مسلمان تو تھے لیکن اتنے اسلامی نہ تھے کہ (3) علماء کے کہنے پر مقامی آبادی کا قتل عام شروع کر دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ مقامی آبادی کے تعاون کے بغیر مستحکم حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔

""معقول بمقابلہ منقول:""

قاضی جاوید "ہندی مسلم تہذیب" میں لکھتے ہیں کہ "یہ سلطان محمد تغلق تھا جس کے زمانے میں نصاب تعلیم میں معقولات کا پلہ بھاری ہونا شروع ہوا' عجیب و غریب شخصیت کے حامل اس بادشاہ کو نظری علوم سے بہت شغف تھا۔ اس کے زمانے میں ہندوستان میں ایسے علماء موجود تھے جو علوم نقلیہ کے علاوہ عقلی علوم سے بھی دلچسپی رکھتے تھے... اس زمانے میں بہمنی سلطنت میں بھی معقولات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ سلطان محمد تغلق کے بعد سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں معقولات کو زبردست ترقی حاصل ہوئی.... لودھیوں کے بعد جب عنان حکومت مغلوں کے ہاتھ میں آئی تو اس رجحان کو مزید ترقی ملی۔ ہمایوں کو ریاضی' ہندسہ' نجوم اور ہیئت جیسے علوم سے دلچسپی تھی اور یہ سب اس زمانے میں عقلی علوم شمار ہوتے تھے جبکہ اکبر اعظم کا دور آیا تو گویا معقولات کے سنہری دن آ گئے۔" (ص: 109—111)

مغل حکمرانوں نے تو رواداری کے اصول کو مغل سلطنت کی بنیادی پالیسی میں تبدیل کر دیا جس کی نمایاں ترین مثال ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر (پیدائش: 15 اکتوبر 1542ء وفات آگرہ: 16 اکتوبر 1605ء) کا دین الٰہی (آغاز: 1581ء) ہندو اور راجپوت خاندانوں سے سلسلہ مناکحت اور گاؤ کشی پر پابندی جیسے احکام تھے۔

اکبر ذہین' مدبر اور دور اندیش حکمران تھا۔ وہ ہندو سائیکی کو خوب سمجھتا تھا یعنی ہندو سپاہی مغل پرچم تلے جان تو دے سکتا ہے مگر مسلمان کو گائے کا گوشت کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔ مسلمان اور ہندو جگری دوست ہوتے ہوئے بھی ایک برتن سے پانی نہیں پی سکتے۔ اس لیے اس نے ہر سطح پر مذہبی آویزش ختم کرنے کے لیے ایسے احکام جاری کیے جنہیں علماء نے بطور خاص نا پسند کیا۔ "دین الٰہی" کا شاید کوئی سیاسی فائدہ ہوا ہو مگر عام مسلمانوں اور علماء کے لیے تو یہ اسلام میں تحریف کے مترادف تھا اور اس پر احتجاج بھی ہوا۔ اس ضمن میں سید محمد جونپوری' شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور خواجہ باقی باللہ کے اسماء قابل ذکر

ہیں مگر سب سے بلند اور موثر صدائے احتجاج شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی تھی۔ چنانچہ اسلام کے بنیادی عقاید کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے احتجاج کرنے والے حضرات سے اس خطہ میں اسلامی بنیاد پرستی کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے اور اگر قطعی تاریخ کا تعین مقصود ہو تو پھر "دین الٰہی" کے آغاز یعنی 1581ء سے اس کی شروعات سمجھی جا سکتی ہیں۔

اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ اکبر سے پہلے سلطان علاؤ الدین خلجی کے ذہن میں یہ خیال سما گیا کہ آنحضرت کے چار صحابہ کی مانند وہ بھی اپنے چار مقربان خاص یعنی الغ خاں، ملک نصرت خاں، سنجرالپ خاں اور ظفر خاں کی مدد سے نئے دین کی بنیاد رکھ سکتا ہے تاکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مانند اس کا اور اس کے "صحابہ" کا نام ہمیشہ زندہ رہے مگر علاء الملک کوتوال دہلی کے سمجھانے سے باز رہا۔ ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔(4)

— اور خلجی سے بھی پہلے تیمور نے قرآن مجید میں تحریف کا ارادہ کیا تھا اور علماء بڑی مشکل سے اسے اس ارادہ سے باز رکھنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

"دین الٰہی:"

یہ تو تھا بعض حکمرانوں کا اسلام کے بارے میں رویہ مگر یہ استثنائی مثالیں ہیں ورنہ حکمرانوں کی اکثریت نے ایسی جرات کا سوچا بھی نہ تھا البتہ شہنشاہ اکبر کا معاملہ ذاتی کے بجائے سیاسی تھا اور اس کا تعلق استحکام اقتدار کی منطق سے تھا۔ اسے بھی یہ احساس ہو گا کہ یوں سرکاری مذہب کا سکہ نہیں چل سکتا لیکن اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک "دین" پر لانے کی کوشش کی۔ ایسی کوشش ناکامی جس کے مقدر میں تھی۔ اس نزاعی مسئلہ کے بارے میں مورخین نے خاصی خامہ فرسائی کی، ہندو اور انگریز مورخین نے اسے بطور خاص سراہتے ہوئے اسے اکبر کی آزاد خیالی اور "سیکولر ازم" قرار دیا جبکہ مسلمان مورخین اسے بدعت اور علماء غیر شرعی اور غیر اسلامی فعل قرار دیتے رہے ہیں اور بجا طور پر!

ہربنس مکھیا نے اپنے مقالہ "عہد وسطیٰ کی تاریخ اور فرقہ وارانہ نقطۂ نظر" میں شہنشاہ اکبر اور اس کے دین الٰہی کے ضمن میں بڑے پتہ کی بات کی ہے:

"... روشن خیالی اور رجعت پسندی کا جب حکمران کی پالیسی میں دخل ہوتا ہے تو یہ محض اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کے پس منظر میں آزاد خیال یا تنگ نظر حکمران تھا بلکہ اس کی تشکیل میں سیاسی صورت حال، مختلف جماعتوں کے مفادات اور مختلف فرقوں کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک فرقہ پرست مورخ جب

اکبر کی آزاد خیالی کی تعریف کرتا ہے تو اس کے بعد وہ آزاد ہو جاتا ہے کہ دوسرے حکمرانوں کو ان کی عقیدہ پرستی کی بنا پر برا کہے۔ اکبر کی بحیثیت سیکولر اور قومی ہیرو بھی تعریف کرنا غیر تاریخی ہے کیونکہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی ریاست (یا عہد وسطیٰ کی کوئی بھی ریاست) سیکولر ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ یہ ایک جدید تصور ہے اتنا جدید کہ ہم میں سے بہت سے اب تک اس سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نقطۂ نظر خود اپنی شکست کا جواز فراہم کرتا ہے یعنی اکبر کے دور حکومت کو نکال کر ساڑھے چھ سو سال کا دور سیکولر نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اکبر کا دور محض ایک اتفاقی تھا اور اس عہد کی روح سے انحراف تھا۔"(5)

"علمی روح:"

سولہویں صدی عیسوی کی علمی روح کیا تھی اس کا شیخ احمد سرہندی کے ایک مغل امیر شیخ فرید کے نام مکتوب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"بس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے۔ جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا اس نے اہل اسلام کو خوار کیا' ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی نہیں بلکہ اپنی مجلس میں جگہ دینا اور ان سے ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دور رکھنا چاہیے اور اگر دنیاوی غرض ان سے متعلق ہوں تو پھر بے اعتباری کے طریق کو مد نظر رکھ کر بقدر ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی در گزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں۔"(6)

ان حضرات نے فلسفہ' منطق اور علوم کے ضمن میں جو رویہ اپنا رکھا تھا وہ چودہویں اور پندرہویں صدی کے پادریوں سے مشابہ نظر آتا ہے شیخ محمد اکرام نے "رود کوثر" (ص: 170) میں شیخ احمد سرہندی کے جو مکاتیب درج کیے ہیں ان میں سے ایک میں فلسفی کو "شیطان کے گروہ" میں شامل کرتے ہوئے یہ لکھا:

"بعض لوگوں نے جو علوم فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں اور فلسفی تسویلات پر فریفتہ ہیں ان کو حکماء جان کر انبیاء علیہم والصلوۃ والسلام کے برابر سمجھتے ہیں.... ان علوم کی تصدیق سے انبیاء اور ان کے علوم کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ یہ

دونوں علم ایک دوسرے کی نقیض ہیں- اب جو چاہے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے مذہب کو لازم پکڑے اور اللہ تعالیٰ کے گروہ میں شامل ہو جائے اور چاہے فلسفی بن جائے اور شیطان کے گروہ میں داخل ہو جائے-"

شیخ احمد سرہندی اس ضمن میں مزید فرماتے ہیں:

"یہ لوگ (یعنی فلسفی) بہت ہی بے خود اور بیوقوف ہیں اور ان سے زیادہ کمینہ اور بے وقوف احمق وہ شخص ہے جو ان کو دانا اور عقل مند جانتا ہے- ان کے منظم اور مرتبہ علوم میں ایک علم ہندسہ ہے جو محض لا یعنی اور بے ہودہ اور لا طائل ہے- بھلا مثلث کے تین زاویہ قائمہ کے ساتھ برابر ہونا کس کام آئے گا-"

ضیاالدین برنی کے بموجب سلطان التمش کو اس عہد کے مشہور عالم دین مبارک غزنوی نے یہ مشورہ دیا تھا:

"فلاسفہ، علوم فلاسفہ اور معقولات فلاسفہ پر اعتقاد رکھنے والوں کو اپنی سلطنت میں نہ رہنے دیں اور جس طرح بھی ممکن ہو علوم فلسفہ کی تعلیم نہ ہونے دیں-"

جبکہ شاہ ولی اللہ کی وصیت کی رو سے:

فارسی و ہندی کی کتابیں، علم شعر، معقولات اسی سلسلہ کی جو دوسری چیزیں پیدا ہو گئی ہیں ان میں مشغول ہونا اور تاریخ یا بادشاہوں کی سرگزشتوں اور صحابہ کے باہمی نزاعات کا مطالعہ کرنا گمراہی در گمراہی ہے"(7)

امام غزالی نے رد فلسفہ میں خصوصی شہرت حاصل کی اتنی کہ یہی وجہ ء شہرت بنی مگر یہ مخالفت اس لیے تھی کہ ان کی دانست میں یونانی فلسفہ اسلامی افکار کے بارے میں شکوک پیدا کر کے ان میں ضعف کا باعث بنے گا لیکن اس کے باوجود وہ علوم کی اہمیت کے قائل تھے بقول:

"وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کی مدافعت ریاضی کے علوم سے انکار کر کے کی جا سکتی ہے وہ مذہب کے خلاف ایک ناقابل معافی جرم کر رہا ہے کیونکہ ان علوم میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو دینی صداقت کے منافی ہو-"(8)

جبکہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کے بموجب:

"مغربی علوم و فنون بجائے خود سب کے سب مفید ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ بھی دشمنی نہیں بلکہ جواباً میں یہ کہوں گا جہاں تک حقائق علمیہ کا

تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں۔" (تنقیحات ص: 386)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی کسی نہ کسی صورت میں عقاید کی آویزش کا آغاز ہو گیا تھا۔ کچھ فرقے اور ان سے وابستہ مخصوص تصورات اور تعصبات تو اپنے ساتھ ہی لائے تھے کچھ ہندوستان کے مخصوص مذہبی' تہذیبی اور تمدنی ماحول سے حاصل کیے۔ تاہم تمام تر اختلاف کے باوجود بھی یہ فرقے ان کے عقاید اور رسوم بہرحال اسلامی ہی تھیں اور باہمی تکفیر کے باوجود بھی ان کا تشخص اسلامی ہی قرار پاتا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا مقابلہ ایک بر عکس مذہب سے ہوا اور ہزاروں سال پرانی تہذیب سے پالا پڑا۔ ہندو کلچر خواہ کتنا ہی غیر اسلامی کیوں نہ محسوس ہو مگر اس کی رنگا رنگی' زمین سے پیوستگی اور عوامی مزاج سے مناسبت کی پیدا کردہ کشش سے صرف نظر بھی ممکن نہیں۔

سیاسی ضروریات کے تحت اگر حکمرانوں نے ہندوؤں کو امور مملکت میں شامل کیا تو انہیں کافر اور مردود سمجھنے والی دینی شخصیات کی بھی کمی نہ تھی اور پھر ان سب پر مستزاد تصوف کا مسلک اور بھگتی تحریک جس میں انسان کی انسانیت پر زور دیا جاتا تھا نہ کہ عقاید و مسلک پر۔

علمی سطح پر اگر ابو ریحان البیرونی (4 ستمبر 973ء- 11 ستمبر 1048ء) اور اس کی "کتاب الہند" (423ھ) اور سنسکرت تراجم ملتے ہیں تو جذباتی سطح پر امیر خسرو (1253- 1325ء) ملتے ہیں۔ البیرونی "باہر والا" تھا اس لیے اس نے ہندوستان کو غیر ملکی محقق کی پر تجسس آنکھ سے دیکھا مگر خسرو ہندوستانی تھا اور اسی لیے وہ تخلیقی سطح پر مثنوی "نہ سپہر" میں ہند اور اہل ہند سے پیار کرتا اور اسی پر فخر کرتا ہے:

چو من طوطی ہندم او راست پرسی
زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

دینی شخصیات کی باہمی چپقلش اور علماء کے اختلافات' صوفیا کا ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم والا رویہ اور ان کے ساتھ خانقاہ' تکیہ اور حجرہ کی فضا کچھ اور ہی نظارے دکھا رہی تھی ایسے میں آزاد خیال دارا شکوہ بھی آتا ہے اور صرف "لا" کہنے والا بے لباس سرمد بھی——

"کافر فرنگیوں نے:"

انگریزوں کی صورت میں ہندوستانیوں کو پہلی مرتبہ سفید سیاست کے داؤ پیچ کا اندازہ ہوا

اور ساتھ ہی مغربی تہذیبی اقدار سے مقابلہ اور ایگزاٹک کلچرل شاک بھی لگا۔ اگرچہ مصحفی جیسا شاعر انگریزوں کی تاجرانہ ذہنیت کی مذمت کر رہا تھا:

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

تاہم حکمران بے خبر رہے۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں شاہ ولی اللہ (10 فروری 1703- 10 اگست 1763ء) جیسی ہستی نے جنم لیا۔ شاہ صاحب نے اگر اور کچھ نہ بھی کیا ہوتا تو صرف قرآن مجید کے فارسی ترجمہ (38- 1737ء) کی بنا پر ہی زندہ رہ سکتے تھے (ملاؤں نے اس ترجمہ کی شدید مخالفت کی تھی) شاہ ولی اللہ کے صاحب زادوں شاہ عبدالقادر (وفات: 1826ء) اور شاہ رفیع الدین (وفات: 1823ء) نے بھی قرآن مجید کے اردو تراجم کیے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ "موضح القرآن" (دہلی: 1829ء) اور شاہ رفیع الدین (کلکتہ: 1840ء) طبع ہوئے۔ ٹھیٹھ اردو اسلوب کے لحاظ سے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ نے خصوصی شہرت حاصل کی۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے:

ڈاکٹر احمد خاں (مرتب) "قرآن کریم کے اردو تراجم" (کتابیات) مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد۔ 1987ء

شاہ ولی اللہ صحیح معنوں میں اسلام کی روح سمجھنے والے دینی عالم تھے۔ انہیں قرآن مجید، حدیث اور فقہ سے محققانہ دلچسپی تھی اور اجتہاد کی اہمیت کے بھی قائل تھے۔ انہوں نے بادشاہوں اور امراء و وزراء کی عیاشیوں پر دل کھول کر تنقید کی۔ آج کی اصطلاح میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ عمرانی اور اقتصادی مسائل کا بھی گہرا ادراک رکھتے تھے۔ انہیں بجا طور پر "حکیم الامت" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے بلکہ شبلی انہیں غزالی، الرازی اور ابن رشد کے پایہ کا دانش ور سمجھتے ہیں۔

ان کے بعد سید احمد شہید (پیدائش بریلی: 1782، وفات: بالا کوٹ۔ 1831ء) آتے ہیں جنہوں نے دینی اصلاح کو سیاسی اصلاح سے مشروط کر کے صاحب سیف و قلم ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے عسکری جدوجہد کا آغاز کیا یہ کہہ کر اب ہندوستان "دارالحرب" ہے۔ انہوں نے پنجاب میں سکھ حکومت کے خلاف لڑائی کی۔ 21 دسمبر 1826ء کو اکوڑہ (ضلع خٹک) میں سکھوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد انہیں امیرالمومنین قرار دے کر ان کے ہاتھوں پر باقاعدہ بیعت کی گئی اور جمعہ کے خطبوں میں انہیں خلیفہ اور امام کہا جانے لگا۔ 1830ء میں پشاور پر قبضہ کے بعد مفتوحہ علاقوں میں شرعی قوانین نافذ کر دئے مگر اگلے برس ہی بالا کوٹ کے

مقام پر شکست کھا کر جام شہادت نوش کیا۔ سید احمد شہید عملی جدوجہد کی مکمل تصویر تھے مگر میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ انہوں نے انگریزوں کے بجائے سکھوں کو اپنا ہدف کیوں بنایا تھا حالانکہ سکھوں کے مقابلہ میں انگریز بڑا خطرہ تھے جعفر تھانیسوری کے مرتبہ "مکتوبات سید احمد شہید" (ص: 64) سے مکتوب کے بموجب:

"اس فقیر کو پردہ غیب سے کفار یعنی لانبے بالوں والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، رحمانی بشارتوں کے ذریعہ نیک کردار مجاہدین کو ان پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا۔"

"سعیٔ ناکام!"

اگرچہ علما' دینی شخصیات اور مذہبی مبلغین نے کسی نہ کسی سطح پر اصلاح احوال کی مساعی جاری رکھی مگر بحیثیت مجموعی وہ صورت حال تبدیل کرنے میں اس لیے ناکام رہے کہ انہوں نے عمرانی تناظر میں اقتصادی مسائل کو در خور اعتنا نہ جانا۔ ان کا سارا زور بالعموم مخالف فرقہ اور بر عکس مسلک کے خلاف صرف ہوتا تھا یا ان فقہی مسائل پر توانائیاں صرف کرتے جن کا عام افراد کی زندگی سے براہ راست تعلق نہ تھا۔ اگرچہ ہندوستان میں فلسفہ' منطق اور جدید علوم نام کی کوئی چیز نہ تھی جو کچھ بھی تھا بس درس نظامی کی صورت میں تھا۔ لیکن یہ برائے نام جو علوم تھے ان سے بھی احتراز کرتے ہوئے انہیں مشکوک اور مردود گردانا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماء نہ تو تصورات نو کے چراغ روشن کر سکے نہ افکار نو کے داعی بن سکے۔ کسی نئی علمی روایت کی داغ بیل تو دور کی بات وہ تو پرانی علمی روایات میں بھی قابل قدر اضافہ نہ کر سکے وہی مسالک کے مباحث' وہی فروعی مسائل پر جھگڑے' وہی قدامت کا تحفظ اور وہی باہمی تکفیر — اس لیے اپنے تمام خلوص اور نیک نیتی کے باوجود یہ حضرات بالعموم تہذیبی دھارے سے منقطع رہے اور عقلی علوم سے بیگانگی کی بنا پر اپنی قوم کی ذہنی تاریخ میں قابل توجہ اضافہ کرنے میں ناکام رہے لہٰذا بحیثیت مجموعی صورت کچھ مصحفی کے اس شعر جیسی رہی:

مذہب میں مرے شیخ کے اتنا ہی فرق ہے
میں ہاتھ میں رکھوں ہوں تو وہ آستیں میں بت

اس عہد کے متوازی جب یورپ کا مطالعہ کریں تو جس متضاد صورت حال کا احساس ہوتا ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کی طرف "تجدید احیائے دین" (ص :128 — 124) میں ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

"جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے اسی دور میں یورپ قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہاں علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے ایک دنیا بدل ڈالی... جن کی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کیا.... اخلاقیات، ادب، قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمران پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرات و بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی—— انہوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا، ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیئے، نظام تعلیم بدل دیا۔ نظریہ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا اور تمدن وسیاست کا پورا نظام بدل دیا—— حیرت تو یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں انگریز بنگال پر چھا گئے اور الہ آباد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا مگر انہوں نے اس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانے میں دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے مگر ان کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسباب طاقت کیا ہیں؟ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید جو عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے تھے انہوں نے سارے انتظامات کیے مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جا رہی ہے اور نئے آلات، نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے اس کی اتنی قوت اور ترقی کا کیا راز ہے۔ اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارے قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں، اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے اور اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔"

"ساعت فرنگی:"

ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے...؟

مولانا مودودی کے اس اہم سوال کا جواب تہذیب و تمدن، تعلیم و تعلم، قوت ایجاد و اختراع اور تخلیق و نقد —متنوع جہات کا طالب ہے۔ خطرہ فرنگ کو کس طرح سے محسوس کیا جا رہا تھا اس کا معاصر تواریخ کے ساتھ ساتھ ہم عصر شاعری سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ہر چند کہ اس عہد کی شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص "سیاسی" موضوعات پر

قلم نہ اٹھایا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے فرنگ اور فرنگی کا تذکرہ بھی کیا کبھی حسن و دلربائی کے مفہوم میں تو کبھی خالص سیاسی معانی میں— تاہم فرنگ اور فرنگی کو استعارہ بنانے والے شعرا فرنگی سیاست اور اس سے وابستہ مضمرات کا کوئی خاص ادراک نہ رکھتے تھے۔ غالبًا ان سے اس کی توقع بھی بے سود تھی کہ اس عہد کے حکمران اور ان کے اہل کار، درباری عمایدین اور وزرائے باتدبیر بھی یہ نہ سمجھ سکے تو غزل گو سے بھلا کیا توقع ہو سکتی تھی۔ تاہم درد سے لے کر انشاء تک اہل فرنگ کا تذکرہ مل جانا بھی خاصہ معنی خیز ہے۔ ذیل میں دلچسپی کے لئے چند مثالیں پیش ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح اہل فرنگ جذباتی سے لے کر سیاسی نوعیت کے مفاہیم سمجھا رہے تھے

کب ہے دماغ عشق بتان فرنگ کا
مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قید فرنگ ہے
(درد)

فرنگی کوئی آب تیغ کے عہدے سے برآویں
اگر باندھیں پہاڑ آ کر وہ روز جنگ آتش کا
(سودا)

ہاتھ سے گوروں کے جانبر ہوویں کیونکر اہل ہند
کام کرتے ہی نہیں ہرگز یہ بن کونسل کئے
گر ہو طپنچہ بند وہ رشک فرنگیاں
بانکے مغل بچے نہ کریں خانہ جنگیاں
(مصحفی)

ہشیاری رنگ دیتی ہے قید فرنگ کا
دیوانگی نشانہ بناتی ہے سنگ کا
تیار رہتی ہیں صف مژگاں کی پلٹنیں

تیار رہتی ہیں صف مژگان کی پلٹنیں
رخسار یار ہے کہ جزیرہ فرنگ کا
ہو گی تری طرح سے نہ اے ترک خوشنما
پہنے پھریں لباس سپاہ فرنگ سرخ
(آتش)

مروڑی فوج انگریزی نے دی ایک ایسی ہی بل کی
کہ رسی کٹ گئی ہلکر کی ٹوٹا جاٹ کا جوڑا
چار و ناچار ہوا جانا ہی لندن اپنا
لے گئی چھین کے دل ایک فرنگن اپنا
انگریز کے اقبال کی ہے ایسی ہی رسی
آویختہ ہے جس میں فراسیس کی ٹوپی
(انشا)

نہیں سمجھی میں وہ فرنگی زاد ماہ بے منزل ہوائی میں

لال کتاب اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے
مے کدہ اپنے واسطے مدرسہ فرنگ ہے
(ذوق)

"گھڑی فرنگی" کی سیاسی اور تاریخی اہمیت کی علامتی حیثیت تو نہ سمجھی گئی مگر اس سے جذباتی تلازمات وابستہ کر لئے گئے۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

تھا ساعت فرنگی دل چپ جو ہو رہا ہے
کیا جانئے کہ کس نے ہے اس کی کل کو توڑا
آپ ہی آپ سے پکار اٹھتا ہے
دل بھی جیسے گھڑی فرنگی ہے

یہ تو تھے جدت پسند انشاء جبکہ ان کے معاصر جرأت کے بقول:

اب اضطراب دل سے جوں ساعت فرنگی
ہر ساعت اپنے گھر میں ہم عازم سفر ہیں

"ناداں یہ سمجھتا ہے..."

1857ء میں سقوط دہلی کے تناظر میں بنیاد پرستی کا قدیم اور روایتی اسلوب برقرار نہ رہ سکتا تھا کہ انگریزی تعلیم کے نتیجہ میں مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی صورت میں نئے اور زیادہ موثر چیلنج کا سامنا تھا۔ ہندوؤں میں ہندو مت کی پوترتا' رام راج اور کرشن بھگتی کا احیاء ہو رہا تھا۔ یوں ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظروں کا آغاز ہوا اور مذہبی اقدار اور اسلامی تعلیمات کے تحفظ میں مصروف حضرات اور دینی شخصیات کی مساعی لائق ستائش ہے۔ ادھر مسلمانوں میں بھی شاندار اسلامی ماضی کے احیاء کا آغاز ہو چکا تھا۔ قومی سطح پر نرگسیت کے اس جذبہ نے اظہار کے لیے جب مذہب کا سہارا لیا تو مذہب کے نام پر ماضی پرستی نے فروغ پایا— دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو— کا نفسیاتی رویہ اس رجحان کی اساس قرار پاتا ہے جس کا اظہار تحریر و تقریر میں اس بات سے ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے علوم کے موجد مسلمان ہیں۔ مغرب نے اسلام کی تمام خوبیاں اپنا کر ترقی کر لی (اور جہالت اور اخلاقی خرابیاں ہمارے لیے چھوڑ دیں) ماضی ہمیشہ بہتر اور شاندار ہوتا ہے۔ ماضی پرستی کا یہ رجحان مذہبی روایات سے مزید تقویت حاصل کر کے بنیاد پرستی کے بنیادی اصول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حال کے ستم دیدہ افراد کو ایسے تصورات بالخصوص مرغوب ہوتے ہیں ویسے بھی علامہ اقبال کے بقول:

"روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں ("تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" ص: 274)

انیسویں صدی کے اواخر میں سرسید تحریک کی مخالفت میں مغربی تہذیب و تمدن نے مزید شدت پیدا کر دی اور یوں بنیاد پرستی کو نیا محاذ مل گیا اکبر الہ آبادی اور "اودھ پنچ" کے طنز نگاروں کی شاعری کی صورت میں بنیاد پرستی کا تخلیقی روپ ملتا ہے (اگر بنیاد پرستی کا کوئی تخلیقی روپ ہو سکتا ہے تو) اکبر الہ آبادی بقول خود "مدخولہ گورنمنٹ" تھے اس لیے قول و فعل اور وضع و عمل کے تضاد کے باعث ان کی طنز کا نشتر زیادہ گہرائی میں نہیں اترتا اور یوں بات کوٹ پتلون' ریل' نل کے پانی' ہیٹ' ڈبل روٹی' موٹر کار "سینہ مس" اور سایہ کی سن سن کی ہوس انگیزی تک ہی محدود رہی لہٰذا بحیثیت مجموعی اس سے آگے

نہ بڑھ سکے:

رقیبوں نے لکھائی ہے رپٹ جاجا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اقبال اکبر کے معاملہ میں کہیں زیادہ گہری نگاہ رکھتے تھے جبھی تو وہ یہ کہہ سکے:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

نذیر احمد کا ناول "ابن الوقت" انیسویں صدی کے اواخر میں متغیر "کلچرل پیٹرن" کے تناظر میں بنیاد پرستانہ رویوں کی بڑی کامیاب عکاسی کرتا ہے کہ کیسے تبدیلی وضع بے دینی کے مترادف تھی۔ سرسید کے صاحب زادہ کی مانند بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ "ابن الوقت" سرسید کا کیری کیچر ہے (نذیر احمد نے اس کی تردید کی تھی) اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی ابن الوقت آزاد خیالی کی مثال قرار پاتا ہے۔ وہ تاریخ کا زیرک طالب علم ہے اسی لیے حال سے سبق لینا جانتا ہے۔ وہ ماضی پرست نہیں روایت پسند نہیں بلکہ مشاہدہ، علم اور عقل کا داعی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں حجتہ الاسلام آج کی اصطلاح میں بنیاد پرست دکھائی دیتا ہے اور حجتہ الاسلام جیسے بزرگ ہی ہر عہد میں بھیس بدل بدل کر آتے رہے ہیں اور پاکستان کی مٹی تو ان کے لیے بے حد زرخیز ثابت ہوتی ہے۔

"روشن خیالی کا سفر:"

بنیاد پرستی کے متوازی روشن خیالی اور عقل پرستی کا سفر بھی جاری رہا چنانچہ بنیاد پرستی اور ملایت کے مقابلہ میں ایسی شخصیات بھی مل جاتی ہیں جنھوں نے اپنی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں سے اپنے عصر کو روشن کرنے کی کوشش کی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول:

"روشن خیالی کا جو چراغ شاہ ولی اللہ نے روشن کیا تھا اس کی روشنی ہزار رکاوٹوں کے باوجود سرسید کے جرات مندانہ اقدام سے بہرحال تیز تر ہو گئی۔ پھر اس کی لو سے مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا نیاز فتح پوری اور علامہ اقبال کے ہاتھوں کئی لویں پیدا ہو گئیں..... آج کی روشن خیالی میں سب سے گراں قدر حصہ علامہ اقبال کا ہے"(8)

تاہم تنگ نظری اور سطحی معلومات رکھنے والے جذباتیوں کے مقابلہ میں روشن خیالی اور عقلیت کا سفر خاصہ آہستہ خرام محسوس ہوتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ منبر اور لاؤڈ سپیکر کی بہت بڑی قوت ہے، علمی کتاب کو کتنے لوگ پڑھتے اور اس کے مباحث پر سنجیدگی

سے غور کرتے ہیں جبکہ ایک شعلہ بیاں مولوی ہزاروں کے مجمع کو متاثر کر سکتا اور فسادات کرا سکتا ہے۔

آخری بات بزبان شاعر:

کچھ عیب ہے بنیاد پرستی تو انہیں کیا
اس میں کوئی نقصان ہے ان کا تو ہمیں کیا

"بدل کے بھیس پھر آتے ہیں.....:"

بنیاد پرست کون ہے؟

جیسا کہ واضح کیا گیا مغرب میں اس اصطلاح کی عمر محض پون صدی ہے یہی نہیں بلکہ وہاں کی آزاد خیالی اور غیرمذہبی فضا کے باعث یہ تقریباً مردہ اصطلاح تھی کہ اچانک مغربی میڈیا نے مسلمانوں کے لیے اس کا استعمال شروع کر دیا مگر مغرب میں مروج مخصوص کیتھولک مفہوم کے برعکس سیاسی اور فوجی مفاہیم میں۔ واضح رہے کہ مغرب کو اسلامی ممالک میں مذہب کے فروغ سے کبھی کوئی خاص پریشانی نہیں رہی تھی کہ سوشلزم کے خلاف اسلام بے حد موثر قوت ثابت ہوا تھا اس لیے— ہمارے برعکس— مغرب کو بنیاد پرستی مرغوب تھی۔ مگر ان دنوں جب بنیاد پرستی کی بات کی جاتی ہے تو یہ بطور خاص ان مسلمان شخصیات' اداروں اور تنظیموں کے خلاف ہوتی ہے جو اب اسلام کے نام پر استعماری قوتوں کے خلاف اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں جیسے فلسطین کے مجاہدین اور کشمیری حریت پسند۔

مغرب میں اسلامی بنیاد پرستی— مذہب کے برعکس— سیاسی مفہوم کی حامل ہے اور سیاسی مصلحتوں اور وقتی ضرورتوں کے مطابق اس کا تناظر سیاق و سباق اور حوالے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اسے یوں سمجھئے کہ افغانستان کی جنگ لڑنے والے سبھی اسلامی مجاہدین تھے مگر اب گلبدن حکمت یار بنیاد پرست ہے۔ علامہ خمینی نے امریکی بالا دستی قبول نہ کی تو وہ بنیاد پرست قرار پائے' بھارتی پریس میں کشمیری حریت پسند بنیاد پرست ہیں۔ بورس یلسن کے لیے تاجکستانی بنیاد پرست ہیں اور اسی تناظر میں "اسلامی بم" کے باعث اب پاکستان کو بنیاد پرست کہا جاتا ہے حالانکہ ہم تو ہمیشہ سے ہی امریکہ کے برخوردار رہے ہیں۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ روس اور سوشلزم کے "خطرہ" کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک اسلامی ملکوں کی مذہبی تنظیموں کی ہمیشہ آبیاری کرتے رہے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے مذہب کی قوت سوشلزم کے خلاف مضبوط دفاع ثابت

ہو سکے قطع نظر اس امر کے کہ ان جماعتوں کا دینی مسلک اور سیاسی نقطۂ نظر کیا تھا اور ان کے راہنماؤں کا سوشلزم، جدید اقتصادیات اور عمرانی علوم کا کتنا گہرا علمی اور تحقیقی مطالعہ تھا اور وہ تاریخ اور تاریخی محرکات کا کتنا شعور رکھتے تھے۔ دراصل امریکن پالیسی ساز اور بین الاقوامی امور کے ماہرین صرف مذہب کا نام استعمال کرنا چاہتے تھے اس اہم امر سے صرف نظر کر کے کہ اگر مذہب واقعی ہتھیار ہے تو ہم کن لوگوں کے ہاتھ میں اسے دے رہے ہیں۔ چنانچہ امریکہ اور روس کی سرد جنگ کی تین دہائیوں (یعنی 1950-80ء) کے دوران مذہبی اور مذہب نما سیاسی جماعتوں کو ہر ممکن طریقہ سے فعال بنانے کی سعی میں یہ بھی فراموش کر دیا گیا کہ فعال کا موثر ہونا لازم نہیں۔ ادھر مصر میں انور السادات کے قتل، انقلاب ایران، سوڈان کے مخصوص حالات، پاکستان میں ضیاالحق اور بالآخر افغانستان سے روس کی بے دخلی سے بین الاقوامی سیاست میں انقلابی تبدیلیوں کے تناظر میں اب امریکہ اپنی بوئی ہوئی فصل خود ہی کاٹنے پر مجبور ہے۔ ہتھیار کا استعمال ہتھیار رکھنے والے کی نفسیات سے مشروط ہوتا ہے۔ اب یہ ہتھیار خود امریکہ کے خلاف استعمال ہو رہا ہے تو کل کی پسندیدہ اسلامی قوتیں اب خوف زدہ کرنے والی بنیاد پرستی نظر آ رہی ہے۔

14 نومبر 1993ء کو ایک تقریب میں ڈاکٹر این میری شمل سے ملاقات پر میں نے ان سے مغرب کے حوالے سے اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا:

"THIS IS UTTERLY NONSENS!"

مغرب کے سیاسی مفہوم کے برعکس ہمارے لیے بنیاد پرستی مذہب کے نام پر تنگ نظری، علم دشمنی، جہالت، غیر عقلی رویوں، مذہبی تعصب، عدم روا داری اور تشدد سے عبارت ہے الغرض ! اپنی تمام تر انتہائی، شدید اور منفی نوعیت میں یہ ملایت ہے اور اپنی تمام تر جارحیت، سلبی اثرات اور فتوئی بازی کے ساتھ۔ منبر، مکتب، مسجد، جلسہ، لاؤڈ سپیکر جس کے مظہر ہیں۔

بنیاد پرستی سے مذہبی مفہوم منفی کر کے بے لچک غیر منطقی رویوں پر مبنی طرز عمل قرار دینے کی صورت میں اس کے مفہوم میں خاصی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں بنیاد پرست کا مذہبی ہونا ضروری نہیں رہتا کہ اپنی غیر منطقی ہٹ دھرمی میں ایک آزاد خیال دانشور تنگ نظر دانش ور میں تبدیل ہو جاتا ہے اور سوشلسٹ ملا بن جاتا ہے یوں

دیکھیں تو انتہا پسند انقلابی متشدد دانش ور اور بزعم خود ہمیشہ ہی حق پر رہنے والا قلم کار بھی اسی صف میں جگہ پا سکتا ہے۔ ابوجہل ایک فرد سہی مگر یہ ذہنی رویہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہر ملا بنیاد پرست ہوتا ہے مگر ہر بنیاد پرست کا ملا ہونا ضروری نہیں۔

"مولویت:"

بنیاد پرستی مولویت / ملایت کے مترادف سمجھی جاتی ہے اور ہم نے اس نقطۂ نظر سے جو کچھ لکھا اسے ہر ممکن طریقہ سے جذباتیت سے بچا کر علمی دلائل کا اسلوب اپنایا یہی نہیں بلکہ آراء و اقوال، اور حوالوں میں ہر نوع کے مواد سے استفادہ کی سعی کرتے ہوئے تحریر کو متوازن بنانے کی کوشش کی گئی اور اسی لئے "مولویت" کے مفہوم کو ایک مولوی کے اسلوب میں واضح کرنے کے لئے حافظ محمد اشرف چودہری (خطیب جامعہ نعیمیہ، لاہور) کا مضمون بعنوان "مولویت" مکمل طور پر پیش ہے تاکہ قارئین ان کے نقطۂ نظر سے بھی آگاہ ہو سکیں۔ یہ مضمون دارالعلوم جامعہ نعیمیہ کے مذہبی اور اخلاقی مجلہ ماہنامہ "عرفات" (لاہور: مئی 1994ء) میں چھپا ہے:

"ان ہی کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
ان ہی کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی

وادی ظلمت میں قندیل، علم و عمل کے پیکر، خوب و کمال کے مجسمہ، الفت و ارادت کے آفتاب و مہتاب علماء کرام، جنہوں نے ہر کٹھن مرحلہ میں استقامت کے ساتھ دین اسلام کی خدمات انجام دیں۔ علماء کرام نے قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر لکھیں، علماء حق نے جابر حکمرانوں کے سامنے ہمیشہ کلمہ حق کہا۔ علماء نے قرآن و سنت کی روشنی میں مسائل استنباط کئے۔ علماء حق نے لوگوں کو عقائد و عبادات اور جائز و ناجائز سے واقفیت کرائی۔ علماء کرام نے سرپھرے لوگوں کو دین میں تحریف سے روکا۔

موجودہ دور میں اسلام کے دشمن جب براہ راست اسلام کی مخالفت نہیں کر سکے تو انہوں نے اپنے خبث باطن کا اظہار یوں کیا کہ علماء ربانیین کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بونا شروع کیا۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ لفظ مولویت جو کہ اپنے معنیٰ، مفہوم اور مقاصد کے اعتبار سے ہر طرح عظمت، رفعت اور بزرگی والا لفظ ہے اس کے خلاف لوگوں کے ذہنوں میں نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و امت کے خلاف
(اقبال)

قارئین کرام کے لئے لفظ "مولویت" کی حقیقت آشکارا کی جاتی ہے جس سے لفظ مولویت کی عظمت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ مولویت علمی برتری کا نام ہے۔

ہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (سورہ زمر پ 23 رکوع 15)

مولویت خوف خدا کا نام ہے۔

انمایخشی اللہ من عبادہ العماء (سورہ فاطر پارہ 22 آیت 28)

مولویت بلندی درجات کا نام ہے۔

والذین اوتوالعلم درجات (پارہ 28 سورۃ مجادلہ) مولویت دین میں غور و فکر کا نام ہے۔

فلو لا نفر من کل فرقتہ منھم طائفتہ لیتفقھوا فی الدین (پارہ 11 سورۃ توبہ)

مولویت انصاف پسندی کا نام ہے۔

واولوالعم قائما بالقسط (پارہ 3 رکوع سورہ آل عمران)

مولویت اہل ذکر کا نام ہے۔

فسئلوا اہل الذکران کنتم لا تعلمون (سورہ نحل پارہ 14 رکوع 12)

مولویت دین میں سمجھ بوجھ کا نام ہے۔

من یردالله بہ خیرایفقہ فی الدین (بخاری و مسلم)

مولویت حصول علم کا نام ہے۔

طالب العلم فریضتہ علی کل مسلم (صحیح مسلم)

مولویت علم سیکھنے سکھانے کانام ہے۔

تعلموا العلم وعلموہ الناس (دارمی)

مولویت پیام نبوت کی دعوت کا نام ہے۔

بلغواعنی ولوایتہ

مولویت نبی کی وراثت کا نام ہے۔

ان العلماء ورثتہ الانبیاء (مشکوۃ باب العلم (ترمذی)

مولویت علمی رشک کا نام ہے۔

لا حسدالا فی اثنین رجل اتاہ اللہ مالا فسلطہ علی ہلکتہ فی الحق ورجل اتاہ اللہ الحکمتہفھو یقضی بھاو یعلمھا۔ (مشکوۃ باب العلم بخاری، مسلم)

مولویت علم کی نفع رسانی کا نام ہے۔

علم ینتفع بہ (مشکوۃ باب العلم)

مولویت عابدوں پر فضلیت اور شیطان پر سختی کا نام ہے۔

فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

مولویت اللہ تعالی سے فضل اور اس کی مخلوق سے دعائیں لینے کا نام ہے۔

ان الل ہ و مئلکتہ، واہل السموت والارض حتی نملتہ فی حجرھا وحی الحوت لیصلون علی معلم النلس الخیر مشکوتہ باب العلم (ترمذی)

مولویت جنت کے راستے پر چلنے کا نام ہے۔

من سلک طریقایطلب فیہ علما سلک اللہ بہ طریقا من طریق الجنتہ (ترمذی)

مولویت صحابہ کی خلافت کا نام ہے۔

مولویت خدا کے دین کی خدمت کا نام ہے۔

مولویت حق و صداقت کا نام ہے۔

مولویت ناموس رسالت پر مر مٹنے کا نام ہے۔

مولویت عظمت صحابہ اور عظمت اہل بیت کی حفاظت کا نام ہے۔

مولویت امام اعظم نعمان بن ثابت کی فقاہت کانام ہے۔

مولویت امام شافعی محمد بن ادریس کی رفعت کا نام ہے۔

مولویت امام مالک بن انس کی جرات کا نام ہے۔

مولویت امام احمد بن حنبل کی استقامت کا نام ہے۔

مولویت امام جعفر صادق کے علم کا نام ہے۔

مولویت امام موسی کاظم کے حلم کا نام ہے۔

مولویت خواجہ حسن بصری کی معرفت کا نام ہے۔

مولویت شیخ حبیب عجمی کی بصیرت کا نام ہے۔

مولویت شیخ سری سقطی کی وسیع اخلاق کا نام ہے۔

مولویت شیخ معروف کرخی کے کشف حقائق و نطق و قائق کا نام ہے۔

مولویت حضرت داؤد طائی کے مجاہدہ و مشاہدہ کا نام ہے۔

مولویت حضرت ابراہیم بن ادھم کے اشتیاق دیدار الٰہی کا نام ہے۔
مولویت حضرت جنید بغدادی کے جمال خورشید افلاک کرامت کا نام ہے۔
مولویت ابوبکر شبلی کے علوم ظاہری و باطنی کا نام ہے۔
مولویت امام علی رضا کے جوش تبلیغ کا نام ہے۔
مولویت امام محمد تقی کے ولولہ توحید کا نام ہے۔
مولویت امام علی نقی کے ایثار کا نام ہے۔
مولویت امام حسن عسکری کے وقار کا نام ہے۔
مولویت امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری کی خدمات دین کا نام ہے۔
مولویت امام مسلم بن حجاج کی خدمات دین کا نام ہے۔
مولویت ابو عیسی محمد بن عیسی ترمذی کی ذھانت و فطانت کا نام ہے۔
مولویت امام ابوداؤد سلیمان بن اشعت کی علل حدیث کا نام ہے۔
مولویت امام عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی کے استخراج کا نام ہے۔
مولویت حافظ ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ کے جامع علوم معرفت کا نام ہے۔
مولویت بشر حافی کے واقف اسرار حقیقت کا نام ہے۔
مولویت امام محمد غزالی کے اسلامی فلسفے کا نام ہے۔
مولویت امام فخرالدین رازی کے ادراک کا نام ہے۔
مولویت حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے کشف ذات حق کا نام ہے۔
مولویت بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کی حمیت دین کا نام ہے۔
مولویت بہاؤ الدین نقشبند کے حسن خلق کا نام ہے۔
مولویت حضرت شہاب الدین سہروردی کی وسعت نظری کا نام ہے۔
مولویت علی بن جعفر ابوالحسن خرقانی کے فقرو توکل کا نام ہے۔
مولویت مولانا محمد بن حسین جلال الدین رومی کے عشق کا نام ہے۔
مولویت مولانا عبد الرحمٰن جامی کے وجد کا نام ہے۔
مولویت حضرت سلطان باہو کے عارفانہ کلام کا نام ہے۔
مولویت خواجہ نظام الدین اولیاء کے تزکیہ نفس کا نام ہے۔
مولویت حضرت عبداللہ شاہ غازی کے پاک طینت کا نام ہے۔
مولویت حضرت خواجہ باقی باللہ کے گوہر دریائے ولایت کا نام ہے۔

مولویت مجدد الف ثانی کی جہد مسلسل کا نام ہے۔
مولویت شاہ عبدالرحیم کی توحید پرستی کا نام ہے۔
مولویت شاہ ولی اللہ کی فراست کا نام ہے۔
مولویت فرید الدین گنج شکر کی پابندی شریعت کا نام ہے۔
مولویت امیر خسرو کے ذوق طبع کا نام ہے۔
مولویت خواجہ غلام فرید کی صوفیانہ شاعری کا نام ہے۔
مولویت خواجہ نور محمد مہاروی کی روحانیت کا نام ہے۔
مولویت خواجہ تاج سرور کی عبادت و ریاضت کا نام ہے۔
مولویت خواجہ سلیمان کی نگاہ شفقت نام ہے۔
مولویت خواجہ شمس الدین سیالوی کی حق بیانی کا نام ہے۔
مولویت مولانا احمد رضاخان کی غیرت ایمانی کا نام ہے۔
مولویت علامہ فضل حق خیر آبادی کے جہاد کا نام ہے۔
مولویت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شوق حدیث کا نام ہے۔
مولویت محدث کچھو چھوی سید اشرف صمدانی کی فلاح و شاد کا نام ہے۔
مولویت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی دلیل سبیل کا نام ہے۔
مولویت مولونا نعیم الدین مراد آبادی کی تدریس کا نام ہے۔
مولویت میاں شیر محمد شرقپوری کی نظر عنائیت کا نام ہے۔
مولویت پیر مہر علی شاہ کی خدمت تحریک ختم نبوت کا نام ہے۔
مولویت مولانا امجد علی کی فقہی بصیرت کا نام ہے۔
مولویت پیر اسماعیل شاہ کی پابندی صوم و صلوۃ کا نام ہے۔
مولویت پیر جماعت علی شاہ کی سیاسی و مذہبی خدمات کا نام ہے۔
مولویت مولانا ضیاء الدین مدنی کے ذوق تصوف کا نام ہے۔
مولویت خواجہ قمرالدین سیالوی کی عجزو انکساری کا نام ہے۔
مولویت پیر طاہر علاؤ الدین گیلانی کے اوصاف کریمہ کا نام ہے۔
مولویت مفتی عزیز احمد قادری کی امامت کا نام ہے۔
مولویت مولانا عبدالغفور ہزاروی کی خطابت کا نام ہے۔
مولویت ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کی قرآن فہمی کا نام ہے۔

مولویت مفتی احمد یار خان کے علمی نکات کا نام ہے۔
مولویت مولانا سردار محمد کے عشق رسول کا نام ہے۔
مولویت سید جلال الدین شاہ کے تقویٰ کا نام ہے۔
مولویت سید ابو البرکات کے فتویٰ کا نام ہے۔
مولویت صاحبزادہ فیض الحسن کی فصاحت و بلاغت کا نام ہے۔
مولویت مولانا حامد علی خان کے شرم و حیاء کا نام ہے۔
مولویت غزالی زمان علامہ سید احمد سعید کاظمی کے علم و عمل کا نام ہے۔

حب درویشاں کلید جنت است
دشمن ایشاں سزا وار لعنت است"

"نیا کا ناخدا:"

بنیاد پرست خود کو معاشرہ کی نیا کا ناخدا جانتا ہے مگر ناخدائی والے اوصاف سے محروم ہوتا ہے ادھر اس کے پاس معاشرہ کو دینے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جدید علوم سے بے بہرہ ہوتا ہے' عوام کے مسائل اور الجھنیں سلجھانے والی بصیرت سے عاری ہوتا ہے۔ اسے عصری تقاضوں اور ان کے نتیجہ میں معرض وجود میں آنے والی سماجی تبدیلیوں اور پھر ان تبدیلیوں کے افراد پر عمرانی اور نفسیاتی اثرات کا بھی شعور نہیں ہوتا لیکن اس نے قائدانہ کردار بھی ہر قیمت پر ادا کرنا ہے لہٰذا وہ نواہی کی حقیقی اور مفروضہ فہرست کی صورت میں افراد کی شخصی آزادی کے درپے ہوتا ہے اور اسی سے اس میں اور افراد میں تناؤ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ اسے دینی فریضہ اور قومی خدمت گردانتا ہے مگر اس ضمن میں یہ امر فراموش کر دیتا ہے کہ جرم کی سزا ملکی قانون نے دینی ہے اور گناہ کی سزا خدا نے۔ مگر وہ یہ سب بھول کر لباس' خوراک' تفریح' معاشرت وغیرہ کو ہدف بناتا ہے۔ "پاس" کسی کو نہیں کرتا سب کو "فیل" کئے جاتا ہے اور اشیاء کو متروک قرار دیتا ہے مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ رد کردہ اشیاء بعد میں قبول عام کی سند بھی حاصل کر لیتی ہیں۔ آج ہر دینی راہنما کی رنگین تصویر اخبارات میں چھپتی ہے نصف صدی پیشتر تصویر اتروانا حرام تھا ایسی لا تعداد مثالوں سے کتب فتاویٰ بھری ملیں گی۔

بنیاد پرست اور عوام میں خلیج کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ ہمیشہ شخصی آزادی میں مخل ہوتا ہے۔ انسان ایک حد تک تو یہ کرو! یہ نہ کرو! سن سکتا ہے اس کے بعد اس کا جی اوبھنے لگتا ہے۔ بنیاد پرست اس خلیج کو کم کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ معاشرہ کے اجتماعی مسائل

پر توجہ دے۔ کیا کبھی کسی مسجد کے ملا نے علاقہ کے سمگلر' بلیک مارکیٹر' منشیات فروش' گراں فروش' آوارہ یا بد کردار کے خلاف جمعہ کے خطبہ میں بات کی ہے؟ گر یہ نہیں تو بابا باقی کہانیاں ہیں!

پاکستانی معاشرہ میں جرائم کا جو عالم ہے اسے بطور خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں جعلی ادویات' ملاوٹ' سمگلنگ' منشیات کا دھندا' بچوں' عورتوں کا اغوا' قتل' چوری' ڈکیتی' دفاتر میں سفارش' رشوت' سیاست دانوں کی کرپشن' حکام کی نا اہلی الغرض! کس کس بات کا رونا رویئے روزنامہ جنگ (31 دسمبر 1993ء) سے چند منہ بولتے اعداد و شمار پیش ہیں:

جنوری سے لے کر اگست 1993ء تک پنجاب میں 13566 جرائم ہوئے (1992ء میں ان کی تعداد 15092 تھی) اسی عرصہ میں قتل: 388 (1992ء میں 320) اقدام قتل :535 (1992ء میں: 578) بچوں پر جنسی تشدد: 916 (1992ء میں :458) چوری کی وارداتیں: 3020 (1992ء میں: 3100) منشیات کے کیس: 2357 (1992ء میں: 3172)— قیاس کن زگلستان من بہار مرا!

متنوع جرائم کی موجودگی میں مذہب نما سیاسی جماعتوں نے کیا موقف اختیار کیا اس کا اندازہ روزنامہ جنگ (30 دسمبر 1993ء) کی سہ کالمی سرخیوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

"سال نو کا جشن منانے والوں کے دماغ ڈنڈے مار مار کر درست کر دیں گے: دینی جماعتوں کی دھمکی — مختلف ہوٹلوں اور اہم مقامات پر لٹھ بردار ٹیموں کو تعینات کیا جائے گا۔ جشن کی تمام تقریبات زبردستی روکیں گے' جمعیت علماء اسلام اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں کے بیانات۔"

میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتا کہ جنگ کے کارٹونسٹ جاوید اقبال نے 2 جنوری 1994ء کے کارٹون میں عوامی جذبات کی ترجمانی کر دی ہے۔

"کیدو یا کھل نائیک:"

طویل عرصہ پر محیط بنیاد پرستانہ رویہ کے علمی تناظر اور فکری پس منظر کے نقوش کم سے کم الفاظ میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ جائزہ خاصہ تشنہ اور مجمل ہے۔ تاہم اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ فلسفہ' منطق' سائنس اور خدا' مذہب' عقاید کی چپقلش کے لحاظ سے مغربی ممالک اور اسلامی مملکتوں میں تصور خدا کے اساسی اختلاف (توحید بمقابلہ تثلیث) سے جنم لینے والے مخصوص تصورات اور عقاید میں اختلافات کے باوجود ایک رویہ دونوں میں مشترک رہا ہے کہ روایت شکنی اور مسلمات

سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ "حسن سلوک" میں کسی طرح کی رعایت روا نہ رکھی گئی۔ وہ مسیحی عقوبت خانے ہوں یا مسلم زندان۔۔ عقیدہ کی بنیاد میں استحکام کے معاملہ میں نرمی کسی نے بھی نہ برتی۔ مجھے تو یہ رویہ عالمی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے کہ تاریخ انسانی کے ہر عہد میں روشنی اور تاریکی کا معرکہ جاری رہا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریکی کی زیادتی اور غلبہ کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں روشنی کی ننھی سی کرن اپنے وجود کا اثبات کرتی نظر آ ہی جاتی ہے۔

بنیاد پرستی کی اصطلاح نسبتاً نئی سہی لیکن اس رویہ سے وابستہ تصورات، جذبات و احساسات عالمی ہیں اور یہ سب اتنے ہی قدیم اور مستحکم ہیں جتنا کہ خود مذہب۔ ہاں! نام بدلتے ہیں پوپ، پادری، برہمن، مہا پجاری حتیٰ کہ قدیم معاشروں اور غیر متمدن قبائل کے کاہن، ساحر، جادوگر اور ہمارا ملا، مولوی، مفتی اور فتویٰ ساز۔۔۔ یہ سب کے سب نام اور حلیے کے اختلاف کے باوجود ہر معاشرہ کے جانے پہچانے کردار بھی ہیں اور مشترک کرداری خصائص کے حامل بھی۔ یعنی محافظ عقیدہ! بحیثیت مجموعی ایسے اصحاب زندگی کی "ہیر" میں کیدو کا کردار ادا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ خود کیدو ہیر کا خواستگار نہیں لہذا وہ روایتی مفہوم میں ویلن نہیں وہ تو خود کو معاشرہ کے مسلمات کا محافظ اور اخلاقی اقدار کا داعی سمجھتا ہے۔ بنیاد پرست معاشرہ کا "کھل نائیک" نہیں اپنی دانست میں وہ یہ سب کچھ معاشرہ کی بہبود، سماج کی فلاح اور اخلاقی اقدار کے اثبات کے لیے کرتا ہے۔ ہم اس کا طرز عمل پسند نہ کریں لیکن اس کے خلوص اور نیت پر شبہ نہیں!

"خاتمہ بالخیر:"

بنیاد پرستی سے وابستہ اہم، اساسی اور مروج امور مختصر ترین الفاظ میں یوں سمیٹے جا سکتے ہیں۔

1- بنیاد پرست کون؟ ۔۔۔ علمی حقائق اور منطق کے برعکس سوچ، بے لچک ضدی، طرز کہن پہ اڑنا، مسلمات اور کہنہ روایات کا پرچم بلند کرنا، ماضی پرستی، حقائق کو تحقیق کے برعکس ذاتی معیار کی کسوٹی پر پرکھنا۔

2- بنیاد پرستی کی قوت: ۔۔۔ خرد دشمنی پر مبنی غیر عقلی اور جامد تصورات، پدرم سلطان بود

3- بنیاد پرستی کی منطق: ۔۔۔ استخراجی۔ بلا تحقیق مسلمات کی حقانیت پر اصرار، ماضی سے حصول سند، ہمیشہ خود کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھنا۔

4- بنیاد پرست کے خوف : — اجتہاد، آئین نو، عقلی علوم، سائنس، منطق، تحقیق، تصورات نو۔

5- بنیاد پرستی کے ہتھیار : — فروعی مسائل پر اختلاف، باہمی نفاق، تاویل، فتویٰ، مقدس تشدد

6- بنیاد پرستی کی منزل : — ماضی کا احیاء، فکر نو کا سدباب، برعکس سوچ کے خلاف محاذ، اپنے مسلک کا ہر قیمت پر نفاذ

7- بنیاد پرست کی زبان : — قدیم مگر بوجھل حوالوں سے مملو، جذباتی (بعض اوقات ہیجانی) مگر غیر منطقی اسلوب، مخالفین کے لئے طعن و تشنیع اور دشنام، انگاروں بھری گفتگو

8- بنیاد پرست کا انعام : — اپنے لئے جنت، مخالفین کے لئے جنہم

9- بنیاد پرستی کا تریاق : فلسفہ، منطق، عقل، تصوف، سائنس، اجتہاد، تحقیق، جمہوری ادارے، آزادی عقیدہ و مسلک۔

حواشی:

1- کوائف انسائیکلوپیڈیا امیریکانہ / بریٹینکا سے ماخوذ

2- بحوالہ "دربار ملی" ص : 117

3- بقول مولانا مودودی :

"رہے حکمران تو وہ مسلمان ہونے کے باوجود اکثر و بیشتر مخصی معاملات تک میں تورہ چنگیزی کی پیروی کرتے تھے نہ کہ شریعت محمدی کی۔ ان کے غیر اسلامی رویے کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ مقریزی کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنی سلطنت میں قحبہ خانوں کے قیام کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور زنان بازاری پر ایک ٹیکس لگا دیا گیا تھا جس کی آمدنی "دولت اسلامیہ" کے خزانہ عامرہ میں داخل کی جاتی تھی۔"
(تجدید و احیائے دین ص : 74)

اس ضمن میں سید سلیمان ندوی کا یہ بیان بھی قابل توجہ ہے :

"امیر معاویہ نے (سنہ 46ھ) میں جب سسلی (اٹلی) پر حملہ کیا تو وہاں سے ان کو سونے کی اسٹیچو اور مجسمے ہاتھ آئے انہوں نے چاہا کہ نفس سونے کی مالیت کے علاوہ ان مجسموں اور اسٹیچوؤں کی ساخت اور صنعت کی قیمت بھی وصول ہو چنانچہ انہوں نے ہندوستان بھیج کر ان کو فروخت کرنا چاہا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور اس پر عمل نہ ہوا لیکن بیرونی کا بیان ہے کہ وہاں لائے گئے اور بیچے گئے غالباً بیرونی کے اس بیان کا ماخذ واقدی کی روایت ہو جس کو بلاذری نے بھی فتوح البلدان میں نقل کیا ہے۔" ("عرب و ہند کے تعلقات" ص : 208)

4- ایضاً ص : 154- 136

5- بحوالہ " تاریخ اور فرقہ واریت" مرتبہ : ڈاکٹر مبارک علی ص : 52

6- محمد اکرام، شیخ "رود کوثر" ص : 360

7- ایضاً ص : 72

8- "ارمان اور حقیقت" ص : 188

9- مقالہ بعنوان "روشن خیالی اور اردو ادب میں اس کی روایت" مطبوعہ - فنون سالنامہ 1991ء

7- "فساد فی سبیل اللہ!"

"اقبال اور ملا:"

علامہ اقبال کی ملا دشمنی ڈھکی چھپی نہیں۔ علامہ اقبال کے شاعرانہ اسلوب میں جمال اور جلال کا عجب فن کارانہ امتزاج ملتا ہے لیکن ملا کے تذکرہ میں اقبال کے لہجہ میں عجب خشونت بھر جاتی ہے اور وہ تلخ اسلوب میں یوں گویا ہوتا ہے:

دل ملا گرفتار غمے نیست
نگاہش ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتب او
کہ در ریگ حجاز زمزمے نیست
سر منبر کلامش نیش دار است
کہ او راصد کتاب اندر کنار است
حضور تو من از خجلت نہ گفتم
ز خود پنہاں و برما آشکار است

ان اشعار کے ساتھ خلیفہ عبدالحکیم کی اس بات کو بھی شامل کر لیں تو اقبال کی ملا سے نفرت اور بھی واضح ہو جاتی ہے:

"علامہ اقبال ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ اکثر پیشہ ور ملا عملاً اسلام کے منکر، اس کی تشریعت کے منحرف اور مادہ پرست دھریہ ہوتے ہیں"(۱)

اس لیے اگر اقبال نے ملا کے لیے یہ کچھ کہا تو غلط نہ تھا:

دین حق از کافری رسواتر است
زانکہ ملا مومن کافر گر است
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد
ملت از قال و اقولش فرد فرد

دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

ابلیس نے خدا کی حکم عدولی کی۔ راندۂ درگاہ قرار پایا۔ خلق خدا کو گمراہ کرنے کا عزم کیا' دائمی لعن کا مستوجب قرار دیا گیا' آدم حوا کو بہکایا جنت سے نکلوایا اور آج بھی ہمارے لیے دانہ گندم' سیب یا سانپ کی صورت میں سامان ترغیب پیدا کرتا ہے مگر علامہ اقبال نے عام مسلمانوں کی روش کے برعکس ابلیس کو مقہور قرار دینے کے برعکس سے "خواجہ اہل فرق" قرار دے کر جو اشعار کہے ان میں عجب و الہانہ پن ملتا ہے۔ جبرئیل کے اس سوال پر:

ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو؟

ابلیس جو جواب دیتا ہے وہ نہ صرف خود ابلیس کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کا جامع ہے بلکہ دیکھا جائے تو خود علامہ کا تمام فلسفہ عمل بھی اسی ایک مصرع کے کوزہ میں سما جاتا ہے:

سوز و ساز و درد و داغ جستجوے و آرزو!

میں علامہ کے تصور ابلیس پر مقالہ قلم بند نہیں کر رہا اس لیے اس کی وضاحت یا بطور مثال اشعار پیش نہیں کر رہا۔ میں تو دراصل اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ مومنین کو صراط مستقیم سے بھٹکانے والے' خدا کے باغی اور راندہ خلائق ابلیس کے لیے تو اقبال سراپا سپاس اور اس کے غیر مشروط مداح ہیں لیکن پانچ وقت مومنین کو صراط مستقیم کی جانب بلانے والے' ہر وقت خدا کا نام لینے والے اور اسلام اسلام کی پکار کرنے والے ملا کے لیے اقبال کے پاس صرف تحقیر کے اور کچھ بھی نہیں:

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے
وہ رمز شوق کہ پوشیدہ لا الہ میں ہے
طریق شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہئے
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے میری سحر کا پیام

اقبال اس سے بڑھ کر ملا کے بارے میں اور کیا کہہ سکتے تھے کہ نظم "حال و مقام" میں اسے کرگس قرار دے دیا:

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

مزید ملاحظہ ہو نظم "ملا اور بہشت۔" مجھے اس پر تعجب ہے علامہ نے ابلیس اور ملا کی صورت میں حرکت اور جمود، عمل اور بے عملی، گرمی اور ٹھنڈک، قوت کردار اور فقدان کردار، تخلیقی شخصیت اور غیر تخلیقی شخصیت، خود داری اور عیاری، حسن ذات اور قبح ذات، جرات اظہار اور خوف اظہار، آزادی کردار اور خوئے غلامی، چشم باطن بین اور چشم خارج بین۔ الغرض! مومن اور ملا کی ثنویت کو کیوں اجاگر نہ کیا حالانکہ اقبال کے فلسفہ عمل اور جدوجہد کی رو سے ابلیس کی ضد مومن نہیں بلکہ ملا قرار پاتا ہے۔

"تیسری دہائی:"

ماضی پر نگاہ ڈالنے پر رواں صدی کی تیسری دہائی انقلاب آفریں و توقعات کی حامل نظر آتی ہے ایسے وقوعات جنھوں نے برصغیر کے افراد کو سیاسی، تہذیبی اور تخلیقی تبدیلیوں سے روشناس کیا، ایسے تغیرات کہ نہ صرف برصغیر کا نقشہ تبدیل ہو گیا بلکہ انداز زیست بھی انقلاب آشنا ہو گیا۔ 1930ء میں علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد — 1931ء میں پہلی ناطق فلم "عالم آرا" — 1935ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی کی نشریات — 1936ء میں ترقی پسند تحریک — 1938ء میں علامہ اقبال کا انتقال — 1939ء میں جنگ عظیم دوم کا آغاز۔

اس وقت کسی کو یہ اندازہ نہ ہو گا کہ فلم، ریڈیو (اور بعد میں "ٹیلی ویژن") کتنے طاقتور میڈیم ثابت ہوں گے۔ اگرچہ پہلے یہ انگریزوں اور اب پاکستانی حکمرانوں کی شخصیت سازی اور اسی تناسب سے سیاسی مخالفین کی کردار کشی کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں اس لیے ان خانہ زاد میڈیم سے تصورات ذ، خرد آگہی اور روشن خیالی کے فروغ کی توقع ہی نہ ہونی چاہیے۔ تاہم یہ بھی ایک مثبت نکتہ ہے کہ تفریح کے نام ہی پر سہی ان سے جذبات شناسی کا درس تو ملا خواہ وہ کتنا گلیمرس ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح بعض اوقات کیتھارسس بھی ہو جاتا ہے خواہ وہ کتنا خام ہی کیوں نہ ہو۔

علامہ اقبال کے خطبہ، تحریک پاکستان اور جنگ عظیم کے اثرات سے سبھی آگاہ ہیں اور ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک بنیادی طور پر احتجاج کی تحریک تھی

جس نے جامد معاشرہ میں ذہنی تحرک پیدا کیا' تخلیقی سطح پر اظہار پا کر فکر نو کے چراغ فروزاں کیے۔ اندھی مذہبیت' بے معنی روحانیت اور جامد فکر کو ہدف بنایا۔ غیر عقلی اور غیر سائنسی شعور کی تکذیب کی اور خرد افروزی کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کو شعار بنایا۔ یہ تحریک نصف صدی سے زائد کا سفر طے کر چکی ہے اور پاکستان میں تنظیمی طور پر فعال نہ ہونے کے باوجود بھی فکری سطح پر زندہ اور تخلیقی سطح پر فعال ہے۔

"کریلے کی نیم:"

سودا کا عجب مصرع ہے:

غارت کرے ہے ملک کو فرقہ سپاہ کا!

پاکستان میں ضیا کی عسکری آمریت' روشن خیالی، عقلی رویوں میں عدم استحکام' سائنس اور فلسفہ کے عدم فروغ' آزادی تحریر و تقریر پر قدغنوں کے ساتھ ساتھ مذہبی تنگ نظری' فکری کوتاہ بینی' عقائد میں جبریت اور مذہب نما سیاسی جماعتوں کے فروغ کے لحاظ سے زرخیز ثابت ہوئی۔ اس عسکری عہد حکومت میں صحیح معنوں میں ملا کا کریلا ضیاء کی نیم چڑھا جس کے نتیجہ میں غیر عقلی رویوں کا کلٹ بنا لیا گیا۔ علامہ اقبال کے افکار کی صرف ایک خاص نقطۂ نظر سے ترویج کی گئی۔ یعنی نفی عقل کے اشعار کی تشہیر کی گئی اور ملائیت کو ہدف بنانے والے اشعار سے صرف نظر کر کے افکار اقبال سے حسب منشا جوازات حاصل کئے گئے۔ احتساب اور زبان بندی کی اس فضا نے جس کی ایسی کیفیت پیدا کی کہ الامان! ایسے میں تخلیق کاروں اور شعراء نے اظہار کے لیے غزل کے قدیم استعاروں کو جبر و احتساب کے تناظر میں نئے معانی اور مفاہیم میں یوں استعمال کیا کہ پیش پا افتادہ تشبیہات چھپا انھیں اور مردہ استعارے جی اٹھے۔ چنانچہ قفس' صیاد' بہار' خزاں' نشیمن' دار و رسن محتسب' واعظ' شیخ' راہنما وغیرہ کے ساتھ واقعات کربلا نے بھی جور و ستم کے اظہار کے لیے معانی کی نئی جہات سے مملو الفاظ فراہم کیے جس کے نتیجہ میں حسین' یزید' کربلا' گرمی' پیاس' خیمہ' شام غریباں جیسے الفاظ عہد ستم کے لیے بلیغ استعاروں میں تبدیل ہو گئے۔

الغرض! ضیا نے علامہ اقبال کی اس بات کی عملاً نفی کر دی — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی! شاید اسی لیے فرزند اقبال کو یہ کہنا پڑا:

بادشاہت یا آمریت کے دور میں سلطان' ملا اور پیر پرستی کو فروغ ملتا ہے ضیاالحق کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا اس دور میں جو قوانین بنے وہ غیر اسلامی ہیں۔"

(روزنامہ جنگ لاہور۔ 29 مئی 1994ء)

الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے سے اس اخلاقی اور روحانی فضا کا مصنوعی تاثر پیدا کرنے کی سعی کی گئی جس کا پاکستانی افراد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، جبکہ علماء و مشائخ کانفرنسوں اور نعت اور حسن قرات کی محافل کے ذریعہ سے پاکستان کے دینی مملکت ہونے کا کاذب تاثر پیش کیا گیا۔ صحافی اور دانش ور خریدے گئے یا ان کی زبان بندی کی گئی۔ مذہب نما سیاسی جماعتوں نے طلبہ کے ذریعہ سے درس گاہوں کی تعلیمی فضا کو ایسا خراب کیا کہ اب تک حالات نہ سدھر سکے اور پھر ان سب پر مستزاد اسلام کے نام پر اپنا ریفرنڈم—— کرسی کے استحکام کے لیے کیے گئے احکام کے نتیجہ میں عوام کے اکثریت کے لیے اسلام محض ضیا کا تخلص قرار پایا اور بحثیت مجموعی وہ حال ہو گیا کہ کذب و افتراء اور جھوٹ اور منافقت پاکستان کا ٹریڈ مارک قرار پا گئے۔ اگرچہ علماء کی تقریروں میں پاکستان اسلام کا قلعہ نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آٹے میں ... برابر ہی ایسے حضرات نکلیں گے جو صحیح معنوں میں اسلام کے اصولوں اور قرآن مجید کے ارفع کرداری معیار کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔

”ظالمو! یہ کیا کیا؟“

آمریت اور غیر جمہوری قوتوں کا ساتھ دینے کی پاداش مین مذہب نما سیاسی جماعتوں کا عوام کی اکثریت سے رشتہ منقطع ہو گیا۔ لوگوں کا مسئلہ بھوک، ناداری، بیکاری، معاشرہ میں احساس تحفظ اور عزت نفس ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن کی "عریانی" اور فلموں کی "فحاشی" یا وی سی آر اور ڈش انٹینا نہیں ہوتا۔ اس لیے 1993ء کے عام انتخابات میں مذہب نما سیاسی جماعتوں اور ان کے توسط سے ملایت اور بنیاد پرستی کو مسترد کر دیا گیا——

ڈیڑھ سو سال کے ذہنی، تہذیبی، ثقافتی، تخلیقی، سیاسی اور مذہبی رویوں کا مختصر ترین الفاظ میں خلاصہ پیش کیا گیا۔ تفصیلات سے اس لیے گریز کیا گیا کہ اہل علم آگاہ ہیں۔ مزید برآں ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے!

”خود بن گئے ڈر کی صورت:“

بطور ادارہ ملایت یا بطور منصب ملا، خطیب، پیش امام یا موذن کا مذہبی جواز نہیں ملتا۔ ہمارے معاشرہ میں ملا واحد شخص ہے جو نہ خود کماتا ہے نہ ٹیکس ادا کرتا ہے، گاؤں میں چودہری اور زمیندار کی عنایات اور شہر میں اہل محلہ پر گزارا کرتا ہے۔ ہم گداگر کو پیرا

سائٹ سمجھ کر اس کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ وہ بارہ سولہ گھنٹے ہاتھ پھیلاتا ہے' کچھ نہ دیں تو دعا دیتا ہے' دھتکار دیں تو بھی دعا دیتا ہے' تلخ لبوں سے گالیاں سن کر بے مزہ ہونے کے بجائے دعا دیتا ہے' یوں دیکھیں تو بھکاریوں کی اکثریت اعلیٰ گریڈ کے لا تعداد سرکاری افسروں اور سہولت یافتہ اعلیٰ حکام کے مقابلہ میں زیادہ خلوص' لگن اور محبت سے پیشہ ورانہ مصروفیات بجا لاتی ہے۔ اس لیے میں بھکاریوں کی بہت عزت کرتا ہوں اور اسی سے ملا کی سائیکی کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ معاشرہ کا سب سے زیادہ غیر پیداواری حصہ (Un Prouctive Unit) ہے اسے بھی اس کا علم ہے کہ اکثریت کے لیے میں ضروری شر کے بجائے غیر ضروری شر ہوں۔ اب وہ خود کو کیسے منوائے؟ اپنے ہونے کا کیسے احساس کرائے؟ اس کام کے لیے وہ معاشرہ کو خوف میں مبتلا کرتا ہے اس مقصد کے لیے اس کے پاس سب سے بڑا ہتھیار مذہب ہے جسے وہ بے دریغ استعمال کرتا ہے۔

میں اس کتاب کے لکھنے کے دوران لاہور کی مختلف مساجد میں نماز جمعہ کے خطبات سنتا رہا۔ مجھے ایسی کوئی مسجد یاد نہیں جس کے خطیب محترم نے جمال خداوندی کی بات کی ہو۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے لطیف گوشے اجاگر کیے ہوں اور اسلام کے حوالہ سے کوئی نرم اور خوبصورت بات کی ہو۔ سب کے سب جوالا مکھی نظر آئے بقول مولانا حالی:

واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

اگر اب تک کے لکھے سے یہ محسوس ہو رہا ہو کہ میں ملا کے خلاف ہوں تو ایسا ہرگز نہیں اس لیے کہ اپنے مسلک میں یہ نیک نیت اور پر خلوص ہوتا ہے' معاشرہ میں امر و نہی کا شعور پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ عبدالقادر آزاد جیسے بیسویں گریڈ کے ملا کی استثنائی مثال سے قطع نظر گاؤں یا شہر کی چھوٹی مساجد کے ملا تو آج کی اقتصادیات میں پانچویں چھٹے گریڈ کے ملازم جیسی زندگی بسر کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے۔ معاشرہ میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ (اس ضمن میں احمد ندیم قاسمی کا شاہکار افسانہ "الحمد للہ" ملاحظہ کیجئے) وہ چاہتا ہے کہ صبح کی نماز میں مسجد نمازیوں سے پر ہو لیکن جب اذان دینے کو وضو کر رہا ہوتا ہے تو لوٹے ہم نشین پاتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ نعتوں کی کیسٹ چلاتا اور طویل تقریر کرتا ہے تو میں اسے حق بجانب سمجھتا ہوں۔ مگر شاعر نہیں سو بقول سودا:

ناصح تو آدمی ہو تو مانوں میں تیری بات

ناصح تو آدمی ہو تو مانوں میں تیری بات
حشرات کی طرح سے زمیں کا بخار ہے

"زشت خوئی:"

اکثریت ـــ سوائے اشفاق احمد ـــ کے ملا کو بوجوہ پسند نہیں کرتی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے ملا کا عمرانی کردار متعین کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اور نہ ہی ملا کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ حالی کے الفاظ میں صورت حال یہ کیوں ہے:

ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تری
آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

کیوں ـــ وہ اتنا تلخ نوا ہے' کیوں کسی کو ہنستا نہیں دیکھ سکتا' کیوں وہ اتنا تنگ نظر' متعصب' فرقہ پرست اور تفرقہ پسند ہے اور آخر کیوں وہ حالات حاضرہ سے بے خبر' علوم کی اہمیت کا منکر' کورانہ مقلد اور لکیر کا فقیر بنا رہتا ہے یہ کیسی کنڈیشننگ ہے کہ وہ عمر بھر منفی کے دائرہ میں اسیر رہتا ہے صوفیا نے ـــ میرا پیغام محبت ہے ـــ کے مصداق برصغیر میں حسن سیرت سے اسلام پھیلایا اور تمام تعصبات کے باوجود آج بھی بھارت میں ان کے مزار مرجع خلائق ہیں مگر ملا کا عالم تو بقول احمد ندیم قاسمی یہ ہے:

کاش واعظ نے محبت ہی سکھائی ہوتی
اور کیا کیجئے اللہ سے ڈرنے کے سوا

ملا کی پر خوری اور حلوہ پسندی کے لطیفے سنائے جاتے ہیں اور ان صراط مستقیم پر چلنے والوں میں سے اگر کبھی کبھار کوئی مدرسہ' حجرہ یا بیت الخلا میں "مستی" کا مظاہرہ کر بیٹھے تو ہمیں بہت برا لگتا ہے۔ کیوں؟

دراصل ملا کی شخصیت میں سے جسم اور اس کے تقاضے' اعصاب اور اس کا تناؤ' جبلتیں اور ان کے مطالبے اور جنس اور اس کی پکڑ کو منفی کر کے ملا کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ شاید وہ خود کو بھی ان سب سے معرا' آزاد اور پاک سمجھتا ہو۔ وہ زندگی کو حرام قرار دے کر خود کو مذہب کے اعلیٰ ترین کرداری معیار کا اہل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم سے غلطی اور خطا کا امکان ہے مگر ملا سے نہیں کہ وہ خود کو اور ہم بھی اسے بے داغ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا ملا ہونا اسی میں مضمر ہے اور اسی سے ملایت سے مخصوص نفسیات کا خاص پہلو جنم لیتا ہے۔ جب اس نے خود پر لذتیں حرام کر لیں تو وہ معاشرہ کو کیسے ان میں مبتلا دیکھ سکتا ہے۔ اس کی زشت خوئی اور تلخ نوائی مذہب کا تقاضہ نہیں کہ اسلام'

قرآن مجید اور احادیث میں کہیں بھی دشنامی اسلوب اور تلخ لہجے کی تلقین نہیں کی گئی۔ یہ تلخ نوائی نفیت (Negativity) کی پیدا کردہ ہوتی ہے جو صرف نہی، ممنوعات، قدغنوں اور ٹیبوز پر پلنے والی شخصیت پیدا کر سکتی ہے۔ جس طرح سکول ماسٹر بچوں کی پٹائی سے اعصابی تناؤ میں کمی محسوس کرتا ہے اسی طرح ملا بھی ذاتی محرومیوں اور نفیت کا مداوا تلخ نوائی اور زشت خوئی میں تلاش کرتا ہے۔ مائیک پر اس کا مذہبی غیظ و غضب، بد عقیدہ پر پھٹکار، معاشرہ کے ملحد عناصر پر لعن طعن اور بر عکس مسلک والوں کی تکفیر۔۔ یہ سب پہلے اعصابی آسودگی کے لیے ہوتا ہے پھر اس کی عادت سی ہو جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ یوں ملا کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ جفا کی ہو گئی خو امتحاں سے!

اشفاق احمد نے حسن رضوی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اپنے مخصوص اسلوب میں بات کرتے ہوئے کہا:

"۔۔ میں بنیاد پرست ہو نہیں سکتا۔ بنیاد پرست ہونے کے لئے پانچ چھ باتیں ضروری ہیں اس کے لئے سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ آپ سونے سے پہلے تحقیق کرلیں کہ آپ کا ہمسایہ بھوکا تو نہیں، دوسرے یہ کہ تحقیق کرلیں کہ آپ کی آمدنی میں سود تو شامل نہیں، تیسرے آپ کے چہرے پر دشمن سے بات کرتے وقت مسکراہٹ ہے کہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ بنیاد پرست ہیں ورنہ نہیں۔ اگر میں ان چیزوں پر عمل کر سکتا تو میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی لیکن بنیاد پرست ہونا کوئی آسان بات نہیں۔"

(روزنامہ جنگ لاہور 12 جولائی 1994ء)

— اشفاق احمد صاحب نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے کردار و عمل پر مبنی جس معیار کی بات کی ہے اس پر میں، آپ اور اشفاق احمد صاحب تو کجا پاکستان کا بڑے سے بڑا بنیاد پرست بھی پورا نہیں اتر سکتا بالخصوص تیسری شرط کے لحاظ سے — کہ بقول آتش:

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انساں ہووے
بت خانہ کھود ڈالئے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے

"آگ کی قینچیوں سے کٹنے والے ہونٹ":

"ترمذی شریف" سے حدیث رسول:

"حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا میں معراج کی رات ایسی جماعت کی طرف گزرا کہ جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے جبرائیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں انہوں نے کہا کہ یہ آپ کی امت کے وہ خطیب ہیں جو جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے۔"

اس حدیث پاک کی روشنی میں ارد گرد نظر دوڑائیں، مساجد سے ابھرنے والی آوازیں سنیں، مذہب نما سیاسی جماعتوں کے قائدین کی تقاریر پر غور کریں، مسلم جماعتوں کے طالب علم راہنماؤں کی گفتار پر توجہ دیں، اسلام اسلام کی رٹ لگانے والے قومی راہنماؤں کے بیانات کا تجزیہ کریں اور خود اپنے قول و فعل کا محاسبہ کریں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے— ماحول کی آلودگی کا رونا رونے والے صوتی آلودگی سے کیوں اتنے بے خبر ہیں۔

اسی حدیث مبارک کی روشنی میں ملا کا مطالعہ کریں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جائے عبادت کے بر عکس مسجد ملا کا قلعہ بن چکی ہے تو مائیک اس کا ہتھیار لہٰذا وہ اس قلعہ سے محمود غزنوی بن کر دین کے حقیقی، مفروضہ اور مبینہ دشمنوں پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔ عام لوگوں کا لاؤڈ سپیکر کے بارے میں جو رویہ ہے اس کا روزنامہ جنگ (لاہور: 2 جنوری 1994ء) کی اس خبر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی سرخی ہے۔ "مولوی کے نام چور کا خط":

"موڑ کھنڈا (نامہ نگار) چودہ سو سال سے عیسائی مبلغ جو نہ کر سکے وہ ہمارے علماء نے خود کر دکھایا اور مسلمان قوم کو اسلام مخالف قوتیں تقسیم نہ کر سکیں چودھویں صدی کے خود ساختہ علماء نے مسلمانوں کی عظیم قوم کو تقسیم کر دیا۔ خاص کر ان مولویوں نے مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے سیدھا رستہ دکھانے کی بجائے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا شروع کر رکھا ہے۔ یہ بات محمدی مسجد میں لاؤڈ سپیکروں کے 6 طاقتور یونٹ اتارنے والے چوروں نے ایک خط میں کہی، جس میں لکھا ہے کہ اب ہم امید رکھتے ہیں کہ دوسری مساجد کے مولوی صاحبان لاؤڈ سپیکروں کو تنقید کی بجائے تعمیری انداز میں استعمال کر کے لوگوں کو اسلام کے عین مطابق رستہ دکھائیں گے بصورت دیگر ہمیں اہل شہر کو

دوسرے سپیکروں سے بھی نجات دلانا پڑے گی۔"

اس خبر کے ساتھ علامہ اقبال کا یہ شعر ملا لیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے:

چناں نالیم اندر مسجد شہر
کہ دل در سینہ ملا گدازیم

اور یہ اشعار بھی علامہ اقبال ہی کے ہیں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

کون باقی نہیں؟ میں یا ملا؟

جبکہ علامہ اقبال سے کہیں پہلے سودا یہ کہہ گیا ہے:

شیخ جی کی بانگ و صلوٰۃ اوپر تو اے ناصح نہ جا
خانہ قصاب میں بھی روز و شب تکبیر ہے

جنگ (لاہور: 8 جنوری 1994ء) کی "مولویوں کی جنگ" کی سرخی کے ساتھ طبع ہونے والی یہ خبر بھی ملاحظہ کیجئے:

"سانگہ ہل (نامہ نگار) گزشتہ روز محلہ اقبال پور میں دو مختلف مسلکوں سے تعلق رکھنے والی مسجد کے خطیبوں میں ٹھن گئی۔ مولوی تجمل حسین طاہری نے مختلف گھروں کی چھتوں پر نصب 10 لاؤڈ سپیکر میں دوسرے مولوی سید امان اللہ بخاری کو چیلنج کیا کہ آؤ مل کر آگ میں بیٹھ جاتے ہیں یا کنویں میں کود جاتے ہیں جو صحیح سلامت رہا وہ سچا ہو گا۔ مولوی تجمل حسین نے مباہلہ کے لیے شہر میں اشتہار تقسیم کیے تھے مگر مولانا امان اللہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مقامی پولیس نے بر وقت مداخلت کر کے گھروں کی چھتوں سے لاؤڈ سپیکر اتروا دیئے شہر میں ناخوشگوار واقع پر تشویش پائی جا رہی ہے۔"

"انداز جفا:"

اب لاؤڈ سپیکر کا ذکر چلا ہے تو اس ضمن میں مجھ گنہگار کو خود کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اب اس صوتی آلودگی کے خلاف تو وہ حضرات بھی لب کشائی پر مجبور ہو گئے جو ہمارے بر عکس دین کی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ روزنامہ جنگ

(لاہور: 8 فروری 1994ء) میں مولانا محمد تقی عثمانی کے مضمون بعنوان "لاؤڈ سپیکر کا ظالمانہ استعمال" سے چند اقتباسات پیش ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی نے دلسوزی سے یہ مضمون قلم بند کر کے ان لاتعداد پاکستانیوں کے گوش نصیحت نیوش کی ترجمانی کی ہے جو اچھی بات تو سننا چاہتے ہیں مگر اس کے لیے اچھے اسلوب کے بھی متمنی ہیں نہ کہ لاؤڈ سپیکر کی سان پر چڑھی زبان کی کٹار!

مولانا محمد تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

" ظلم صرف یہ ہی نہیں ہے کہ کسی کا مال چھین لیا جائے اسے جسمانی تکلیف پہنچانے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا جائے بلکہ عربی زبان میں "ظلم" کی تعریف کی گئی ہے کہ "کسی بھی چیز کو بے جگہ استعمال کرنا ظلم ہے" چونکہ کسی چیز کا بے محل استعمال یقیناً کسی نہ کسی کو تکلیف پہنچانے کا موجب ہوتا ہے اس لیے ہر ایسا استعمال "ظلم" کی تعریف میں داخل ہے اور اگر اس سے کسی انسان کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ شرعی اعتبار سے گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس طرح کے بہت سے گناہ کبیرہ اس طرح رواج پا گئے ہیں کہ اب عام طور سے ان کے گناہ ہونے کا احساس بھی باقی نہیں رہا۔ "ایذا رسانی" کی ان بے شمار صورتوں میں سے ایک انتہائی تکلیف دہ صورت لاؤڈ سپیکر کا ظالمانہ استعمال ہے۔

اگر کوئی خالص اور مذہبی پروگرام ہو تو اس میں بھی لوگوں کو لاؤڈ سپیکر کے ذریعے زبردستی شریک کرنا شرعی اعتبار سے ہرگز جائز نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں سیاسی اور مذہبی پروگرام منعقد کرنے والے حضرات بھی شریعت کے اس اہم حکم کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ سیاسی مذہبی جلسوں کے لاؤڈ سپیکر بھی دور دور تک مار کرتے ہیں اور ان کی موجودگی میں کوئی شخص اپنے گھر میں نہ آرام سے سو سکتا ہے نہ یکسوئی کے ساتھ اپنا کوئی کام کر سکتا ہے۔ لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اذان کی آواز دور تک پہنچانا تو برحق ہے لیکن مسجدوں میں وعظ اور تقریریں یا ذکر و تلاوت لاؤڈ سپیکر پر ہوتی ہیں ان کی آواز دور دور تک پہنچانے کے لیے لاؤڈ سپیکر کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے یا صرف اندرونی ہارن سے باسانی کام چل سکتا ہے لیکن بیرونی لاؤڈ سپیکر پوری قوت سے کھلا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں یہ آواز محلے کے گھر گھر میں اس طرح پہنچتی ہے کہ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

بعض مسجدوں کے بارے میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہاں خالی مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر ٹیپ چلا دیا جاتا ہے۔ مسجد میں سننے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن پورے محلے کو یہ ٹیپ زبردستی سننا پڑتا ہے۔

دین کی صحیح فہم رکھنے والے اہل علم خواہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں کبھی یہ کام نہیں کر سکتے لیکن ایسا ان مسجدوں میں ہوتا ہے جہاں انتظام علم دین سے ناواقف حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ بسا اوقات یہ حضرات پوری نیک نیتی سے یہ کام کرتے ہیں۔ وہ اسے دین کی تبلیغ کا ایک ذریعہ سمجھتے اور اسے دین کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے میں یہ اصول بھی بہت غلط مشہور ہو گیا ہے کہ نیت کی اچھائی سے کوئی غلط کام بھی جائز اور صحیح ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی کام کے درست ہونے کے لیے صرف نیک نیتی ہی کافی نہیں اس کا طریقہ بھی درست ہونا ضروری ہے اور لاؤڈ سپیکر کا ایسا ظالمانہ استعمال نہ صرف یہ کہ دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے بلکہ اس کے الٹے نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ جن حضرات کو اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہو ان کی خدمت میں درد مندی اور دلسوزی کے ساتھ چند نکات ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

(1) مشہور محدث حضرت عمر بن شبہ نے مدینہ منورہ کی تاریخ پر چار جلدوں میں بڑی مفصل کتاب لکھی ہے جس کا حوالہ بڑے بڑے علماء و محدثین ہمیشہ دیتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک واقع اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک واعظ صاحب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے بالکل سامنے بہت بلند آواز سے وعظ کہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ زمانہ لاؤڈ سپیکر کا نہیں تھا لیکن ان کی آواز بہت بلند تھی اور اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یکسوئی میں فرق آتا تھا۔ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس لیے حضرت عائشہ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ یہ صاحب بلند آواز سے میرے گھر کے سامنے وعظ کہتے رہتے ہیں جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور مجھے کسی اور کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ حضرت عمر نے ان صاحب کو پیغام بھیج کر انہیں وہاں وعظ کہنے سے منع کیا لیکن کچھ عرصہ بعد واعظ صاحب نے دوبارہ وہی سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے خود جا کر ان صاحب کو پکڑا اور ان پر تعزیری سزا جاری کی (اخبار المدینہ العمر بن شبہ ص 15 ج 1)

(2) بات صرف یہ نہیں تھی کہ حضرت عائشہ اپنی تکلیف کا ازالہ کرنا چاہتی تھیں بلکہ دراصل وہ اسلامی معاشرے کے اس اصول کو واضح اور نافذ کرنا چاہتی تھیں کہ کسی کو کسی

سے کوئی تکلیف نہ پہنچے' نیز یہ بتانا چاہتی تھیں کہ دین کی دعوت و تبلیغ کا پر وقار طریقہ کیا ہے؟ چنانچہ امام احمد نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے مدینہ منورہ کے ایک واعظ کو وعظ و تبلیغ کے آداب تفصیل کے ساتھ بتائے اور ان آداب میں یہ بھی فرمایا کہ :

"اپنی آواز کو انہی لوگوں کی حد تک محدود رکھو جو تمہاری مجلس میں بیٹھے ہیں اور انہیں بھی اسی وقت تک دین کی باتیں سناؤ جب تک ان کے چہرے تمہاری طرف متوجہ ہوں۔ جب وہ چہرے پھیر لیں تو تم بھی رک جاؤ اور ایسا کبھی نہ ہونا چاہیے کہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں اور تم ان کی بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دو بلکہ ایسے موقع پر خاموش رہو پھر جب وہ تم سے فرمائش کریں تو انہیں دین کی بات سناؤ۔"

(مجمع الزوائد ص : 191 ج 1)

(3) حضرت عطاء بن ابی رباح بڑے اونچے درجے کے تابعین میں سے ہیں۔ علم تفسیر و حدیث میں ان کا مقام مسلم ہے ان کا مقولہ ہے کہ "عالم کو چاہیے کہ اس کی آواز اس کی اپنی مجلس سے آگے نہ بڑھے"

(ادب الاء ملاء والا ستملاء للسمانی ص 50)

(4) یہ سارے آداب درحقیقت خود حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے تعلیم فرمائے ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے وہ تہجد کی نماز میں بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ بلند آواز سے کیوں تلاوت کر رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں سوتے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی آواز کو تھوڑا سا پست کر دو (مشکوۃ ص : 107 ج 1)

اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو اپنے بستر سے آہستگی کے ساتھ اٹھتے تھے (تاکہ سونے والوں کی نیند خراب نہ ہو)۔

(5) انہی احادیث و آثار کی روشنی میں تمام فقہاء امت اس بات پر متفق ہیں کہ تہجد کی نماز میں اتنی بلند آواز سے تلاوت کرنا جس سے کسی کی نیند خراب ہو ہرگز جائز نہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر کی چھت پر بلند آواز سے تلاوت کرے جبکہ

لوگ سو رہے ہوں تو تلاوت کرنے والا گنہگار ہے (خلاصہ الفتاوی ص: 103 ج ا و شامی ص 403 ج ا و ص 444 ج ا) ایک مرتبہ ایک صاحب نے یہ سوال ایک استفتا کی صورت میں مرتب کیا تھا کہ بعض مساجد میں شبینے اور تراویح کی قرات لاؤڈ سپیکر پر اتنی بلند آواز سے کی جاتی ہے کہ اس سے محلے کی خواتین کے لیے گھروں میں نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے نیز جن مریض اور کمزور لوگوں کو علاجا" جلدی سونا ضروری ہو وہ سو نہیں سکتے اس کے علاوہ باہر کے لوگ قرآن کریم کی تلاوت ادب سے سننے پر قادر نہیں ہوتے اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلاوت کے دوران کوئی سجدے کی آیت آ جاتی ہے سننے والوں پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے اور یا تو ان کو پتہ ہی نہیں چلتا یا وہ وضو سے نہیں ہوتے اس لیے سجدہ نہیں کر سکتے اور بعد میں بھول ہو جاتی ہے۔ کیا ان حالات میں تراویح کے دوران بیرونی لاؤڈ سپیکر بلا ضرورت زور سے کھولنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ یہ فتویٰ ماہانہ ابلاغ کی محرم 1407ھ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے اس پر تمام مکاتیب فکر کے علماء متفق ہیں۔ مسجدوں اور دینی اجتماعات میں لاؤڈ سپیکر کے بے جا استعمال سے دین کی انتہائی غلط نمائندگی ہوتی ہے اور بعض مرتبہ تو یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ دین اور اہل دین ہی سے بیزار اور متنفر ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کی تکلیف محسوس کرتے ہیں مگر اس کی شکایت کرتے ہوئے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے دین و ایمان پر کوئی حرف نہ آ جائے۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے سامنے دین کی صحیح نمایندگی کرنا ہمارا فرض ہے"

مولانا محمد تقی کے اس شذرہ کے بعد 19 فروری 1994ء کے روزنامہ "جنگ" (لاہور) کا اداریہ بعنوان "مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا غیر ضروری استعمال" بھی ملاحظہ کیجئے:

"سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے "کرۂ ارض تباہی کے دھانے پر" کے موضوع پر منعقد کیے جانے والے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ عدالتیں مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا غیر ضروری استعمال روکنے کے لیے اپنا اصول بنا رہی ہیں۔

وطن عزیز میں مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا انتہائی بے دردی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ شہریوں کی بڑی تعداد ایک نوع کے ذہنی تشنج کے عالم میں ہے۔ فضا میں شور کی آلودگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس نے عوام کی سماعتوں اور ذہنوں کو بری طرح متاثر کر دیا ہے۔ مساجد میں لاؤڈ سپیکروں کی آواز کو اس قدر

دھیما رکھنے کے لیے قوانین موجود ہیں کہ ان کی آواز مساجد کی حدود سے باہر نہ جائے لیکن ان پر عمل در آمد محض اس لیے نہیں ہو پاتا کہ اسے مذہبی امور میں مداخلت سمجھ کر امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ کیا جائے۔ بچوں بیماروں اور طلباء پر لاؤڈ سپیکروں کے بے جا غیر ضروری استعمال سے جو بیت رہی ہے اس نے انہیں ایک کرب میں مبتلا کر دیا ہے ۔ قرآن کریم مومنوں کو اپنی آواز نیچی رکھنے کا حکم دیتے ہوئے گدھے کی آواز کو (اس کے انتہائی بلند ہونے کی وجہ سے) مکروہ قرار دیا ہے تو اس فرمان الہی کی موجودگی میں لاؤڈ سپیکر پر بے موقع پوری آواز سے کی جانے والی تقریروں اور چندہ مانگنے کی اپیلوں کو کس طرح پسندیدہ اور جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ عدالتوں نے اس نہایت حساس موضوع پر رہنما اصولوں کی تدوین کا آغاز کر کے ایک نہایت مستحسن اقدام کیا ہے۔ توقع کی جانی چاہیے کہ انہیں جلد از جلد تشکیل کے مرحلے تک پہنچایا جائے گا اور پھر اس پر پوری قوت سے عمل در آمد کروا کر قوم کی اس بڑی اذیت سے نجات دلائی جائے گی۔"

لارڈ سپیکر عوامی عدالت میں:"

"جنگ عوامی عدالت" میں لارڈ سپیکر کا مسئلہ پیش ہوا جس کی رپورٹنگ (جنگ لاہور 3 اپریل 1994ء) بلا تبصرہ پیش ہے:

"لاہور (جنگ عوامی عدالت رپورٹ) جنگ عوامی عدالت میں "مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال" کے سلسلہ میں تین رکنی جیوری نے وکلائے استغاثہ اور وکلائے صفائی کے دلائل سننے کے بعد اپنے متفقہ فیصلے میں کہا ہے کہ لاؤڈ سپیکر کے ناجائز استعمال کو ممنوع قرار دیا جائے اور مساجد کے اندر موجود لوگوں تک ہی آواز پہنچانے تک ہی لاؤڈ سپیکر کی اجازت کا جواز ہو سکتا ہے۔ اذان کے لئے لاؤڈ سپیکر استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا بھی ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ اذان کی حرمت برقرار رہے اور یہ شور میں تبدیل نہ ہو جائے۔ جنگ عوامی کی جیوری اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن سید افضل حیدر، مشیر وفاقی شرعی عدالت سید عبدالرحمٰن بخاری اور دانشور پروفیسر اصغر ندیم سید پر مشتمل تھی جبکہ پروگرام کی میزبانی کے فرائض اجمل ستار ملک اور اسلم جاوید نے انجام دیئے۔ جیوری نے اپنے فیصلے میں مزید کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ مساجد کے علاوہ لاؤڈ سپیکر کو دکاندار، سینما مالکان، تھیٹر سرکس، سیاسی مقاصد کی ترویج اور پبلک جگہوں پر بے جا استعمال کیا جاتا ہے جو کہ نہ

صرف قانون کی خلاف ورزی ہے بلکہ معاشرہ کے سکون کے خلاف گھناؤنا جرم ہے جس کو روکنا انتظامیہ اور حکومت کا فرض ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا ملکی تشخص کے حوالہ سے مختلف مساجد کی موجودگی میں یہ اجازت دی جا سکتی ہے کہ جس کا جی چاہے اور جہاں جی چاہے مذہبی منافرت پھیلانے اور لوگوں کو ایذا پہنچانے کے لئے لاؤڈ سپیکر کو استعمال کرتا رہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام نے حقوق العباد کو بڑی اہمیت دی ہے اور قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرنا اور انہیں پریشانیوں سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ سورۃ لقمان میں شور اور کرختگی کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے۔

قبل ازیں وکیل استغاثہ مسلم لیگ (ج) کے راہنما منیر احمد خان نے اپنے دلائل میں کہا کہ مساجد میں اذان اور خطبہ جمعہ کے علاوہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال غیر ضروری ہے اور اس کے ناجائز استعمال کی وجہ سے ملک میں مذہبی منافرت پھیلتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ لاؤڈ سپیکر پر دیہاتوں میں چندہ مانگنے اور نمبردار کی تعریف کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور کئی کم تعلیم یافتہ امام مسجد سپیکر پر کیسٹ لگا کر خود سو جاتے ہیں جبکہ پورا محلّہ جاگنے لگتا ہے۔ طلبہ اور مریضوں کو شدید مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ لاؤڈ سپیکر کے بے جا استعمال سے پیدا ہونے والے شور کی وجہ سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہو گیا ہے اور لوگوں کو کئی نفسیاتی و ذہنی بیماریاں لگ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لاؤڈ سپیکر کے ناجائز استعمال کی وجہ سے آج لوگوں نے مساجد کے نزدیک مکان لینا بند کر دیئے ہیں اور ان پلاٹوں اور مکانوں کی قیمت کم ہو گئی ہے جو کہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

وکیل استغاثہ رکن صوبائی اسمبلی پنجاب عبیداللہ شیخ نے اپنے دلائل میں کہا کہ آج ایک علاقہ میں چھ سے لے کر آٹھ تک مساجد موجود ہیں اور ہر مسجد میں آٹھ آٹھ سپیکر آویزاں ہیں جب انہیں یکدم کھولا جاتا ہے تو طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج لاؤڈ سپیکر کے بے جا استعمال کی وجہ سے کئی بڑے بڑے علماء اور سکالروں کی باتوں کو بھی لوگ اہمیت نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا کہ لوگ جمعُہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے اپنے گھروں میں بیٹھ کر مولوی صاحب کی تقریر ختم ہونے کا انتظار کرتے ہیں اور جونہی ان کی تقریر ختم ہوتی ہے مسجد نمازیوں سے بھر جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ غریب مزدور لوگ جب اپنی روزی کمانے کے بعد تھکے ہارے رات کو دو بجے گھر پہنچتے ہیں تو انہیں آرام نصیب نہیں ہوتا۔ لاؤڈ سپیکر کے بے جا استعمال کے حوالہ سے قانون موجود ہے مگر اس پر عملدرآمد نہیں ہو رہا۔ انہوں نے کہا کہ کئی مرتبہ دوسرے فرقہ کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں

کرنے کی وجہ سے محلوں میں فائرنگ کر دی جاتی ہے اور کئی بے گناہ مسلمان مرے اور زخمی کر دیئے جاتے ہیں۔

وکیل صفائی ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل) لاہور سجاد احمد نے اپنے دلائل میں کہا کہ لاؤڈ سپیکر کے استعمال کا مسئلہ سادہ نہیں ہے بلکہ اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں جنہیں حل کرنے کے لئے ہم سب کے اوپر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وکیل صفائی مولانا محمد صدیق ہزاروی نے اپنے دلائل میں کہا کہ یہ غلط تاثر ہے کہ لوگ لاؤڈ سپیکر کے کثرت استعمال کی وجہ سے مساجد میں نہیں آتے۔ اس کی اور وجوہات ہیں اور لوگ شاید اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آ سکتے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ساری ساری رات جاری رہنے والے سیاسی جلسوں میں سینکڑوں لاؤڈ سپیکروں کی وجہ سے عوام کا کوئی حرج نہیں ہوتا مگر مسجد کے لاؤڈ سپیکروں کی وجہ سے ان میں بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دراصل لوگ اب ساری راتیں وی سی آر اور دیگر پروگرام دیکھ کر صبح سوتے ہیں اس لیے اذان اور تلاوت کی آواز سے ان کے آرام میں خلل آتا ہے اور وہ تنگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پتنگ بازی میں ساری رات ہلڑ بازی کی جاتی ہے مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا لیکن علماء کے وعظ کی مخالفت کی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا نظریہ ہے کہ لاؤڈ سپیکر کا بے جا استعمال نہیں ہونا چاہیے لیکن اس کا استعمال بہت ضروری ہے کیونکہ ہماری خواتین جو مسجد میں نہیں آ سکتیں وہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر دینی مسائل کو سن کر استفادہ کر سکتی ہیں۔

وکیل صفائی خطیب جامعہ الحبیب سانده مولانا عبدالواحد قریشی نے اپنے دلائل میں کہا کہ لاؤڈ سپیکر کے غیر ضروری استعمال کا اصل جرم تعلیم کی کمی ہے اور کم تعلیم یافتہ طبقہ کسی بھی جگہ جرم کر لیتا ہے اس لیے مساجد میں دینی تعلیم یافتہ افراد کو امام مقرر کیا جائے نہ کہ لاؤڈ سپیکر کو ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ وعظ سن کر کئی لوگ ہمارے پاس آتے ہیں جنہیں غسل اور وضو کا طریقہ بھی نہیں آتا تھا انہوں نے کہا کہ لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے کے لئے دور تک آواز پہنچانا ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کئی مریض سپیکر کے ذریعہ روحانی غذا حاصل کر کے بہتر ہو جائیں اور انہیں شفاء مل جائے۔

وکیل صفائی شیعہ عالم دین مولانا ظفر علی رائے نے اپنے دلائل میں کہا کہ پیغام الہٰی کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال ضروری ہے البتہ اس کے استعمال کے

حوالہ سے بات ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک مذہبی منافرت پھیلانے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں صرف لاؤڈ سپیکر ہی نہیں بلکہ اخبارات اور ریڈیو بھی مذہبی و سیاسی منافرت پھیلاتے ہیں اور لوگ اس سے تنگ آ چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لاؤڈ سپیکر کو مورد الزام ٹھہرانا جاہلانہ بات ہے۔ افراد گناہ گار ہو سکتے ہیں آلات کبھی قصور وار نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ انسانی فطرت ہے کہ اسے مکروہ آواز سے تکلیف ہوتی ہے جبکہ خوش الحانی سے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ لوگ داد بھی دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر اس وقت مکمل پابندی لگنی چاہئے جب تبلیغ اسلام کے لئے دوسرا متبادل نظام مہیا کر دیا جائے۔"

عبدالقادر حسن معروف کالم نگار ہیں۔ وہ 4 جون 1994ء کے جنگ میں رقم طراز ہیں:

"مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کا مسرفانہ استعمال کے عروج کا زمانہ ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ مولوی صاحب تو بند حجرے میں خراٹے لے رہے ہوتے تھے لیکن لاؤڈ سپیکر آن رہتا تھا اور اس پر تقریروں کے ٹیپ چل رہے ہوتے تھے۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ راتوں کو جو تھوڑا بہت سکون کسی کے حصے میں آ سکتا تھا وہ بھی غارت ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ گھروں میں نماز ادا کرنے والوں کو نماز کی عبارتیں بھول جاتی تھیں حالانکہ نماز اس قدر ازبر ہوتی ہے کہ یہ بے خیالی میں بھی درست پڑھی جا سکتی ہے لیکن آپ کے کانوں میں کچھ اور انڈیلا جا رہا ہو تو نماز بھی بھول سکتی ہے۔ آج بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔

یہ لاؤڈ سپیکر جو کسی مسجد کی تعمیر سے پہلے ہی خرید لیا جاتا ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مسجد ہمیشہ زیر تعمیر رہتی ہے ایک زمانے میں ہمارے علماء کے نزدیک ناجائز تھا اور اس کا استعمال حرام تصور ہوتا تھا۔ کاش کہ علماء کرام اپنے اس مفید فتویٰ سے رجوع نہ کرتے لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ کسی مسجد کا پتہ ہی لاؤڈ سپیکر سے ملتا ہے جو اس کے میناروں پر اتنی بڑی تعداد میں آویزاں ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہی خوف آنے لگتا ہے جب تمام ہارن چالو ہو جاتے ہیں تو خوف و دہشت کا آپ خود ہی اندازہ کر لیں۔ غلاظت ایک تو گلی کوچوں میں پڑی ہوئی ملتی دوسرا شور بھی پلوشن کا بہت بڑا سبب ہے اور اس سے انسان چڑ چڑا ہو جاتا ہے بلکہ حکیم سعید صاحب کے بقول شور سے خون میں کلیسٹرول بڑھ جاتا ہے جو دل کی بیماری کا سبب ہے۔ قرآن و حدیث سے لاؤڈ سپیکر کے بارے میں کوئی ہدائت تو نہیں مل سکتی کہ اس زمانے میں یہ اذیت موجود نہیں تھی لیکن شریعت میں احترام

انسان کی جو سہولیات ملتی ہیں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے آرام و سکون کا خیال رکھنے کی جو روائت ملتی ہے اس کے مطابق تو کسی دروازے پر تین بار دستک دینے کے بعد اگر جواب نہ ملے تو حدیث مبارک کے مطابق لوٹ آنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ کا دیوار پھلانگ کر لہو و لعب میں مشغول لوگوں کو پکڑنے کا واقعہ سب کو معلوم ہے کہ خلیفہ وقت کو کسی کی پرائیویسی میں مداخلت پر کتنی ڈانٹ پڑی تھی اور وہ کس قدر معذرت خواہ ہوئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جمعہ کے روز لوگوں کو راستے پر نماز کے لئے کھڑے دیکھا تو انہیں شاہراہ عام سے ہٹا دیا اور کہا کہ مسجدیں بڑی کرو لیکن راستے مت روکو۔ اسلام میں عام شہری کے حقوق کا مسئلہ اس قدر سنجیدہ اور اہم ہے کہ اسلام کے نام پر کسی کو جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کے آرام میں خلل انداز ہو لیکن قدم قدم پر موجود مساجد کے لاتعداد لاؤڈ سپیکروں نے شہری زندگی کا سکون غارت کر دیا ہے۔ اول تو یہ مسئلہ ہی غور طلب ہے کہ کوئی نئی مسجد پرانی مسجد سے کتنے فاصلے پر بنی چاہیے اور آبادی اور نمازیوں کی تعداد اور ضرورت کے مطابق ہی کسی مسجد کی تعمیر ہونی چاہیے تاکہ احترام مساجد باقی رہے لیکن جو مساجد موجود ہیں ان کے ذریعہ لوگوں کو روحانی سکون ملنا چاہیے نہ کہ روحانی اذیت۔ مناسب تو یہ ہے کہ علاقے کی کسی ایک مسجد کی اذان لاؤڈ سپیکر پر سنا دی جائے جس کی آواز اس علاقے میں پہنچ جاتی ہے لیکن اگر ہر مسجد کی اذان سنانی ضروری ہے تو صرف اذان سنائی جائے اور اس کے بعد نمازیوں کو نماز کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ کسی قسم کے شور و غل کے بغیر نماز ادا کر سکیں۔"

ہم مسلمان اپنے مذموم مقاصد کے لئے مسجد میں لاؤڈ سپیکر کو کس طرح سے استعمال کرتے ہیں اس کا اندازہ جنگ لاہور (20- مئی 1994ء) کی اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے:

"گجرات (نمائندہ جنگ) گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ کالج جلالپور جٹاں کے سنٹر میں گزشتہ روز انٹرمیڈیٹ اسلامیات گروپ اے کا پرچہ شروع ہوا تو ایک طالب علم نے قریبی مسجد میں جا کر لاؤڈ سپیکر پر قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کا ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا اور تمام پرچہ لاؤڈ سپیکر پر حل کرا دیا سپرنٹنڈنٹ کی اطلاع پر پولیس نے طالب علم مولوی کو مسجد سے گرفتار کر کے مقدمہ درج کر لیا ہے۔"

"مفاسد سے پاک طریقہ:"

واضح رہے کہ بعض اور جدید ایجادات کی مانند لاؤڈ سپیکر بھی دینی حلقوں میں خاصی دیر تک زیر عتاب رہا اور اسے "شیطان کی آواز" قرار دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے

"پاکستانی کلچر" (ص: 188) میں مفتی محمد شفیع کی " آلات جدید کے شرعی احکام" کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے:

"آلہ مکبرالصوت کا استعمال نمازوں میں درست نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے' سادہ طریقہ مسنونہ کے ساتھ بڑی جماعتوں میں مکبرین کے ذریعے تکبیرات استقبالیہ کی آواز آخری صفوف تک پہنچائی جائیں یہی جامع خیرات و برکات اور مفاسد سے پاک طریقہ ہے اسی کو اختیار کرنا چاہیے"

چنانچہ جن مولویوں نے اپنی مساجد میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال میں پہل کی انہیں خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ راشد چوہدری "لاؤڈ سپیکر کے خلاف فتویٰ" میں ذاتی یادوں کے حوالہ سے تقریباً چوتھی دھائی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ لاہور میں ریلوے سٹیشن کے قریب آسٹر-یلیشیا بلڈنگ میں واقع مسجد کے خطیب مولانا عبدالحمید پنجاب یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے اور سوٹ اور نکٹائی لگا کر امامت کراتے تھے۔ وہ جمعہ کے خطبہ کو مائیکروفون کے ذریعہ سے مسجد میں رکھے ریڈیو پر باآواز بلند سناتے تھے اور اپنے خطبہ میں عقل کو بھی دخل دیتے تھے—" ان کے خلاف جہازی سائز کے پوسٹر چسپاں کیے گئے "جن میں فتوی دیا گیا تھا کہ لاؤڈ سپیکر پر نماز پڑھانا حرام ہے۔ اس فتویٰ کے نیچے بے شمار علماء کے دستخط تھے جن میں سنہری مسجد' مسجد وزیر خاں اور شاہی مسجد کے امام پیش پیش تھے—" راشد چوہدری اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں "مولانا عبدالحمید کے بعد مولانا محمد بخش مسلم کا نام بھی چکا' یہ مولانا بھی گریجویٹ تھے انہوں نے امامت کا آغاز لاہوری دروازہ کے باہر باغ میں واقع مسجد سے کیا' انہوں نے اس مسجد میں لاؤڈ سپیکر کا انتظام کیا ان پر بھی کفر کا فتوی لگا لیکن وہ حق پر قائم رہے ان دونوں گریجویٹ اماموں نے جاہل ملاؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اس کے بعد لاہور کے شہریوں نے دیکھا کہ ہر اس مسجد میں لاؤڈ سپیکر لگا جس کے امام نے لاؤڈ سپیکر کی آواز کو شیطان کی آواز قرار دیا تھا اور خود وہ حضرات جن کے دستخط فتویٰ پر موجود تھے اپنی اپنی مساجد میں لاؤڈ سپیکر استعمال کرتے رہے۔"(2)

اس نوعیت کا ایک مضمون بعنوان "چند پرانے اعتقادات" اصغر علی گھرال کا بھی ہے جس کے بموجب:

"امرتسر میں مسجد خیردین غالباً پہلی مسجد تھی جہاں لاؤڈ سپیکر نصب ہوا مگر ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں اس کے خلاف زبردست ہیجان تھا۔"(3)

اصغر علی گھرال نے البتہ یہ نہیں بتایا کہ ایسا کس سال میں ہوا تھا۔

جب ایک مرتبہ لاؤڈ سپیکر کے معاملہ میں ملا کی جھجک کھل گئی تو شیطان کی آواز کے اس آلہ مکبرالصوت سے ایسی انسیت ہوئی کہ اب اس کے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔ اے کاش! ملا لوگ قدیم موقف کی طرف رجوع کر کے پھر سے اسے حرام قرار دے دیں تو کتنا اچھا ہو!

لاؤڈ سپیکر کے مسئلہ کے بارے میں جنگ (21- مارچ 1994ء) کا اداریہ بعنوان "لاؤڈ سپیکر کے بے جا استعمال پر پابندی" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"مساجد اللہ تبارک و تعالٰی کے حضور سر بسجود ہونے اور اس کے حضور خضوع و خشوع کے ساتھ گڑگڑانے کے لئے مخصوص ہیں۔ اس اعتبار سے مساجد امن کا گہوارہ اور سکون کا منبع ہیں لیکن گزشتہ کئی عشروں سے مساجد سے لاؤڈ سپیکر کا جس انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے اس سے بچوں، طلبہ اور مریضوں کے لئے ہی شور کی آلودگی نے خطرناک مسائل ہی پیدا نہیں کئے گھروں میں عبادت کرنے والوں، رات کو تاخیر سے اپنی ڈیوٹیوں سے لوٹنے والے ملازمین اور عوام کے لئے بھی بڑی الجھنیں اور مشکلات پیدا کر دی ہیں اور وہ جگہ جو سرچشمہ ہدایت اور رہنمائی ہے اس سے لاؤڈ سپیکر کے بے محابا استعمال نے عوام کے ذہنوں میں ایک بے کلی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ قانون میں لاؤڈ سپیکر کے موقع بے موقع انتہائی بلند آواز استعمال پر پابندی عائد ہے لیکن عمال حکومت مذہبی طبقہ کے خوف سے ایسا کرنے سے قاصر ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک علمائے حق اس بارے میں حکومت اور عوام کو صحیح راستہ نہیں دکھائیں گے اس مسئلے کا حل نہیں نکل سکے گا۔"

اسے کیا کہئے؟

قرآن مجید کتاب مبین اور فرقان حمید ہے، ہر مسلمان کو راہ نجات دکھانے والی یہ کتاب مقدس، اس کی روشن آیات اور زریں تعلیمات میں دونوں جہانوں کے لئے فلاح کا سامان ہے مگر اس کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے قول اور فعل کے تضادات، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل، حکمرانوں، سیاستدانوں اور قائدین کی دو عملی اور اس کے نتیجہ میں ملک میں سیاسی اور اقتصادی عدم استحکام یہ سب اسی بنا پر ہیں کہ قرآن مجید کی تعلیمات اور ہماری عملی زندگی میں قطبین کا بعد ملتا ہے۔ ہر گھر میں قرآن مجید کو سبز ریشمی غلاف میں لپیٹ کر الماری کے سب سے اونچے خانہ میں بند کر دیا جاتا ہے اور بس! قرآن مجید کے حوالہ سے قومی سطح پر اس سے بڑھ کر کور چشمی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اندھے کو "حافظ جی" کہا جاتا ہے۔ دینی مدارس میں قرآن شریف پڑھانے میں عموماً کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کی وضاحت کے لیے چند

مثالیں پیش ہیں :

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک سوانحی مضمون "والد مرحوم' میں اور نگار" میں تیرہ برس کی عمر میں مدرسہ اسلامیہ (فتح پور) میں حفظ قرآن کے سلسلہ میں جو مشاہدات کیے ان کے اثرات کے بارے میں یوں بیان کیا ہے :

"... اس مدرسہ کا حافظ خانہ تھا یہ بڑا قدیم مذہبی ادارہ تھا جس میں طلباء کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا اور اس بے دردی کے ساتھ کہ اس کے خیال سے میرے رونگٹے اب بھی کھڑے ہو جاتے ہیں..... یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوا کرتا تھا اس سے میں کیا شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ و پکار اور بچوں کی آہ و بکا سے مجھے سخت تکلیف پہنچتی تھی... حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیت احتراز پیدا کر دی تھی...."

یہ 1897ء کی بات ہے اب 1983ء میں صورت حال ملاحظہ کیجئے :

روزنامہ "جنگ" (لاہور: 13- نومبر 1983ء) کی خبر بلا تبصرہ پیش ہے۔ سرخی ہے : "پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر تعلیم دینا اسلام کے عین مطابق ہے" — "قاری عبدالعزیز کا دعویٰ"

کوٹلی (جام نگر) کے نامہ نگار کی ارسال کردہ خبر کے مطابق— "پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر دینی تعلیم دینا اسلام کے عین مطابق ہے یہ موقف چاند مدرسہ تجوید القرآن دریا خاں کے قاری نے ایک اشتہار کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اشتہار میں کہا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام حضرت عکرمہ مشہور علماء میں سے ہیں کہتے ہیں کہ میرے آقا حضرت عبداللہ بن عباس نے قرآن و حدیث اور شریعت کے احکام پڑھانے کے لئے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی تھی کہ کہیں آؤں جاؤں نہیں' وہ مجھے قرآن شریف پڑھاتے اور حدیث پڑھاتے' حقیقت میں پڑھنا اسی صورت میں ہو سکتا ہے' دریں اثناء معلوم ہوا ہے کہ مدرسہ ہذا میں جن طلبہ کو دینی تعلیم کے لئے داخل کیا جاتا ہے ان کے والدین یا سرپرستوں سے ایک پرنٹ شدہ فارم پر دستخط کرائے جاتے ہیں۔ فارم پر چھپا ہوا ہے کہ میرا لڑکا دوسری جگہ تعلیم حاصل نہ کر سکا اور گھر میں زر نقد اور جو کچھ ہاتھ لگتا ہے چوری کر کے خورد برد کر لیتا ہے۔ میں اسے قرآن مجید حفظ کرنا چاہتا ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایسے لڑکوں کا انتظام مدرسہ تجوید القرآن جامع مسجد گلزار دریا خاں میں ہے' میں اپنے لڑکے کو آنجناب کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں التماس کرتا ہوں کہ اسے زنجیر لگاؤ' زنجیر اور تالوں کی قیمت میں خود ادا کروں گا تاکہ میرا بچہ کہیں بھاگ نہ سکے۔ میں اقرار کرتا ہوں

کہ اگر میں اپنے لڑکے کو تا ختم قرآن رخصت پر لے جاؤں تو زر ضمانت مبلغ ایک ہزار روپے قاری عبدالعزیز کے پاس رکھوں گا اور جب رخصت سے واپس پہنچاؤں گا تو زر ضمانت واپس لوں گا۔ اگر لڑکا بھاگ گیا تو اسے پکڑ واپس لاؤں گا اور اگر واپس نہ لایا تو قاری صاحب کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ زر ضمانت اور سامان ضبط کر لیں۔ یاد رہے کہ گزشتہ دنوں اسی دینی مدرسے کے دو طلباء بیڑیاں کاٹ کر ان بیڑیوں سمیت سپرنٹنڈنٹ پولیس بھکر کے روبرو پیش ہوئے تھے۔ انہوں نے مدرس پر انہیں اور ان کے علاوہ بہت سے طلباء کو حبس بے جا میں رکھنے کا الزام لگایا تھا انہوں نے مزید زیادتیوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے مدرس کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت کارروائی کا مطالبہ کیا تھا جس پر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تحقیقاتی افسر مقرر کیا تھا جس پر مدرسہ کے قاری نے مندرجہ بالا وضاحتیں کیں۔ یاد رہے کہ اس مدرسے میں طلبہ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اس کے ساتھ ایک بیس سیر وزنی لکڑی کا ٹکڑا باندھ دیا جاتا ہے اور طلبہ کو نقل و حرکت کے لئے یہ ٹکڑا کندھے پر اٹھانا پڑتا ہے"

اگر آپ سوچ رہے ہوں کہ یہ واحد مثال ہے تو ایسا نہیں کہ نوائے وقت (راولپنڈی 8- جولائی 1994ء) میں بھی ایسی ہی خبر اور تصویر شائع کی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی تین خبریں یوں ہیں:

"میانوالی (نوائے وقت' نیشن رپورٹ) میانوالی کے قریب لیاقت آباد کے علاقے پپلاں میں ایسے جیل نما مدرسے کا سراغ ملا ہے جہاں 27 بچوں کو زنجیروں میں باندھ کر "دینی تعلیم" دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس عقوبت خانے کا انکشاف اس وقت ہوا جب نمائندہ نیشن کے علاوہ پاکستان میں قائم انسانی حقوق کی تنظیم کے دو ارکان اور جینوا میں قائم بچوں کے حقوق کے تحفظ کی عالمی تنظیم کے عہدیدار اور مقامی سماجی کارکن پر مشتمل ٹیم نے اچانک اس مدرسے کا دورہ کیا۔ مدرسہ دارالعلوم شیرازیہ کے نام پر قائم اس اذیت کدہ کے وارڈن سید بشیر حسین عرف شاہ صاحب ہیں جو اکیلے 27 بچوں کو آہنی زنجیروں میں جکڑ کر قرآن کی تعلیمات دینے کا "فریضہ" کئی ماہ سے سرانجام دے رہے ہیں۔ 23 سال سے قائم اس مدرسے کی سرگرمیوں سے اسسٹنٹ کمشنر پپلاں محمد سلیم اور ڈپٹی کمشنر میانوالی سردار محمد اکرم نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا البتہ ڈپٹی کمشنر نے وفد کی معروضات سننے کے بعد ضروری کارروائی کی یقین دہانی کرائی جبکہ اے سی پپلاں کا موقف تھا کہ چونکہ یہ نازک دینی مسئلہ ہے اس لئے انہیں کچھ مہلت دی جائے۔ وہ بشیر حسین شاہ کو معززین اور وکلاء

کی موجودگی میں طلب کریں گے اور انہیں بچوں کو فوری طور پر رہا کرنے کا حکم دیں گے۔ قبل ازیں جینوا کے بچوں کے تحفظ کے ادارے DEI کے نمائندے ا-نسلمو جو سونے جب معصوم کمسن بچوں کو لوہے کی زنجیروں اور لکڑی کی بڑی بڑی گیلیوں کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کو اس طرح پابند سلاسل کرنا انسانی حقوق کی پا مالی کی بدترین مثال ہے۔ بچوں کے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔ یاد رہے کہ مسٹر ا ینسلمو جو سوجو کہ صحافی بھی ہیں۔ بی بی سی اور نیویارک ٹائمز کے نمائندوں کے ہمراہ بوسنیا اور صومالیہ میں بھی بچوں کی حالت زار کا جائزہ لینے کے بعد ایک رپورٹ مرتب کر چکے ہیں جبکہ پاکستان میں قائم انسانی حقوق کمیشن کے ارکان محبوب خان اور محمد حمزہ نے جو عاصمہ جہانگیر کے لیگل ایڈ سیل کے بھی نمائندے ہیں کہا کہ وہ ایسے مدرسوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں۔ وفد کے ارکان جونہی مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے تیزی کے ساتھ صحن میں پابہ زنجیر کھڑے بچوں کی تصاویر لینا شروع کر دیں۔ وفد کے ارکان بچوں کے ساتھ گلے مل گئے مگر وہ اتنے دہشت زدہ تھے کہ وہ ان کے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔ اس موقع پر بھکر سے تعلق رکھنے والے 10 سالہ محمد اشرف نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا کہ اس کی ماں نے تیسری شادی کی ہے اور اس کا سوتیلا باپ اس پر مظالم ڈھاتا تھا پھر اس نے اسے ٹرین پر بٹھا دیا اور وہ جیکب آباد آگیا جہاں سے اسے مدرسے لایا گیا۔ وہ تین سال سے مدرسہ میں ہے۔ 15 سالہ جانباز خان بھی سات سال سے اس مدرسہ میں ہے اس کے والدین مر چکے ہیں اور اس کا بہنوئی اسے مدرسہ میں چھوڑ گیا تھا۔

میانوالی (نوائے وقت نیشن رپورٹ) نگران مدرسہ بشیر حسین شاہ نے ٹیم ارکان کے بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ یہ بچے شراب، حشیش، ہیروئن کے عادی ہیں اور ان کے مائی باپ (ماں باپ) ان کو مدرسے میں اصلاح اور قرآنی تعلیم دینے کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں شاہ صاحب نے اعتراف کیا کہ اسلام میں جبر تشدد یا زنجیروں کی مدد سے دینی تعلیم دینے کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہے۔ تاہم وہ بچوں کے مائی باپ کی ہدایت پر ان بچوں کو دینی تعلیم دینے کا مقدس فریضہ سرانجام دینے پر مجبور ہے۔

میانوالی (نوائے وقت نیشن رپورٹ) مدرسہ کے وارڈن نے حفاظتی اقدام کے طور پر زنجیروں میں بندھے ہوئے چار چار بچوں کے گروپ بنا رکھے تھے۔ ان بچوں کو حکم دیا گیا تھا

کہ انہوں نے ہر صورت اکٹھے گروپ کی شکل میں رہنا ہے اکٹھے سونا ہے اکٹھے اٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ اکٹھے نہانا اور اکٹھے ہی بیت الخلاء جانا ہے۔ اگر کسی کو رات کے تین بجے بیت الخلاء جانا ہے تو چاروں جاگیں گے اور بیت الخلاء جائیں گے۔ اگر کسی ایک کو متعدی مرض لاحق ہوا ہے تو باقی تینوں کو بھی بھگتنا ہو گا۔"

اس نوع کے واقعات سے بالعموم صرف نظر کیا جاتا ہے اور ایسی خبریں اپنی موت مر جاتی ہیں اور صورت احوال جوں کی توں ہی رہتی ہے جیسا کہ 26 اکتوبر 1994ء کو اسی خبر کی اشاعت مکرر سے اندازہ ہو جاتا ہے۔

"لاہور (جنگ فارن ڈیسک) موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع گجرات کے موضع پپلاں میں گزشتہ 23 برس سے سید بشیر حسین شاہ شیرازی عرف "شاہ صاحب" اونچی دیواروں کی ایک عمارت کے احاطہ میں دینی درسگاہ کے نام سے 39/ طلباء کو زبردستی مذہبی تعلیم کے نام سے ایک ایسے قید خانہ کی مصیبتیں جھیلنے پر مجبور کر رہے ہیں جہاں انہیں لوہے کی موٹی زنجیروں میں جکڑ کر لکڑی کے ایک وزنی ٹکڑے سے باندھا جاتا ہے۔ لندن کے روزنامہ گارڈین کے ایک نمائندے جو سو ایس لیمو اور پاکستان میں انسانی حقوق کے دو ممبران نے ایک رپورٹ میں اس ظلم کی داستان کا انکشاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ "شاہ صاحب" کی مرضی کی خلاف زبردستی درسگاہ کے احاطہ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوئے' سب سے پہلے انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک 15 سالہ لڑکے جانباز نے آنکھوں میں بہتے آنسوؤں اور غم کی ہچکیوں کے ساتھ التجا کی کہ مجھے اس قید خانہ سے جلد از جلد رہائی دلائیں۔ آپ میری والدہ کو پیغام پہنچائیں کہ یا تو وہ مجھے آ کر اپنے ساتھ گھر لے جائے یا مجھے گولی مار کر اس عذاب سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا دلایا جائے۔ جانباز کے ساتھ چار دوسرے لڑکوں کو بھی زنجیروں میں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ ان بچوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ کئی سال سے اسی طرح پابہ زنجیر زندگی بسر کرنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ گرمیوں میں مچھروں کے کاٹنے سے ساری رات جاگ کر گزارتے ہیں جبکہ سردیوں کی لمبی راتیں ان کے لئے ایک ناگہانی عذاب کی صورت میں نازل ہوتی ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 39 طلباء میں سے 27 کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا ہے جبکہ بقیہ 12 ابھی کمسن ہیں جنہیں گاؤں گاؤں بھیک مانگنے اور مدرسے کے لئے چندہ اور دیگر بچوں کے لئے کپڑے اور کھانے پینے کی اشیاء حاصل کرنے کے فرائض سونپے گئے ہیں۔ 15 سالہ جانباز نے بتایا کہ وہ 8 سال کا تھا جب اس کی والدہ اسے یہاں چھوڑ گئی تھیں اس کے بعد

وہ آج تک اپنے لخت جگر سے ملنے نہیں آئیں شاید وہ مجھے بھول گئی ہیں۔ رپورٹنگ ٹیم نے سکول کے سربراہ "شاہ صاحب" سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا جس کے بعد انہوں نے بڑی لاپرواہی سے بلا خوف یہ بتایا کہ ان بچوں کے والدین ان سے سخت تنگ آ کر انہیں یہاں چھوڑ گئے تھے اور وہ انہیں ایک سخت گیر زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دے رہے ہیں تاکہ یہ مستقبل کے بہترین مبلغ بن جائیں۔ "شاہ صاحب" نے بتایا کہ ان بچوں کے والدین کثرت اولاد کی وجہ سے انہیں زبردستی یہاں چھوڑ جاتے ہیں' اس سلسلے میں انہوں نے دو لڑکوں 10 سالہ اشرف اور اس کے بڑے بھائی 12 سالہ محمد افضل کی مثال پیش کی کہ یہ دونوں آوارہ تھے اس لیے انہیں ان کی والدہ چار سال پہلے اس سکول کی چار دیواری میں چھوڑ کر پھر ایسی غائب ہوئی کہ آج تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔ "شاہ صاحب" نے بتایا کہ وہ ان لڑکوں کو روزانہ صبح چار بجے سے رات گیارہ بجے تک مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور انہیں قرآن کریم زبانی حفظ کرانے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے جیل نما سکول کو آسمانی بہشت کا ایک حصہ قرار دیا اور کہا کہ وہ انہیں زبردستی زنجیروں سے باندھ کر اس ارضی بہشت میں محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ اس سے باہر کی دنیا' کرپشن' شراب اور منشیات کی دلدل کی دنیا ہے اگر وہ انہیں آزاد کر دیں تو یہ تمام بچے یقیناً یہاں سے بھاگ کر گناہ کی دلدل میں پھنس جائیں گے۔ شاہ صاحب نے ایک 18 سالہ لڑکے عبداللہ کی طرف قہر آلود نگاہ سے دیکھا اور اسے کھڑے ہو کر اپنا بیان دینے کا حکم دیا۔ عبداللہ نے رپورٹنگ ٹیم کی طرف دیکھنے کی بجائے دور خلاؤں میں جھانکتے ہوئے طوطے کی طرح رٹے بیان کو دہرایا کہ وہ اس سکول میں آنے سے پہلے شراب پیتا تھا مگر اب شاہ صاحب کی مہربانی سے وہ اس بری عادت سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہے۔ بیان دیتے وقت اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں' اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ گزشتہ تین سال سے زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے' اس سکول میں تمام طلباء کو چار یا پانچ کے گروپوں میں ایک ہی زنجیر سے باندھ کر رکھا گیا ہے۔ یہ بچے چھوٹے سائز کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں اس لئے وہ آزادانہ گھوم پھرنے سے محروم ہیں۔ شاہ صاحب نے ایک بار پھر دخل اندازی کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب میرے اپنے بچے ہیں۔ یہ بچے اس قدر مختلف ہو چکے ہیں کہ اب وہ انہیں ہزاروں کے ہجوم میں آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ دراصل وہ ان لڑکوں کے لئے اپنی زندگی کی قربانی دے رہے ہیں۔ وہ ایک غریب آدمی ہیں لیکن رپورٹنگ ٹیم نے بعد ازاں جب ان کے بارے میں مکمل چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب

کے دو ذاتی مکان، فصل دینے والی زمین، گائے بھینس، بھیڑیں، کار اور ایک ٹریکٹر کے مالک ہیں۔ رپورٹ کے مطابق شاہ صاحب اپنے علاقہ میں ایک روحانی لیڈر کی حیثیت کے مالک کہے جاتے ہیں۔ علاقہ کے ایک شخص سلیم نے بتایا کہ اگر وہ شاہ صاحب کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے تو پیلاں گاؤں کے علاوہ یہ ایک قومی مسئلہ بن جائے گا اور وہ ملک گیر فسادات کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس لئے وہ ان محبوس لڑکوں کو آزاد نہیں کرا سکتے البتہ اگر کوئی طاقتور سیاسی قوت اور وکلاء ان کا ساتھ دیں تو وہ یہ خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ رپورٹ میں الزام لگایا گیا ہے کہ اس وقت پاکستان بھر میں دینی تعلیم کی 27 ہزار درسگاہیں موجود ہیں اور پیلاں کے دینی مدرسہ جسے ہم جیل کے نام سے پکاریں گے کی طرز کے کئی مدد سے دیگر شہروں میں بھی موجود ہیں جن میں سے لاہور میں 2 عدد اور ایک چنیوٹ میں ہے۔ اس کے علاوہ کراچی اور سندھ کے شمالی علاقوں میں بھی اس قسم کے کئی دینی مدرسوں میں لڑکوں کو زنجیروں سے باندھ کر مذہبی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ٹیم کے ہمراہ جانے والے ایک وکیل محبوب خان نے بتایا کہ پیلاں کے پابہ زنجیر لڑکے مقامی مسجد سے نماز کی ادائیگی کے بعد واپس مدرسہ جا رہے تھے۔ رپورٹنگ ٹیم کے مطابق انہوں نے اپنی اس رپورٹ کو جنیوا کی یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ انٹرنیشنل سٹڈیز میں پاکستان کے ہیومن رائٹس کے ایک ماہر مسٹر گلبرٹ اے ٹین کو ارسال کی جنہوں نے یہ رائے دی کہ یہ سکول بعض اسلامی ملکوں کی سرپرستی میں چل رہے ہیں جہاں پاکستان کے ہزاروں کارکن کام کر کے ملک کے لئے قیمتی زرمبادلہ حاصل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ہی شاید پاکستان کی حکومت ان جیل نما دینی درسگاہوں سے چشم پوشی اختیار کرتی ہے۔ رپورٹنگ ٹیم نے پاکستان میں انسانی حقوق کے کمیشن کی صدر عاصمہ جہانگیر کا بیان بھی شامل کیا ہے جس میں انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ جیل نما دینی مدرسے بعض اسلامی ملکوں کے زیر اثر علماء کی سرپرستی میں کام کر رہے ہیں۔"

"شیطان آزاد ننھے فرشتے قید:"

یہ سرخی ہے روزنامہ "جنگ" لاہور: 6 جنوری 1994ء میں چھپنے والی اس خبر کی:

"شیطان آزاد ننھے فرشتے قید"

"گمبٹ (پ پ ا) گمبٹ میں زنجیروں سے بندھے برآمد ہونے والے چھ بچوں کے بارے میں ہولناک انکشاف ہوا ہے بتایا گیا ہے کہ ایک مدرسے کے مولوی عبدالولی شیخ نے ان بچوں کو مجرمانہ حملوں کے لیے "قیدی" بنا رکھا تھا۔ دوسرے مدرسوں سے اپنی ذہنیت کے

"مولوی" بلا کر بچے ان کے بھی حوالے کر دیتا تھا اور مزاحمت پر انھیں انتہائی اذیتیں دی جاتیں- پولیس نے مدرسہ سیل کر دیا-"

اور روزنامہ "جنگ" لاہور: 19 جون 1994ء کی یہ خبر بھی ملاحظہ ہو:

"جنت میں جانے کے خواہشمند"

"فیصل آباد (نامہ نگار) یہاں ایک امام مسجد نے چندہ حاصل کرنے کے لیے ایک دلچسپ اور انوکھا طریقہ اختیار کیا اور چند منٹ میں مسجد کے لیے 25 ہزار روپے چندہ جمع کر لیا- بتایا گیا ہے خطبہ جمعہ کے دوران امام مسجد نے اچانک اعلان کیا کہ جن افراد نے جنت میں جانا ہے وہ ہاتھ کھڑے کریں اس پر تمام نمازیوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے تو امام مسجد نے ہدایت کی کہ اب یہ ہاتھ اپنی جیبوں میں لے جائیں اور جس کے پاس جتنی جتنی رقم ہے نکال کر مسجد فنڈ میں دے دی جائے چنانچہ اس طرح 25 ہزار روپے جمع ہو گئے-"

روزنامہ "جنگ" لاہور 19- اپریل 1994ء سے یہ خبر بلا تبصرہ نقل کی جاتی ہے:

"اسلام آباد (سٹاف رپورٹر) ایف آئی اے کے ڈائریکٹر امیگریشن رحمان ملک نے جمیعت مشائخ پاکستان کے صدر صاحبزادہ نعیم الرحمان نعیمی کے خلاف سادہ لوح افراد کو بیرون ملک بھجوانے کا جھانسہ دے کر انھیں لوٹنے کے مقدمات کی تفتیش ایف آئی اے امیگریشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر خان گل کے سپرد کر دی ہے اور ہدایت کی ہے کہ 48 گھنٹوں کے اندر نعیم الرحمان نعیمی کو گرفتار کیا جائے- صاحبزادہ نعیم الرحمان نعیمی کے خلاف ایک سو سے زاید علمائے کرام' ان کے عزیزوں' رشتہ داروں کو امریکہ بھجوانے کا جھانسہ دے کر ان سے ایک کروڑ روپے سے زائد رقم ہتھیا لینے کے الزام میں مقدمات پاسپورٹ سیل راولپنڈی میں درج ہیں جن کی تفتیش ایف آئی اے پاسپورٹ سیل راولپنڈی کے انچارج ملک صفدر علی کر رہے ہیں- ملک صفدر علی نے بتایا کہ صاحبزادہ نعیم الرحمان نعیمی دو سال قبل اچانک رونما ہوا جس نے جمعیت مشائخ پاکستان میں شمولیت اختیار کی اور اس کا صدر بن بیٹھا- اس نے علمائے کرام اور مشائخ کے کنونشن منعقد کرانے کا چکر دیا- سیکٹر آئی ٹن فور میں دینی تعلیم کا ایک کوٹھی میں مدرسہ قائم کیا اور یہ تاثر دیا کہ وہ ملک بھر میں علمائے کرام اور مشائخ عظام کو متحد کر کے ایک دینی قوت سامنے لانا چاہتا ہے- اس نے ملک کی اہم ترین شخصیات سابق صدر غلام اسحاق خان' سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف کے ساتھ ملاقاتیں کر کے ان کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا اور غلط رنگ دیا- ان ملاقاتوں کی تصاویر اور خبریں اخبارات میں شائع کروا کے یہ تاثر دیا کہ اس کی اوپر تک رسائی ہے اور دنیا کا ہر کام

وہ کروا سکتا ہے اس طرح اس نے جہلم، چکوال، فیصل آباد، سرگودھا، گجرات، راولپنڈی اور دیگر علاقوں کے مولویوں اور علمائے کرام کو یہ جھانسہ دیا کہ وہ انہیں یا ان کے رشتہ داروں کو امریکہ بھجوا سکتا ہے اور اس کے لیے امریکہ جانے کے خواب دیکھتے ہوئے بعض مولویوں نے اپنے رشتہ داروں کے لئے بھی اس کے پاس پیشگی رقوم جمع کرا دیں۔ بعض علمائے کرام نے تو تین تین، چار چار لاکھ روپے اسے دے دیے وہ ان رقوم سے پر تعیش زندگی گزارتا رہا۔ پجارو گاڑی استعمال کرتا، موبائل فون رکھا ہوا تھا یہاں تک بعض علمائے کرام کے ذریعہ ان کی رشتہ دار جواں سال لڑکیوں سے شادی رچائی اور دو دن بعد طلاق دے دی چنانچہ 6 ماہ بعد قبل اچانک وہ سکرین آؤٹ ہو گئی جس کے بعد مولویوں نے اسے ڈھونڈنا شروع کر دیا جب ان کے رشتہ داروں نے رقوم کا مطالبہ کیا تو وہ پریشان ہو گئے اس طرح پاسپورٹ سیل کے چکر لگا شروع کر دیے ڈائریکٹر امیگریشن ایف آئی اے کو درخواستیں دیں چنانچہ مقدمہ درج کر لیا گیا مگر نعیم الرحمان نعیمی غائب ہو گیا اس کی پاکستان سے باہر جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ ایئرپورٹوں کے امیگریشن سٹاف کو ہدایات جاری کر دی گئیں پھر اسے اشتہاری ملزم قرار دیا گیا مگر تاحال اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ ڈائریکٹر ایف آئی اے اے رحمان ملک کو متاثرہ افراد کی جانب سے اس کی گرفتاری میں ناکام رہنے کی شکایت کرنے پر انہوں نے تفتیش تبدیل کر دی ہے اور ہدایت کی ہے کہ اسے ہر حالت میں جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔"

"اور 18۔ مئی 1994ء کے "جنگ" سے یہ خبر بھی ملاحظہ کیجئے:

حافظ آباد (نمائندہ جنگ) حافظ آباد کے گاؤں مانگٹ نیچے کے امام مسجد ولی محمد نے ایک غریب کسان کی بیٹی کو اغوا کر کے خوشاب پہنچا دیا، اسے ڈیڑھ سال تک ایک مکان میں قید رکھا اور اس سے زیادتی کرتا رہا۔ پولیس کے مطابق دوران تفتیش ملزم نے انکشاف کیا ہے کہ وہ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے بیچ دیتا ہے اس دھندے میں اس کے ساتھ ایک عورت اور ایک مرد بھی شریک ہیں۔ ایک سال قبل انہوں نے گاؤں کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے بیچ ڈالا تھا، مزید انکشافات کی توقع ہے۔ تفصیلات کے مطابق موضع مانگٹ نیچے میں دس سال قبل ولی محمد نے مسجد میں امامت اور بچوں کو قرآن پاک پڑھانا شروع کیا۔ ڈیڑھ سال قبل اس نے ایک عورت اور مرد کی مدد سے گاؤں کے ایک غریب کسان کی بیٹی کو اغوا کر لیا اور خوشاب کے ایک گاؤں مٹھہ ٹوانہ کے ایک الگ تھلگ مکان میں "قید" کر دیا۔ لڑکی کے والدین اپنی غربت اور عزت کی وجہ سے خاموش رہے اور کوئی کارروائی نہ کی۔ اغوا

کے ڈیڑھ سال بعد مٹھہ ٹوانہ میں چادریں بیچنے والے ایک شخص کو لڑکی نے تمام بات بتائی اور اپنے والدین کے پاس مانگٹ نیچے بھیجا جس پر مغویہ کے والدین نے ایس ایس پی حافظ آباد سید عابد قادری سے رابطہ قائم کیا جن کی ہدایت پر تھانہ صدر حافظ آباد کی ایک ٹیم مٹھہ ٹوانہ گئی اور مغویہ کو برآمد کر کے ملزم ولی محمد کو گرفتار کرلیا۔"

اور آخر میں جنگ (21 نومبر 1994ء) کی یہ خبر:

"شور کوٹ (این این اے) امام مسجد منشیات فروش نکلا اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ تفصیلات کے مطابق نواحی علاقہ بہادر شاہ میں واقع مسجد کے امام کو اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ مصلے پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا پولیس نے اس کے ایک گاہک کو نقد رقم دے کر بھیجا تو مولوی نے اپنے مصلے کے نیچے سے ہیروئن کی پڑیا نکا کر گاہک کو تھمائی ہی تھی کہ پولیس پارٹی نے اچانک چھاپہ مار دیا اور ہیروئن فروش امام مسجد کا چالان کر کے جیل بھیج دیا۔"

یہ اس نوع کی خبروں اور واقعات سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ سوال آسان جواب مشکل

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

"طرز کہن پہ اڑنا:"

ملا — اساسی طور پر ماضی پرست ہوتا ہے اس لیے اقبال کے الفاظ میں — آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا — وظیفہ حیات ہوتا ہے۔ اب زندگی تبدیلیوں کا نام ہے۔ معاشرہ میں کسی نہ کسی سطح پر یہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہو کر اپنے اثرات کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔ ایک انتہا پر نظریات اور تصورات ہیں تو دوسری انتہا پر نت نئی ایجادات اور اشیاء اور ان کے درمیان متنوع نوعیت کی دیگر تبدیلیاں۔ نظریات اور تصورات تو خیر علمی ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں رد عمل بھی علمی سطح پر ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے) مگر ایجادات اور عام اشیاء کے بارے میں بظاہر تو کسی بحث مباحثہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ پسند ہے تو انہیں استعمال کریں ناپسند ہے تو مت کریں۔ یعنی یہ قانونی مذہبی یا اخلاقی مسئلہ نہیں ہوتا مگر ہمارے ہاں انہیں بھی مذہب کے نام پر متنازعہ بنا کر — ان کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی بحث چھیڑ دی جاتی ہے۔ ہمارے مذہبی محققین دینی شخصیات اور علماء وقتاً" فوقتاً" جن اشیاء کو غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دیتے رہے ہیں ان کی فہرست اگرچہ خاصی طویل ہے تاہم نمونہ کلام پیش ہے:

ریل گاڑی میں سفر' موٹر سائیکل چلانا' ڈاک سے چٹھیاں بھیجنا یا منی آرڈر سے رقم کی ترسیل' انگریزی ہیٹ پہننا' کیمرہ سے تصویر اتروانا' پتنگ اڑانا' فٹ بال مکروہ ہے (کہ نیکر

پہن کر کھیلا جاتا ہے) جس گھر میں کتا ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے' بلیوں کو مت مارو (کہ ابو ہریرہ کی پسندیدہ تھیں) پرندوں اور دیگر جانوروں کی تصویر کشی ممنوع ہے (کہ روز محشران میں جان ڈالنے کو کہا جائے گا) عید کی نماز عیدگاہ کے علاوہ دیگر مساجد میں جائز ہے یا نہیں؟ ریڈیو سے تلاوت کرنا یا سننا حرام ہے۔ بنک میں پیسے رکھنا' ہسپتال میں مریضہ کا داخلہ اور عورت کا مرد ڈاکٹر کو دکھانا' انگریزی طرز کے بال کٹوانا' انگریزی ٹوپی کا استعمال ۔ اسی انداز کی مزید مثالوں کے لیے "فتاویٰ دارالعلوم" اور "فتاویٰ رشیدیہ" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سی اشیاء کے ساتھ بے چاری گھڑی بھی نہ بچی چنانچہ جماعت اہل حدیث (شیخوپورہ) کے امیر مولوی محمد حسین کے فتویٰ (بحوالہ : "پیغام صلح" لاہور : 16 مارچ 1968ء) کے بموجب :

"تحقیق کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے اذانیں دیں اور نمازیں ادا کیں بحساب اوقات گھڑیوں مروجہ کے اور ترک کیا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کو اور نہ حساب رکھا سایہ کا واسطے اذان اور نماز کے روزانہ اور توڑا تعلق سنت سے براہ راست..."

وہ اس ضمن میں مزید ارشاد فرماتے ہیں :

"اور وہ لوگ بھی ظالم ہو کر کافر ہوئے جنہوں نے مسجدوں میں گھڑیاں لٹکا دیں اور پھر مسجدوں پر رات اور دن کے حصہ میں تالے لگا دئے اور وہ لوگ یعنی شیطان کے پیروکار ہو کر کافر ہوئے جنہوں نے داڑھی مونڈی یا منڈوائی اور مطمئن ہوئے"(4)

ہمارے زمانہ میں برگر' وی سی آر(5) ڈش انٹینا اور مریض کی جان بچانے کے لیے اعضاء کا عطیہ حرام قرار دیئے جا چکے ہیں جبکہ ایک فاضل ڈاکٹر کے بموجب عید پر سویاں کھانا اور معانقہ نا پسندیدہ ہیں ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے ٹیلی ویژن پروگرام میں عورتوں کو شرکت کی اجازت نہ دی تھی جبکہ مفتی نعیمی صاحب نے تو اصغر ندیم سید کے ٹی وی ڈرامہ "دریا" میں طلاق کا منظر دیکھ کر حقیقی زندگی کے میاں بیوی عثمان پیرزادہ اور ثمینہ پیرزادہ کی طلاق کا فتویٰ جاری کر دیا تھا۔ ادھر مولوی عبدالقادر روپڑی کے فتوے کے بموجب " سرکاری خرچ پر حج غیر شرعی اور ناجائز ہے" (جنگ 17 مئی 1994ء)

محترم صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی اپنے فاضلانہ مقالہ بعنوان "انقلاب کی صوفیانہ تعبیر" میں فرماتے ہیں :

"... اہم بات یہ ہے کہ دیکھا جائے اس وقت معاشرے کو درپیش سنگین مسائل کیا ہیں؟ اولاً ان کا ادراک حاصل کیا جائے اور ثانیاً ان کا حل ڈھونڈھا جائے مگر نام نہاد مذہبیت کے نزدیک معاشرتی مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اس کے ہاں کچھ اس طرح کے مسائل زیادہ اہم اور فوری طور پر فیصلہ طلب ہیں۔

خدا حاضر ناظر ہے یا رسولؐ بھی؟
حضورؐ دیوار کے پیچھے کا علم رکھتے ہیں یا نہیں؟
نبی اپنی قبر میں زندہ ہیں یا نہیں؟
معراج روحانی ہے یا جسمانی؟
جبریل افضل ہیں یا حضرت ابوبکرؓ؟
قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟
اولیاء اللہ سے مدد مانگنا جائز ہے؟ یا نہیں
قرآن مجید کی کتنی آیات ناسخ ہیں اور کتنی منسوخ؟
امام مہدیؒ پیدا ہو چکے ہیں یا نہیں؟
حد شرعی میں ہاتھ انگلیوں سے کاٹا جائے یا پہنچوں کے؟
داڑھی کی شرعی مقدار کتنی ہے؟
شلوار پہننا سنت ہے یا تہبند باندھنا؟
لاؤڈ سپیکر پر نماز درست ہے یا نادرست؟
فاتحہ کا ثواب مردوں کو پہونچتا ہے یا نہیں؟
تصویر اتروانا ممنوع یا مباح؟
جنازہ کی تکبیریں چار ہیں یا پانچ؟
پختہ قبر بنانا صحیح ہے یا غلط؟
پیغمبرؐ کی صاحبزادیوں کی تعداد کتنی ہے؟ ایک یا چار؟
دنیا میں کل کتنے ابدال ہیں؟
جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے یا ناجائز؟
نوافل با جماعت ادا ہو سکتے ہیں یا نہیں؟
تراویح کی کل رکعت بیس ہیں یا آٹھ؟
روضہ رسولؐ کی جالی کا بوسہ لینا کہاں تک جائز ہے یا بدعت؟
عید کے روز معانقہ کرنا سنت ہے
کھڑے ہو کر اور چمچے کے ساتھ کھانا کھانا کیسا ہے؟

یہ ہے ان اہم مسائل کی ایک جھلک جسے مذہبی دنیا میں معرکتہ الاراء سمجھا جاتا ہے اور ان مسائل کی توضیح و تنقیح پر نہ جانے کتنا لٹریچر تیار کیا گیا' کتنے مناظرے ہوئے' کتنے فتوے داغے گئے' کتنے "عالمی دنگل" برپا ہوئے' کتنا سرمایہ لگا' کتنا وقت برباد ہوا' کتنی صلاحیتیں صرف ہوئیں' کتنی نفرتیں ابھریں' کتنے تفرقے پڑے اور کیا کیا کچھ ہوا شائد اس کا شمار کوئی جدید ترین کمپیوٹر بھی نہ کر سکے' مگر اس ساری بحث و تمحیص کے باوجود عوام کے دکھوں کا مداوانہ ہوا' یہ بحثیں جاری ہیں اور جاری رہیں گی' مگر ان کا کسی معاشرتی روگ پر اثر نہ پڑا' رشوت جوں کی توں رہی' نظام زر کے مظالم برقرار رہے' انصاف بکتا

اور خریدا جاتا رہا، قتل ہوتے رہے، ڈاکے پڑتے رہے، عصمتیں لٹتی رہیں، مزارع بے دخل ہوتے رہے، مزدور محروم روز گار بنتے رہے اور غربت کی زندگی بوجھل ہوتی رہی الغرض ہر شیطانی مشغلہ بدستور رہا""(6)

ریشم کا کیڑا اپنے ارد گرد ریشمی تاروں کا جال بناتا رہتا ہے اور بالاخر ایک دن اسی ریشمی قبر میں دفن ہو جاتا ہے۔ ملا بھی یہی کرتا ہے، اپنی شخصیت کے گرد نفی کا خول تیار کر کے اس میں پناہ گزین ہو جاتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک خوفزدہ شخص ہے۔ خوف سے چھٹکارا پانے کے لیے شخصیت میں مثبت اقدار کی آبیاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ملا غصہ کی نہیں ترس کھانے کی چیز ہے۔

"طہارت پسندی:"

ملا بنیادی طور پر طہارت پسند ہوتا ہے جس کے نتیجے میں تشنگی جہاں سے بجھتی ہے اسے بجھانے کے برعکس وہ دریا کے منبع پر جا کر پانی پینے کا خواہش مند ہوتا ہے کہ صرف وہی آب مصفا ہے اور اسی لیے وہی حیات بخش ہے۔ اس ذہنی رویہ ہی میں اس کی ماضی پرستی مضمر ہے۔ وہ ماضی پر حال کو فوقیت دیتے وقت نہ صرف زمانی، تاریخی، ثقافتی اور ایسے ہی دیگر عوامل سے صرف نظر کرتا ہے بلکہ وہ یہ اساسی حقیقت بھی فراموش کر دیتا ہے کہ آج کا تابناک ماضی کل کو حال ہی تھا۔

ہم ماضی ماضی بہت کرتے ہیں مگر ماضی سے صرف جذباتی اور ہیجانی رشتہ ہوتا ہے۔ ماضی کا علمی، تاریخی، تحقیقی اور بالخصوص اساطیری مطالعہ آنکھیں کھول دینے کو کافی ہے اس مطالعہ میں بشریات، آکلٹ اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ شامل کر لینے سے ایسے ایسے انکشافات ہوں گے اکثریت جن کی تاب نہ لا سکے گی۔ ہمارے ہاں اگرچہ اس ضمن میں بہت زیادہ کام تو نہیں ہوا تاہم ابن حنیف قدیم تہذیبوں، کلچر اور اساطیر کے مطالعہ میں اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی جملہ تصانیف کا مطالعہ سود مند ہو گا اس ضمن میں یہ کتب قابل ذکر ہیں:

مصر کا قدیم ادب (4 جلدیں) __ بھولی بسری کہانیاں: بھارت___ بھولی بسری کہانیاں: مصر۔

ان کے ساتھ ساتھ سبط حسن کی "ماضی کے مزار" کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے اور انگریزی میں تو خیر لا تعداد کتابیں مل سکتی ہیں جیسے: "The Myth of Eve"

"ماضی کا مزار:"

ملا اس قدر ماضی پرست ہوتا ہے کہ خود "ماضی کا مزار" بن کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی روایات کے نام پر ہر قول، رسم، رواج، کا دفاع کرتا، آئین نو سے ڈرتا اور طرز کہن پہ اڑتا خود کو محافظ عقیدہ تصور کرتے ہوئے اس نفسیاتی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ میں نے مذہب کو کانچ کے کسی نازک پیالے کی مانند تھام رکھا ہے لہٰذا:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام!

اس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ارشادات بھی باعث افادہ ہیں:

"اتباع رسول و اصحاب کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلف صالح کی پیروی اسی کا نام ہے کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں، جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں۔۔ جیسا طرز معاشرت ان کے گھروں میں تھا بعینہٖ وہی طرز معاشرت ہمارے گھروں میں ہو۔ تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اسی کو ہم بالکل متحجر (Foseilsed) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے ارد گرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دور انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے درحقیقت روح اسلام کے بالکل منافی ہے اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثار قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں"۔ ("تنقیحات" ص: 14- 313)

اس سلسلہ میں مولانا مودودی کا یہ مقالہ بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

"ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط" ("تنقیحات": ص: 45- 23)

اسی ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے بھی قابل توجہ ہے انہوں نے روزنامہ "جنگ" لاہور: 12 مارچ 1982ء) میں ارشاد احمد حقانی کے لئے گئے انٹرویو میں "اسلام کے امکانات" کے بارے میں استفسار کے جواب میں فرمایا:

"مغربی تہذیب اور فکر کا جو غلبہ ہے اور جس کا کوئی موثر توڑ پورے اسلام میں

فکری سطح پر مہیا نہیں کیا جا سکا میرے نزدیک جو کام ہوا ہے وہ ثانوی سطح پر ہوا اعلیٰ سطح پر نہیں ہوا۔ اعلیٰ سطح میں' میں مابعدالطبیعیات' نفسیات' یہ جو اونچی سطحیں ہیں ان کو سمجھتا ہوں ان پر کوئی کام نہیں ہوا۔ ہمارا کام ہوا ہے سوشل میدانوں میں۔ سیاست میں۔ اقتصادیات میں۔ اقتصادیات میں بھی میں سمجھتا ہوں کہ کام بہت کم ہوا ہے اور وہ زمانے کے تقاضے سے بہت ہی پیچھے رہ گیا ہے۔ سیاسی سطح پر کام ہوا ہے اس سے آگے پیچھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ اس لیے یہ ہمارے ذہین طبقہ کو ذہنا" اسلام کے حق میں تبدیل نہیں کر سکا ایک تو یہ بات ہے۔

دوسرا ہمارے مذہبی میدان کا افتراق ہے کہ جو کام جمعہ نماز اور مسجد کے ذریعے سے اخلاقی سطح پر ہو سکتا تھا وہ نہیں ہوا بلکہ اس کو ہتھیار بنایا گیا ہے۔ گروہی فرقہ وارانہ اختلافات کو ابھارنے کا' اس میں ایک تیسرے عنصر نے کام شروع کر دیا جو میرے نزدیک سب سے خوفناک ہے۔ جب مذہب کے نام پر سیاست میں کام کرنے کا موقع ملا' بازار کھلا تو ہر ایک کو احساس ہوا کہ ہم کیوں نہ اپنی قیمت پڑوائیں' پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ جو جماعت بھی اپنی نفری کو اپنے ساتھ زیادہ ملا کر اور دوسروں سے کاٹ کر رکھ سکے وہی زیادہ قیمت لگوا سکے گی تو اس نے اس پورے عمل کو خوفناک بنا دیا ورنہ شاید اتنی شدت نہ ہوتی کہ ہر ایک کو اپنی اپنی بھیڑوں کی ضرورت ہے اور اپنے گلے کو سنبھالنے کے لیے اپنے امتیازات کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔"

دیگر مذاہب کے پیرو کاروں میں غیر مذاہب یا برعکس عقیدہ کے حامل کے لئے تعصب' نفرت' ناپسندیدگی یا خشونت ملتی ہے مسلمانوں نے ان کے برعکس غیر مذاہب سے تو اتنا تعرض نہ کیا مگر خود مختلف اسلامی فرقوں' مسالک اور عقیدہ کے لیے روا داری کے برعکس ہمیشہ معاندانہ جذبات رکھے جس کے باعث اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک فرقہ کی مسجد میں دوسرے فرقہ سے تعلق رکھنے والا نماز ادا نہیں کر سکتا بقول قتیل شفائی:

بجائے ایک کے ملتے ہیں کئی اسلام
یہ حال زار مرے دین بے مثال کا ہے
کسی کے بس میں نہیں احتساب ملا کا
بس انتظار کسی مصطفیٰ کمال کا ہے

ارشاد احمد حقانی جنگ کے معروف تجزیہ نگار ہیں انہوں نے بھی 10 مئی 1994ء کے اخبار میں مذہبی منافرت کے موضوع پر "فی سبیل اللہ فساد کے بدترین مظاہرے" کے عنوان سے ایک کالم لکھا تھا اس کا ابتدائی حصہ پیش ہے:

"پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت کا عفریت ایک عرصے سے زبردست اودھم مچائے ہوئے ہے اور ہماری قومی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ میں گذشتہ کئی سال سے وقتاً فوقتاً اس جن کی تباہ کاریوں اور خون آشامیوں کی طرف توجہ مبذول کراتا رہا ہوں۔ اس کالم کے پرانے قارئین کو یاد ہو گا کہ ایک دفعہ میں نے اپنے سفر بہاولپور کا احوال سناتے ہوئے یہ ذکر کیا تھا کہ جب میں نے نماز پڑھنے کے لیے ایک گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں سے مسجد کا پتہ پوچھا تو ننھے منے بچوں نے برجستہ کہا کہ اگر آپ نے بریلویوں کی مسجد میں نماز پڑھنی ہے تو وہ سامنے ہے' دیوبندیوں کی مسجد ساتھ والی گلی میں ہے اور اہلحدیثوں کی مسجد اس سے بھی دور واقع ہے۔ میں نے بچوں سے صرف مسجد کا پتہ پوچھا تھا لیکن انہوں نے ازخود مسجدوں کی تفریق و تقسیم کا پورا حال بیان کر دیا۔ میں نے اس وقت لکھا تھا کہ گلی میں کھیلنے والے بچوں کے اندر بھی یہ "شعور" پیدا ہو چکا ہے کہ بریلویوں کی مسجد اور ہوتی ہے' دیوبندیوں کی اور' اور اہلحدیثوں کی اور۔ اسے میں نے ایک انتہائی خطرناک علامت قرار دیا تھا اور علمائے کرام سے اپیل کی تھی کہ اس صورت حال کے خطرناک مضمرات کو سمجھیں اور لوگوں میں مذہبی فرقہ واریت کا زہر پھیلانے سے گریز کریں۔ اس وقت جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء پورے عروج پر تھا اور میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ جنرل ضیاء الحق جس قسم کی مذہبیت کے علمبردار اور پرچارک ہیں اور جیسی اسلامائزیشن وہ نافذ کر رہے ہیں اس سے مثبت نتائج تو بہت کم نکل رہے ہیں اور معاشرے میں سچی اسلامی تعلیمات کا بول بالا تو بہت کم ہو رہا ہے البتہ مذہبی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ منافقت کا زور بڑھ رہا ہے۔ بدقسمتی سے آج یہ کیفیت ہمیشہ سے بڑھ کر سنگین اور گمبھیر ہو چکی ہے۔"

پاکستان (اور اب تو پیشہ ور اور فرقہ پرست ملاؤں کے طفیل امریکہ اور دیگر یورپین ممالک میں بھی) تین تین عیدیں منائی جا رہی ہیں۔ دیار غیر میں مسلمان یا پاکستانی بن کر رہنے کے برعکس سنی' شیعہ اور وہابی بن کر رہتے ہیں۔ وہی بات جو پہلے بھی کہی جا چکی ہے

زندگی کی "ہیر" کے لیے ملا کیدو کا کردار ادا کرتا ہے اس کے برعکس صوفی رانجھا بن سکتا ہے مگر ملا نہیں __ جبکہ زندگی کا شعار یہ ہے:

رانجھا رانجھا کردی نیں میں آپے رانجھا ہوئی

ایک عام یا مذہبی مسلمان اور ملا میں اساسی فرق ہی اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کو آزادی عمل کا حق دینے کو تیار ہے مگر ملا نہیں ملا! کا کرداری معیار ملا ہی سے مخصوص ہوتا ہے۔ جہاں تک اسلام کے بنیادی عقاید کا تعلق ہے تو کسی بھی کلمہ گو کو ان کی حقانیت سے انکار نہیں گویا اس لحاظ سے ہر مسلمان بنیاد پرست ہے اور وہ اس بنیاد پرستی پر فخر بھی کر سکتا ہے لیکن تمام مصائب مسالک، عقاید اور فرقوں کی لیبلنگ سے شروع ہوتے ہیں اور یہ فروعی نہیں بنیادی ہیں۔ اقبال نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا:

تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

جبکہ احمد ندیم قاسمی یوں گویا ہوتے ہیں:

میں محبت کا پجاری ہوں، عقیدوں کا نہیں
ان بتوں کو مرے رستوں سے ہٹایا جائے

"کون کافر مجھے کہتا ہے...."

بحیثیت مسلمان ہم کیا ہیں، پاکستان میں اسلام کا کیا حال ہے اور عام پاکستانی مسلمان کس حد تک اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے یوں کہ اقبال کے الفاظ میں وہ قاری نظر آنے کے برعکس "حقیقت میں قرآن" کا اعلیٰ معیار پیش کر سکے۔ تو اس ضمن میں کسی ترقی پسند، سوشلسٹ یا بے دین دانشور کے برعکس ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی رائے نقل کر رہا ہوں:

"اسلام ہے کہاں؟ مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت ہے نہ اسلامی اخلاق نہ اسلامی افکار ہیں نہ اسلامی جذبہ، حقیقی اسلامی روح نہ ان کی مسجدوں میں ہے نہ مدرسوں میں نہ خانقاہوں میں۔ عملی زندگی سے اسلام کا ربط باقی نہیں رہا۔ اسلام کا قانون نہ اس کی شخصی زندگی میں نافذ ہے نہ اجتماعی زندگی میں، تمدن و تہذیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا نظم صحیح اسلامی طرز پر باقی ہو۔ ایسی حالت میں دراصل مقابلہ اسلام اور مغربی تہذیب کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی افسردہ، جامد اور پس ماندہ تہذیب کا مقابلہ ایک ایسی تہذیب سے ہے جس میں زندگی ہے، حرکت ہے روشنی علم ہے، گرمی عمل ہے۔ ایسے نامساوی مقابلہ کا جو نتیجہ

ہو سکتا ہے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ مسلمان پسپا ہو رہے ہیں ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے۔" ("تنقیحات" ص: 40)

مولانا مودودی صاحب سے بہت پہلے مصحفی اپنے شاعرانہ اسلوب میں بھی اسی سے ملتی جلتی بات کر گیا:

نہ شریعت' نہ طریقت' نہ حقیقت' نہ مجاز
کون کافر مجھے کہتا ہے مسلمان ہوں میں

"غسل دہ ایں منبر۔۔۔:"

ان دنوں ہر طرح کے پاکستانی امریکہ اور یورپ کا رخ کر رہے ہیں۔ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگلے دس برس میں اسلام امریکہ کا دوسرا بڑا مذہب بننے والا ہے مگر اسلام کے پیروکار' تبلیغی جماعتوں کے اراکین' مذہبی شخصیات اور ملا لوگ وہاں بھی اپنے پالتو تعصبات' فروعی مسائل' سیاسی رقابتوں اور لسانی جھگڑوں اور عقاید کی آویزشوں کا مظاہرہ کرتے ہیں یعنی پاکستانی یا مسلمان ہونے کے برعکس باقی سب کچھ ثابت ہوتے ہیں۔ ہاں سور نہ کھانے پر مسلمانوں میں مکمل اتفاق رائے ملتا ہے مگر اور کسی بات میں نہیں۔ میں امریکہ میں یہ سب کچھ دیکھ چکا ہوں جس کا کچھ احوال میرے سفرنامہ "اک جہاں سب سے الگ" میں درج ہے۔ اس ضمن میں "سیارہ ڈائجسٹ (لاہور: ستمبر 1993ء) سے ڈاکٹر خالد ہاشمی کے "امریکہ سے ایک کھلا خط" کا ابتدائی حصہ پیش ہے:

"یہ نیو جرسی کی ایک مسجد کا واقعہ ہے' ایک صاحب نے جذبہ اسلام سے سرشار ہو کر مسجد قائم کی۔ ایک صاحب جو نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے انہیں پیش امام بنا دیا گیا۔ خوب زور شور سے تبلیغ کا کام شروع ہوا دیکھتے ہی دیکھتے نیو جرسی میں مسجد قائم کرنے والے اور مسجد کے پیش امام صاحب کے چرچے گھر گھر پھیل گئے۔ ابھی ان چرچوں کو سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ عید سر پر آ گئی مسجد کے مالک (آج کل مسجد کا مالک اللہ نہیں بندے ہیں جن کے نام پر مسجدیں خریدی جاتی ہیں) اور پیش امام صاحب کے درمیان نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں پیش امام صاحب نے مسجد کے آدھے حصے پر قبضہ کر لیا اور اپنے نظریے کے مطابق اسلام کی خدمت کرنے کی ٹھانی لیکن

مسجد کے مالک نے پیش امام صاحب کے کاروبار کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا- عدالت جہاں ایک ٹوپی والا جج یہودی بیٹھا تھا- اس نے ان دونوں مسلمانوں سے اتنا پوچھا مجھے صرف اتنا بتاؤ جب دو بھائیوں میں جھگڑا ہو جائے تو اسلام انہیں کیا ہدایت کرتا ہے- دونوں افراد یک زبان ہو کر بولے- مذہب کے مطابق رنجش دور کر کے گلے مل جانا چاہیے جج نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا- جب تم سب جانتے ہو تو پھر یہاں کیوں آئے' دونوں کی گردنیں جھک گئیں' بڑے شرمندہ ہوئے اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے آئے- لیکن چند دن کے بعد یہ دونوں اسلام کے متوالے ایک بار پھر اسی جج کی عدالت میں کھڑے تھے اپنے اپنے گواہوں کے ساتھ— پھر وہی جج تھا- اس بار تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ عدالت نے دونوں مبلغوں کو مسجد کے دونوں حصوں کا جز وقتی سٹے آرڈر دے دیا- جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مسجد کا مقدمہ ابھی تک عدالت میں ہے- نماز کے اوقات میں اس مسجد میں جانے والے نمازی بیک وقت ایک ہی جگہ سے دو اذانیں سنتے ہیں اور اپنے اپنے پسندیدہ شخص کے حصے والی مسجد میں جا کر نماز پڑھتے ہیں- پورے امریکہ میں ایسی کئی مسجدیں موجود ہیں جہاں نظریات اور لسانی بنیادوں پر مسجدوں کے مقدمے لڑے جا رہے ہیں- کہیں انڈین پاکستانی بنگلہ دیشی مسلمانوں کے درمیان کوئی مسجد بے چاری عدالت میں گھسیٹی جا رہی ہے تو کہیں دو پاکستانی گروپ چندے کی تقسیم پر مسجد کو عدالت میں لیے کھڑے ہیں-"

ان حالات میں نظامی گنجوی کی وہ نعت کیوں نہ یاد آئے جس میں اس نے یہ دعا مانگی:

خاک تو بوی بولایت سپرد
بار نفاق آمدو آں بوی برد
باز کش ایں مسند از آسودگاں
غسل دہ ایں منبر از آلودگاں

"لہو پکارے گا:"

میں اپنے ہاتھ پہ کس کا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

21 اپریل علامہ اقبال کے انتقال کا دن ہے اور اس وجہ سے قومی اہمیت کا حامل لیکن 1994ء کے 21 اپریل کو گوجرانوالہ شہر میں جو کچھ ہوا اس کی بنا پر یہ دن ہمارے کیلنڈر میں قومی سوگ کے لئے مخصوص کرایا جانا چاہیے مذہبی جنون کا ایسا واقعہ کہانی میں بھی ناقابل یقین معلوم ہوتا جو چڑھے سورج میں رونما ہوا۔ اس ملک میں جو اس لئے بنایا گیا تھا کہ ہم متعصب ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم نے پاکستان میں اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے اور حضور صلعمؐ کے اسوۂ مبارک پر عمل پیرا ہونا ہے۔

ذرا ذرا سی بات پر کفر کے فتوے جاری کرنے والے اور بات بے بات دائرہ اسلام سے خارج کرنے والے علماء کرام کی اکثریت کیوں خاموش رہی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

ذیل میں خبر کے مکمل متن کے ساتھ نعیم صدیقی اور عطاالحق قاسمی کا ردعمل درج ہے مکمل صورت میں:

"گوجرانوالہ (نمائندہ جنگ) تھانہ سبزی منڈی کے علاقہ اسد کالونی میں حافظ قرآن عطائی ڈاکٹر نے بیوی سے جھگڑے پر گھر میں موجود قرآن پاک نذر آتش کر کے شہید کر دیا۔ بیوی کے واویلا کرنے پر اہل محلّہ نے عطائی ڈاکٹر کو زد و کوب کر کے پولیس چوکی کھیالی شاہ پور کے حوالہ کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی چوکی کے باہر مشتعل ہجوم اکٹھا ہو گیا اور پولیس سے مطالبہ کیا کہ ملزم ہمارے حوالے کرو' انکار پر لوگوں نے چوکی پر اینٹوں اور پتھروں سے حملہ کر دیا۔ ملزم کو ہتھکڑی سمیت قابو کر کے خشت باری سے ادھ موا کر کے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی جس سے ملزم موقع پر ہلاک ہو گیا۔ عوام نے اس کی لاش کو پورے علاقے کی گلیوں اور بازاروں میں گھسیٹا' بعد ازاں جلوس کی شکل میں کھیالی شاہ پور سے لاش گھسیٹتے ہوئے چوک گوندانوالہ لا رہے تھے کہ بکر منڈی کے قریب انتظامیہ کی منت سماجت پر لاش پولیس کے حوالے کر دی جسے پوسٹ مارٹم کے لئے دسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ تفصیلات کے مطابق ڈاکٹر امجد فاروق جو کہ حافظ قرآن بھی تھا۔ عرصہ دراز سے اسد کالونی شیخوپورہ موڑ پر رہائش پذیر تھا۔ وہ ملحقہ مدینہ کالونی میں ڈاکٹری کی دوکان کرتا تھا۔ گذشتہ صبح گھر میں مکان کی تعمیر پر اپنی بیوی سے جھگڑ پڑا اور غصے میں آ کر گھر میں موجود قرآن پاک کو نذر آتش کر کے شہید کر دیا جس پر اس کی بیوی نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ظالم شخص اس سے بہتر تھا کہ مجھے جلا دیتا تو نے دنیا میں جہنم کیوں خرید لی۔ اس کی بیوی کے شور مچانے پر اہل محلّہ جمع ہو گئے جنہوں نے ڈاکٹر امجد فاروق کو زدو کوب کر کے چوکی کھیالی شاہ پور پولیس کے حوالہ کر دیا جہاں

اسے ہتھکڑی لگا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس واقعہ کی خبر پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ کثیر تعداد میں چوکی کے باہر جمع ہو گئے۔ انہوں نے پولیس سے مطالبہ کیا کہ ملزم کو ان کے حوالے کیا جائے۔ انکار پر مشتعل افراد نے چوکی پر دھاوا بول دیا۔ پولیس کی مزاحمت پر عوام نے خشت باری شروع کر دی جس سے پولیس اہل کار شدید زخمی ہو گئے جبکہ باقی بھاگ گئے۔ مشتعل عوام نے چوکی کا آہنی گیٹ توڑ کر خشت باری سے چوکی کے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے بھی توڑ دیئے اور حافظ ڈاکٹر امجد فاروق کو ہتھکڑی سمیت سڑک پر لا کر اینٹوں اور پتھروں سے مار مار کر ادھ موا کر دیا بعد ازاں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی جس سے امجد فاروق موقع پر ہلاک ہو گیا۔ بعد ازاں مشتعل عوام نے ہتھکڑی پکڑ کر اس کی لاش کو کھیالی شاہ پور اور اس سے ملحقہ کالونیوں کی گلیوں اور بازاروں میں گھسیٹا۔ بچے بوڑھے جوان اور عورتیں اس کی لاش پر تھوکتے رہے۔ بعد ازاں اس کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے گوجرانوالہ شہر چوک گوندانوالہ میں لا کر دوبارہ آگ لگانے کے لئے جلوس کی شکل میں آ رہے تھے کہ بکر منڈی اور فروٹ منڈی کے درمیان ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جنرل فضل عباس میکن اور ڈی ایس پی سٹی ملک طاہر محمود خاں کی منت سماجت پر لاش پولیس کے حوالے کر دی جسے پوسٹ مارٹم کے لئے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال گوجرانوالہ پہنچا دیا گیا۔ ہلاک ہونے والے ڈاکٹر کے 6 بچے ہیں جو وقوعہ کے وقت سکول گئے ہوئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد امجد فاروق کی بیوی اور بچے رو پوش ہو گئے جبکہ پورے علاقے میں خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو گئی اور دکانیں و بازار بند کر دیئے گئے۔

این این آئی کے مطابق تھانہ سبزی منڈی پولیس نے مارے جانے والے ڈاکٹر کے خلاف قرآن پاک کی بے حرمتی کرنے پر مقدمہ بھی درج کر لیا جبکہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے جرم میں تین افراد کو حراست میں لے لیا گیا جن کے نام صیغہ راز میں رکھے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ حافظ فاروق کالا علم اور تعویذ دھاگے کا کام کرتا تھا۔"

(روزنامہ جنگ 22 اپریل 1994ء)

اگلے روز اس روز نامہ کے لئے جمیل چشتی نے یہ رپورٹ مرتب کی:

"لاہور (رپورٹ جمیل چشتی) گوجرانوالہ کی مساجد سے اچانک یہ اعلان ہوئے کہ ایک نو مسلم نے قرآن پاک شہید کر دیا ہے۔ جس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر آ گئے' انہوں نے پولیس چوکی توڑ کر زیر حراست ڈاکٹر سجاد فاروق کو باہر نکالا اور سنگسار

کر دیا' اسے جلایا گیا اور پھر موٹر سائیکل کے ساتھ لاش باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ سب لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ایک کافر کو مار رہے ہیں لیکن اس کے گھر والے اور دوست احباب کہتے ہیں وہ نہ صرف سچا مسلمان بلکہ عالم دین تھا۔ وہ جب مر رہا تھا تب بھی وہ سورہ یٰسین کی تلاوت کر رہا تھا' اس کے جسم پر تین مرتبہ تیل پھینک کر آگ لگائی گئی لیکن اس کے کپڑے جلے وہ نہ جل سکا۔ یہ یا تو سب غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور یا اس میں اس کے مخالفین کی منصوبہ بندی شامل تھی کیونکہ اس کے محلّہ کی مسجد جہاں پہلا اعلان ہوا وہاں کی انتظامیہ کے مطابق یہ اعلان ان کی طرف سے نہیں کیا گیا۔ ایک اعلان ہوا اور پھر دوسری مساجد سے اعلان ہونا شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر سجاد فاروق کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے رکن قاری حبیب اللہ کا بیٹا تھا اور یہ لوگ پہلے قلعہ دیدار سنگھ میں رہتے تھے اور تقریباً پندرہ برس قبل وہاں سے چلے آئے اور گوجرانوالہ کی اسد کالونی میں مقیم ہو گئے۔ یہاں آ کر اس نے شادی کی اور اس کے سسرال والے اس کے گھر کے قریب ہی مقیم ہیں۔ ڈاکٹر سجاد فاروق کو شروع ہی سے مذہب سے لگاؤ تھا اس نے ایم اے اسلامیات اور پھر ایم اے عربی کیا۔ اس نے قرآن پاک حفظ کیا اور مختلف مدارس سے دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے برادر نسبتی محمد عنایت کے مطابق ڈاکٹر سجاد فاروق مدینہ کالونی میں اپنا کلینک چلا رہا تھا اور اس نے باقاعدہ طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ تقریباً ایک ماہ قبل اس نے اس کالونی میں پونے چار مرلے زمین لی اور اس پر مکان تعمیر کرنا شروع کر دیا اس کے دو کمرے بن چکے ہیں اور باقی کمرے ابھی زیر تعمیر ہیں جہاں گزشتہ روز تک مزدور کام کر رہے تھے۔ وہ خود بیوی بچوں سمیت یہاں رہتا۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا' صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور سورۃ یٰسین پڑھتا' اس کے 6 بچے ہیں جن میں سے 5 لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ سب سے بڑا لڑکا سلمان 10 سال کا اور سب سے چھوٹا لڑکا دس ماہ کا ہے' چار بچے سکول میں زیر تعلیم ہیں۔ ڈاکٹر سجاد فاروق کی بیوی شمیم جس کے بارے میں ایک روز قبل یہ بتایا گیا تھا کہ اس نے پولیس کو اطلاع دی تھی کہ اس کے شوہر نے قرآن پاک شہید کر دیا ہے نے گزشتہ روز روتے ہوئے کہا کہ میں تو اپنے شوہر کو بچاتی رہ گئی اور کہا کہ میرا شوہر ایسی ناپاک جسارت نہیں کر سکتا۔ اس نے بتایا کہ جمعرات کو صبح میرے شوہر معمول کے مطابق اٹھے' نماز پڑھی اور پھر انہوں نے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی' وہ 14 سال سے روزانہ گھنٹوں بیٹھ کر سورۃ یٰسین کی تلاوت کرتے۔ تقریباً 10 بجے [illegible] جب گھر میں مزدور کام کر رہے تھے انہوں نے مجھے کہا کہ جاؤ جا کر اگر بتیاں لے آؤ میں گھر سے

چلی آئی- میں سوئی گیس کے چولہے پر چائے گرم کرنے کے لئے رکھ آئی تھی میرے آنے کے بعد بھی میرے شوہر بیٹھے قرآن پاک پڑھتے رہے- اچانک چائے ابل کر باہر گرنا شروع ہو گئی وہ جلدی سے اٹھے اور چائے اتارنے لگے اس دوران وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور قرآن پاک سمیت سٹوو پر گرے جس سے قرآن پاک کا ایک ورق جل کر شہید ہو گیا کیونکہ وہ بہت زیادہ مذہبی تھے اس لئے انہوں نے بلند آواز میں کہا کہ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا ہے- ہمارے گھر کے سامنے ایک خاتون رہتی ہے اس کا شوہر بھی تب گھر میں موجود تھا' ان کے ساتھ ہماری چپقلش چلی آ رہی تھی' عورت نے میرے شوہر کی آواز سنی اور آ کر دیکھا اور پھر سارے محلّہ میں شور مچا دیا کہ ڈاکٹر نے قرآن پاک شہید کر دیا ہے یہ سنتے ہی بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے-

اس نے مزید کہا کہ سب سے پہلے کسی نے کہا کہ ایک عطائی ڈاکٹر نے قرآن پاک شہید کر دیا اور پھر اعلان یہ شروع ہو گئے کہ عیسائی ڈاکٹر نے قرآن پاک کو آگ لگا کر شہید کر دیا ہے- اس نے کہا کہ ہمارے خاندان کے تمام افراد کے نزدیک اس معاملہ کو ڈاکٹر سجاد کے پڑوسیوں نے اٹھایا جن سے ان کی عداوت تھی اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو جان بوجھ کر بھڑکایا گیا- اس نے کہا کہ یہ قتل انہیں لوگوں کی منصوبہ بندی کی وجہ سے ہوا- اس طرح ایک سچے مسلمان کو مار کر اس کا گھر تباہ کر دیا گیا- پولیس والوں نے بتایا کہ وقوعہ کے روز چوکی انچارج ظفر شاہ ڈیوٹی پر موجود تھے کہ سوا گیارہ بجے اطلاع ملی کہ اسد کالونی میں کسی نے قرآن پاک شہید کر دیا ہے جس پر وہ وہاں گئے- وہاں لوگ جمع تھے وہ ڈاکٹر سجاد فاروق کو پکڑ کر تھانے لے آئے یہاں اسے ہتھکڑی لگا کر عقبی کمرے میں بند کر دیا گیا- ابھی تفتیش بھی نہ کی تھی کہ مساجد میں اعلان ہونے شروع ہو گئے اور پھر ہزاروں افراد چوکی آ گئے- تب وہاں ایک سب انسپکٹر 2 اے ایس آئی اور 3 کانسٹیبل موجود تھے جو ہجوم کے سامنے بے بس ہو گئے- یہ لوگ ڈاکٹر سجاد کو چوکی سے باہر لے آئے- اس دوران وہاں سے اینٹوں کی ٹرالی گزری لوگوں نے اسے روک لیا اور ڈاکٹر سجاد کو سڑک کے درمیان کھڑے کر کے ٹرالی سے اینٹیں اٹھا اٹھا کر مارنا شروع کر دیا' ہتھکڑی پکڑ کر گھسیٹا' آگ لگائی اور پھر پولیس کی مزید فورس آ گئی جنہوں نے کارروائی کر کے لوگوں سے لاش حاصل کر کے اس کے گھر پہنچائی جسے رات میں سپرد خاک کر دیا گیا- پولیس کے مطابق انہیں مقتول کی بیوی نے اطلاع نہیں دی بلکہ ایک محلّہ دار نے فون پر اطلاع دی تھی جس کے بعد وہاں گئے' تب لوگوں نے بتایا کہ ایک رکشہ ڈرائیور نذیر کی بیوی نے ڈاکٹر سجاد کو قرآن پاک

شہید کرتے ہوئے دیکھا تھا تاہم ابھی پولیس نے اپنے طور پر تصدیق نہیں کی تھی۔
قریب ایک گھر میں کوئی فوت ہوا تھا وہاں دواڑھائی سو افراد جمع تھے وہ بھی یہ سن کر وہاں آگئے۔ اس دوران میں میری بہن کے بچے اور دوسرے رشتہ دار بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں بھاگ کر اندر گئی تو میرے شوہر نے مجھے ساری بات بتائی' لوگ مشتعل ہو چکے تھے انہوں نے میرے شوہر کو مارنا شروع کر دیا۔ میں' میری بہن اور بچے جب آگے بڑھے تو انہوں نے ہمیں زد و کوب کیا اور پھر ایک شخص نے بلند آواز میں کہا یہ بھی کافر ہیں انہیں پکڑو مار ڈالو۔ ہم نے مشکل سے جان بچائی اور وہاں کھڑے لوگوں کو سمجھاتے رہے۔ لوگوں نے ہمیں گھر کے کمرے کے اندر بند کر دیا' وہ جالی کے اندر سے آواز دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ آپ غلط سمجھ رہے ہیں اور وہ مسلسل سورۃ یٰسین پڑھے جا رہے تھے۔ اس کے بعد نا معلوم کون پولیس چوکی پہنچ گیا اور وہاں سے سفید پارچات میں ملبوس دو پولیس ملازمین وہاں آگئے۔ تب لوگ بضد تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم اس کافر کو مسجد میں لے کر جائیں گے۔ تب پولیس والوں نے لوگوں کو کہا کہ ہم انہیں مسجد میں ہی لے چلتے ہیں اور پھر بہانے سے میرے شوہر کو پولیس چوکی لے گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ چوکی کے باہر اکٹھے ہو گئے' وہ آہنی جنگلہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور میرے شوہر کو ہتھکڑی سمیت باہر لے آئے۔ اس پر اینٹوں کی بارش کر دی اور پھر اسے جلانے کی کوشش کی اور پھر دو نوجوان ہتھکڑی موٹر سائیکل کے ساتھ باندھ کر لاش شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے رہے۔ ڈاکٹر سجاد کی بیوہ نے مزید کہا میں لٹ گئی میرے ساتھ بہت ظلم ہو گیا اور میرا شوہر میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو گیا۔ میرا شوہر مرتے وقت تک سورۃ یٰسین پڑھ رہا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ تب بھی لوگوں نے یہ کہا کہ اس کافر کے بیوی بچوں کو بھی آگ لگا دو لیکن ہم بڑی مشکل سے بچے اور گھر بار چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈاکٹر سجاد کی خواہر نسبتی زینت نے کہا کہ لوگوں نے تین چار مرتبہ ڈاکٹر سجاد پر تیل پھینک کر آگ لگائی لیکن کیونکہ وہ سورۃ یٰسین پڑھتے ہوئے گئے اس لئے دنیا شہادت دے گی کہ ان کے کپڑے جل گئے لیکن ان کا جسم نہ جل سکا۔

دوسری طرف ڈی ایس پی فضل کریم کے مطابق محلہ میں کسی نے کوئی شرارت نہیں کی تھی اور میرا تھانے دار اسے جا کر تھانے لے آیا تھا لیکن اس کے بعد لوگوں کا ہجوم وہاں پہنچ گیا اور اس کے بعد تقریباً 20 منٹ کے اندر اندر لوگوں نے ساری کارروائی کر ڈالی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ مرنے والا ہر وقت قرآن پاک پڑھتا رہتا تھا

اور نیک آدمی تھا۔ پولیس نے اسے ہلاک کرنے والوں کے خلاف قتل اور دوسری دفعات کے تحت مقدمہ درج کیا جس میں 5 ملزم نامزد ہیں جن میں سے 2 محمد عباس اور ضیاء بٹ موقعہ سے گرفتار کر لئے گئے اور گزشتہ روز ہی انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر سجاد کی خواہر نسبتی پروین جو پاگلوں کی طرح محلّہ میں بین کرتی پھر رہی تھی اس نے کہا کہ ہمارا بھائی دس سپارے اور 12 مرتبہ سورۃ یٰسین روزانہ پڑھتا تھا اور میں ان افراد کی نشاندہی کر سکتی ہوں جنہوں نے ایک اتفاقی حادثے کو جان بوجھ کر ایسے بنا دیا کہ لوگ اشتعال میں آ گئے۔ اس نے بتایا کہ میرا بھائی چولہے پر گرا تو اس کے سر پر بھی زخم آیا اور خون بہنے لگا' میں گئی تو اس نے مجھے کہا کہ اٹھتے ہوئے سٹوو پر گر گیا ہوں لیکن مخالفوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر سجاد فاروق کے کمرے کے اندر قاضی حسین احمد کا پوسٹر لگا تھا وہاں پر موجود حلقہ 33 جماعت اسلامی کے سابق ناظم قاری محمد اعظم جو نابینا ہیں نے بتایا کہ میں ڈاکٹر سجاد فاروق کو ڈیڑھ دو سال سے جانتا ہوں' وہ میرے دوست تھے' وہ روزانہ سوا دس سپارے پڑھتے' مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ان پر جو الزام لگایا گیا ہے وہ درست ہے اور میری ذاتی رائے میں ایک بے گناہ کا ناحق قتل ہوا ہے' یہ ظلم ہوا ہے اور اس کی علماء نے جمعہ کے خطبات میں مذمت کی ہے۔ اس سارے واقعہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے کس مسجد میں اعلان ہوا اور یہ کن افراد نے کیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے اسد کالونی سے پتہ کیا گیا تو بتایا گیا کہ یہاں مسجد غوثیہ رضویہ ہے جہاں سب سے پہلے اعلان ہوا۔ وہاں پر امام مسجد محمد شفیع رضوی موجود تھے جنہوں نے کہا کہ وہ ایسی بات نہیں کریں گے جو آنکھوں سے دیکھی نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں اس مسجد میں نہیں تھا اور مسجد میں جمعہ پڑھاتا ہوں' اس مسجد میں دوسرے امام پڑھاتے ہیں تاہم جب واقعہ ہوا تب مسجد میں کوئی نہیں تھا۔ انہیں پتہ چلا ہے کہ کچھ افراد آئے انہوں نے امام صاحب کے گھر سے چابیاں حاصل کیں اور خود ہی اعلان کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس مسجد میں ہونے والے اعلان کا مسجد کی انتظامیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

جماعت اسلامی کے معروف ادیب اور سکالر نعیم صدیقی نے "اینٹوں کی اصل زد" (تکبیر کراچی 12 مئی 1994ء) میں یہ لکھا:

"گوجرانوالہ میں ایک سفاکانہ قتل ہوا' پاگل ہجوم (Rudy Mob) نے مذہب کے نام پر ایک تعلیم یافتہ' پابند صوم و صلوٰۃ' نقیب خیرو فلاح' عزیز محلّہ' حافظ قرآن' بہ حیثیت معالج خدمت گزار مریضاں کو بلا تحقیق' صفائی کا موقع دیئے بغیر نہ صرف انتہائی وحشیانہ طور پر

قتل کر دیا بلکہ اس کی نعش کو جلانے کی کوشش کی گئی' تصرف الٰہی ایسا ہوا کہ آگ نے اس کے بدن کو جلانے سے انکار کر دیا' اگرچہ دوبار مٹی کا تیل چھڑک کر اس کے جسم کو شعلوں کا لقمہ بنانے کی کوشش کی گئی' ناکامی کے بعد دو اڑھائی ہزار کے لگ بھگ انسانی اجسام کے سامنے اسکوٹر سے باندھ کر میت کو سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔

اخبار نے پہلے دن 21 اپریل (یوم اقبال) کے اس بہیمانہ سانحہ کی غیر صحیح بد خبری قارئین کے ذہنوں میں انڈیل دی جس کا ملخص یہ تھا کہ قرآن جلانے والے کسی شخص (عیسائی) کو عوام نے جمع ہو کر قتل کر دیا' دوسرے دن صحیح مگر بدتر خبر کو پیش کیا گیا کہ ایک مسلمان حافظ قرآن بعض لوگوں کی ذاتی پرخاش کا اور آس پاس کی مساجد کے سلاطین کے فرقہ وارانہ انتقامی جذبات کا شکار ہوا اور اللہ نے اسے مظلومانہ شہادت کے رتبہ اعلیٰ سے نوازا۔

آخری تفتیش جو اخبارات نے اپنے ذرائع سے کی اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ سانحہ ایک رکشا والے' ایک عورت اور فرقہ پرست مولویوں کی لاؤڈ اسپیکر بازی سے ہوا' سارا کچھ اس مثلث کے اندر ہے۔ گوجرانوالہ جیسے دینی قصبے کو فوری طور ہڑتال کر دینی چاہیے تھی تاکہ معاملہ پارلیمنٹ میں زیر بحث آتا۔

مبینہ طور پر قاری حبیب اللہ کا بیٹا ایم اے اسلامیات' ایم اے عربی' روزانہ دس پارے تلاوت کرنے والا ڈاکٹر سجاد فاروق جسے پہلے دور کی مار پٹائی کے بعد ہجوم کے تصرف سے پولیس والے نکال لے جانا چاہتے' مگر وہ جب چوکی (تھانہ) پہنچے تو ہجوم نے اینٹوں کی بارش کر دی' بیرونی دروازہ توڑ ڈالا' چھت پر چڑھ کر چھت توڑنے لگے اور دوسری طرف کمرہ حوالات کا دروازہ توڑ لیا گیا اور ملزم کو گھسیٹ کر باہر لے آئے' ہتھکڑی لگی ہوئی تھی' پولیس کے آدمی کم اور اختیارات صفر تھے۔

اس جواں سال خوبصورت باریش نوجوان کو سڑک پر پھینک کر اینٹوں کی بارش کر دی' مظلوم چیختا رہا کہ "میری بات تو سنو" مگر گوش شنوائی کہاں۔ حملہ آوروں کا کہنا تھا "ہم کافر کو مار رہے ہیں" بعض نے کہا "اس عیسائی شیطان کو ختم کرو" پھر آگ لگانے کی دو کوششیں مٹی کا تیل چھڑک کر کیں' مگر آگ نے جواب دے دیا پھر اسے موٹر سائیکل کے پیچھے ہتھکڑی میں رسی ڈال کر باندھا گیا اور ایک کلو میٹر سے زیادہ فاصلے تک گھسیٹا گیا' اس طرح "جہادی سبیل جہالت" کو فتح تک پہنچا دیا۔ مسلمانو مبارک ہو! اس کی بیوی کو دیکھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ یہ کافر کی بیوی ہے اسے بھی ختم کر دو' وہ کسی طرح بچوں سمیت

بھاگ گئی۔

اب سلسلہ شرارت کا آغاز ملاحظہ ہو' اس ڈرامہ کا اہم کردار نذیر رکشا والا' جو محلے میں ڈیک کو بلند آواز سے بجایا کرتا تھا (ٹیپ وغیرہ کے گانے زائد لاؤڈ اسپیکروں کے ساتھ) اور اسے حافظ سجاد فاروق عام نرم طریقے سے سمجھایا کرتا تھا کہ یہ کام اچھا نہیں۔ اس سے ہلکی سی چڑ اور مخالفت نذیر میں پیدا ہو کر بڑھنے لگی۔ اس نے اپنے گروپ کے ساتھ مشورے کئے کہ اس شخص کو یہاں رہنے نہ دیا جائے بلکہ تنگ کر کے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے۔ شاید ایسی نجوئی بالشر کے تحت ایک دن نذیر منہ اٹھائے سیدھا حافظ فاروق (شہید) کے گھر میں جا گھسا' اس کا گھر چونکہ حافظ صاحب کے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر تھا اس لئے وہ تاک جھانک کرتا رہتا۔ حافظ فاروق نے اس سے کہا کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت یوں گھس آنا ٹھیک رویہ نہیں۔ اس نے آگے سے تو تو میں میں شروع کر دی' حتیٰ کہ جھگڑا ہو گیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے' لوگوں نے آکر بیچ بچاؤ کرایا' اسی لئے ان دنوں حافظ فاروق کے گھر میں دیواریں اونچی کرانے اور ایک کمرہ مزید تعمیر کرانے کا کام ہو رہا تھا۔

21 اپریل کو نذیر رکشا والے کی بیوی پروین' حافظ صاحب کے گھر آئی اور اس نے شور مچا دیا کہ ڈاکٹر قرآن جلا رہا ہے' بعد میں گھر کے باہر نذیر رکشا والا لوگوں کو اکھٹا کر کے بتا رہا تھا کہ اس کی بیوی نے ڈاکٹر فاروق کو قرآن جلاتے دیکھا ہے' بس بم چلانے کے لئے بارود مل گیا۔

اب ذرا مذہب کے چوہدریوں کے کمالات بھی دیکھئے۔ ہجوم میں دو چار اشخاص نے شرافت کی اپیل کی یا احتجاج' تو ان کو جواب ملا کہ یہ لوگ بھی وہابی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے واضح ہو گیا کہ ہجوم کی اکثریت "وہابیوں" کی دشمن تھی وہ ایک "وہابی" کو تو مقتل میں لے جا رہی تھی' مگر جس جس نے ان سے اختلاف کیا اسے "وہابی" کہہ کر گویا یہ دھمکی دی گئی کہ تم بھی ایسے ہی مجرم ہو اور تم کو بھی کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ کن خیالوں کے عالموں کی بوئی ہوئی فصل آج لہلہا رہی تھی اور فاروق کے خون سے مزید شاداب ہونے والی تھی۔

قریب کی مسجد غوثیہ (منسوب بہ حضرت گیلانی) ورضویہ (یعنی مولانا احمد رضا خاں کی عقیدت کا مرکز) سے یہ جھوٹا اعلان اور اشتعال انگیز فتویٰ نشر ہوا کہ ایک عطائی ڈاکٹر نے قرآن پاک کو آگ لگا دی ہے' وہ واجب القتل ہے' مسلمانو! اکھٹے ہو جاؤ (ایسے ہوتے ہیں مسلمانوں کے اتحاد کے مواقع!) کچھ وقفے کے بعد دوسرا اعلان نشر ہوا کہ "عیسائی ڈاکٹر نے

قرآن کو شہید کر دیا ہے" بعض روایات دو قرآنوں کی ہیں- اسے زندہ نہ چھوڑو' جان سے مار دو-

اسی مسجد یا دوسری مسجد سے اعلان ہو رہا تھا کہ مسلمانو! تمہیں کالی کملی والے کا واسطہ ایک عیسائی نے قرآن پاک جلا دیا ہے' بے حرمتی کی ہے' ہماری زندگی کا کیا فائدہ' اگر ہم ڈرتے رہے اور اسے زندہ رہنے دیا (جیسے مسجدیں خون کے پیاسوں کے اڈے بن گئی ہیں)

مولوی شفیع فرماتے ہیں کہ میں موجود نہیں تھا' معلوم نہیں کس نے اعلان کئے اور پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے' ہاتھوں اور چہرے کی اشاراتی حرکات کے انداز سے فرمایا کہ اس گھر کی لڑکیوں (یعنی حافظ فاروق شہید کی صاحبزادیوں) کا چال چلن ٹھیک نہیں- عالم دین اور ایسی باتیں؟ کبھی ڈاکٹر کو سمجھایا؟ ہمارے تفرقہ باز مولویوں کے ہاتھوں میں یہ لاؤڈ اسپیکر ایسی توپیں بلکہ میزائل ہیں کہ ان سے یہ اردگرد تباہی پھیلا سکتے ہیں-

میں علمائے کرام کے درجات سے قطع نظر سب کا احترام کرتا ہوں' فرقوں کے اختلافات کو دیکھے بغیر' میں تو کئی سال سے ایک موذن اور خادم مسجد کی بھی عزت کرتا ہوں' کیونکہ سبھی لوگ کسی نہ کسی شکل میں دین کی خدمت کر رہے ہیں- میں اوپر کے سخت لہجے کے لئے معافی چاہتا ہوں مگر کاش ایسا ہوتا کہ علماء کرام کی ایک بے لاگ تحقیقاتی مجلس سارے قصے کو رپورٹ کی شکل میں سامنے لا کر خادمان دین کے چہرے عزت کے نور سے چمکا دیتی' کاش ملکی عدالت عالیہ براہ راست اس واقعہ کا نوٹس لیتی- میری مشکل یہ ہے کہ محض دین کی خدمت و محبت کی وجہ سے مجھے اس پورے طبقے کے مقابل میں کھڑے ہو کر علماء کا اس لئے دفاع کرنا پڑتا ہے کہ سیکولر اور دنیا پرست لوگ اسلام کو براہ راست برا بھلا چونکہ کہنے کی جرات ابھی تک نہیں رکھتے' لہٰذا رجعت پسند مولویوں اور تنگ نظر ملاؤں کو گالیاں دیتے ہیں- اس لڑائی کو لڑتے لڑتے مجھے کئی سال ہو گئے ہیں' لیکن اس وقت میرے ہاتھ کمزور ہو جاتے ہیں جب دینی طبقوں میں سے کوئی بڑا یا چھوٹا خود دین کو کاری ضربیں لگاتا ہے' قرآن اور حدیث اور جناب رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ذاتی پست جذبات کے لئے استعمال کرتا ہے- اس وقت اگر لادینیت کے محاذ سے ہمارے علماء کی کسی فاش غلطی پر فائر کیا جائے تو میں اور میرے جیسے ناتواں سپاہی' شرم سے آنکھیں جھکا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں' اس احساس کی رعایت دیجئے' کیا آپ حضرات میں سے خود کوئی نکل کر موقع پر گیا اور اس نے ہجوم کو راہ ہدایت پر لگانے کی کوشش کی؟

کیا آپ نے ڈاکٹر فاروق کو قرآن جلاتے دیکھا؟ یا بعد میں جلے ہوئے قرآن کو دیکھا؟ کیا

آپ نے نذیر رکشا والے کی بیوی سے تحقیق کی؟ کیا آپ نے ڈاکٹر فاروق اور اس کے باپ اور گھرانے کو مخالف دین، دشمن قرآن یا کم سے کم عملاً تارک دین ماحول کی بحیثیت بچشم خود یا بہ شہادت گواہان کچھ جانا؟ کیا آپ مجاز تھے کہ کسی عدالت کے ذریعے ضروری کارروائی کیے بغیر کسی صاحب ایمان، بلکہ کافر تک کے لئے یہ حکم جاری کرتے کہ اسے مار ڈالا جائے؟ کیا کالی کملی (صلی اللہ علیہ وسلم) والے نے اس طرح کے مجمعوں کو بلا کر اور انہیں پاگل بنا کر لوگوں کو مجرم بنانے اور قتل کرانے کا نظام قائم کیا تھا؟ یا خلفائے راشدین نے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ بلا عدالت تحقیق یا حفاظت خود اختیار کے بغیر کسی مسلم یا کسی انسان کو قتل کرنا یا قتل پر اکسانا آخرت کی عدالت میں کتنے بڑے مقدمے کا باعث ہو گا؟ اگر یہ اسلام کی خدمت عظیم تھی تو خود آپ حضرات نے جا کر ثواب کیوں نہ کمایا، حصہ تو بہرحال آپ کو ملتا ہے۔!

آپ کے مولانا شفیع صاحب ہی بعداز سانحہ فرماتے ہیں کہ "یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی تھی، ڈاکٹر فاروق کا فیصلہ عدلیہ کو کرنا چاہیے تھا"

"رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی" کیا کوئی عالم کوئی شریک قتل فرد (یا افراد) کیا کوئی ہجوم میں شامل ہو کر پاگل پن کا شکار ہو جانے والا عامی اس پر تیار ہے کہ جلسہ عام میں بھی اور اپنی مسجد کے لاؤڈ اسپیکروں سے بھی اعلان کرے کہ اس سانحہ کی ذمہ داری کا ہر حصہ دار گنہگار اور مجرم ہے اور اسے توبہ کے ساتھ ساتھ کفارہ دینا چاہیے اس گھر کو جو سربراہ کے قتل سے اجڑ گیا، دیت جمع کر کے ادا کرنی چاہیے، کیا علماء نے اس پر سوچا؟ ایسے خطبے دیے؟ اعلان کئے؟ جلسے منعقد کیے؟!

ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ جو اینٹیں حافظ فاروق پر برسیں وہ اسلام کی سچی تصوریت اور شہرت کو لگیں، جو ضربات فاروق کو لگائی گئیں، ان سے خود اسلام کا چہرہ لہولہان ہوا ہے، آپ نے جو کارروائی توہین قرآن کا بدلہ لینے کے لئے کرائی، اس سے الٹا قرآن کے اصولوں اور قوانین اور حدیث اور فقہ کی توہین ہوئی۔ اس سارے سانحہ کا حساب نذیر رکشا والے اور شرکائے ہجوم سے لے کر خود آپ حضرات محترم کو دینا ہو گا، کاش کہ آپ عوام کو براہ راست مسجدوں میں بلواتے اور ان کو صحیح روش کے لئے تیار کرتے۔ جذباتی اور جنونی ہجوموں سے اسلام کو بچانے کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت منظم، صف بند انسان بنائے اور امیر اور اہل شوریٰ سے بالا فیصلے کرنے کا دروازہ بند کر دیا۔ ایمان و شعور کے زیر نگیں رکھا، یہی روش آج کے علماء کی ہونی چاہیے، اسی رنگ کے خطبے ہوں

اور اسی رنگ کے طلبہ دینی دارالعلوموں سے پڑھ کر نکلیں۔ دین چھترے اور بھیڑ بھڑیے بنانے نہیں آیا بلکہ شائستہ، سنجیدہ، مہذب، منظم، پابند قانون و اخلاق انسان تعمیر کرنے آیا ہے۔ اس حقیقت کو اگر نہ سمجھا گیا تو ہمارے دارالعوم لا یعقل جنونی آدمی پیدا کرتے رہیں گے اور دین کی سربلندی مشکل ہو جائے گی۔"

جبکہ معروف کالم نگار عطاالحق قاسمی "روزن دیوار سے" (نوائے وقت : 27 اپریل 1994ء) میں "اسلام کے خوبصورت چہرے پر مذہبی جنون کا تیزاب" کے زیر عنوان لکھتے ہیں :

"گوجرانوالہ میں ایک پاکستانی مسلمان حافظ سجاد کے ساتھ پاکستانی مسلمانوں نے جو سلوک کیا، وہ مذہبی اور غیر مذہبی حلقوں کے لئے گہرے سوچ بچار کا متقاضی ہے۔ اس واقعے نے مجھ پر جو جذباتی کیفیت طاری کی میں چاہتا تھا کہ اس سے باہر نکل آؤں تو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس پر اظہار خیال کروں، چنانچہ کالم میں تاخیر کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ آپ ایک دفعہ اپنے دماغ میں یہ واقعہ تازہ کریں کہ حافظ سجاد گھر میں تلاوت کلام پاک میں مصروف ہے، وہ کسی کام کے لئے اٹھنے لگتا ہے تو قرآن پاک چولہے پر گر جاتا ہے جس سے اس کے دو ایک اوراق شہید ہو جاتے ہیں، ہمسائے شور مچا دیتے ہیں کہ لوگو! اس ظالم نے قرآن پاک کو آگ لگا دی ہے، مسجدوں سے اعلان ہونے لگتے ہیں، پولیس حافظ قرآن کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ "مشتعل" ہجوم تھانے پر حملہ کر کے "ملزم" کو قابو کر لیتا ہے اور اسے سر عام سنگسار کرنا شروع کر دیتا ہے، جب حافظ قرآن، حرمت قرآن کے نام پر لہو لہان کر دیا جاتا ہے تو کچھ "غیرت مند" نوجوان آگے بڑھتے ہیں، اس کے جسم پر مٹی کا تیل چھڑکتے ہیں اور اسے آگ لگا دیتے ہیں، جب وہ زندہ آگ میں جل جاتا ہے تو کچھ اسلام کے جاں نثار" اس کی لاش کو موٹر سائیکل کے ساتھ باندھتے ہیں اور اسے شہر کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ اخبارات میں دو دن اس واقعے کی باز گشت سنائی دیتی ہے اور پھر بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ کتنا معمولی واقعہ ہے جس پر نہ زمین کا کلیجہ شق ہوا اور نہ آسمان سروں پر آن گرا؟ لیکن زمین بھی شق ہو گی اور آسمان بھی سروں پر آن گرے گا اگر ہم نے اس سانحے کے تمام پہلوؤں کا پوری سنجیدگی سے جائزہ نہ لیا اور ان محرکات کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جن کے نتیجے میں لوگوں نے قانون اپنے ہاتھوں میں لیا ہے اور قانون نے ان پلید ہاتھوں پر بیعت کر لی ہے!

اس سانحے میں مذہبی لوگوں کے سوچنے کی جو چیز ہے، وہ مذہبی جنون ہے جس میں

لوگوں کو بہت بری طرح مبتلا کر دیا گیا ہے اور مجھے انتہائی دکھ سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ اس میں اخبارات کا بھی حصہ ہے۔ بابری مسجد کے سانحے کے بعد جب پاکستان میں مندروں پر حملے شروع ہوئے تو ہمارے ایک اخبار کی شہ سرخی تھی "لاہور مندروں سے پاک ہو گیا" جن سے ان "مجاہدوں" کے حوصلے بلند ہوئے جنہوں نے یہ ننگ اسلام حرکت کی تھی' یہ اور اس طرح کی دوسری سرخیاں اسی طرح کی ہوتی ہیں جو کسی قاتل کے سنگدلانہ فعل کی شدت کو کم کرنے کے لئے عموماً اخبارات میں نظر آتی ہیں مثلاً "غیرت مند بھائی نے ٹوکے کے وار کر کے اپنی بہن کو ہلاک کر دیا"۔ ایک معاشرے کو جب جنون میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تو پھر اس کے سامنے کوئی انتہا نہیں رہتی' وہ مندروں کے علاوہ مسجدوں کو بھی "اسلام" کے نام پر بم کے دھماکوں سے اڑانے لگتا ہے اور سجدے میں گرے ہوئے نمازیوں کو کلاشن کوف کے ایک برسٹ سے بھون کر رکھ دیتا ہے۔ حافظ سجاد کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک مفروضے کے ساتھ ہوا' نہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہوا' نہ گواہ عدالت کے سامنے پیش ہوئے' نہ "ملزم" کو صفائی کا موقع دیا گیا اور ان سب مراحل سے گزرے بغیر وحشت و بہیمیت کا وہ مظاہرہ کیا گیا کہ انسانیت ہمیشہ کے لئے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ایک لمحے کے لئے فرض کریں کہ "ملزم" واقعی بے دین تھا' اس نے جان بوجھ کر قرآن پاک کو آگ لگائی۔ میں مفتی نہیں ہوں' کسی مفتی سے پوچھا جائے کہ کیا اتنے بڑے گناہ کی خدا اور اس کے رسولؐ نے یہی سزا مقرر کی ہے جو "ملزم" کو دی گئی؟ نیز یہ کہ اس سزا کے لئے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں اور نیز یہ کہ یہ سزا ریاست کی بجائے جو چاہے دے سکتا ہے؟ ظاہر ہے ان میں سے کوئی بات بھی اس طرح نہیں ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہمارے مفتیوں نے اس پر اتنا شور بھی کیوں نہیں مچایا جتنا شور وہ کسی رسالے میں کسی عورت کی تصویر کی اشاعت پر مچاتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے عوام کے علاوہ ہمارے مفتی بھی ان معاملات میں خدا اور اس کے رسولؐ کے مقرر کئے ہوئے انصاف کے ضابطوں اور ایسے معاملات میں تجویز کی گئی سزاؤں سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ وہ اس سے آگے جانا چاہتے ہیں اور یہ بات چونکہ وہ اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتے لہٰذا اگر رائے عامہ ان کا ساتھ دے تو ایسے خلاف اسلام اقدامات کی حمایت میں کھل کر سامنے آ جاتے ہیں' بصورت دیگر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

کچھ برس قبل ایک مسیحی کو "غلط فہمی" کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ قاتل کا ٹارگٹ کوئی گستاخ رسولؐ تھا مگر وہ غلطی سے اسے سمجھ بیٹھا' اسی طرح گزشتہ دنوں ایک مسیحی کو

عدالت کے باہر قتل کر دیا گیا جس پر توہین رسالتؐ کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس طرح بے شمار واقعات نئے اور پرانے غیر مسلموں کے ساتھ ہو رہے ہیں، کیا اسلام میں قاضی کا کوئی مصرف نہیں، جو شخص چاہے اور جب چاہے وہ قاضی بلکہ قاضی القضاہ کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور اپنے طور پر یہ اختیار حاصل کرنے کے بعد اسے قتل و غارت گری کا لائسنس بھی حاصل ہو جاتا ہے، ان معاملات میں چشم پوشی بلکہ داد تحسین کے ڈونگرے برسانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ "کفار" کے بعد اب مسلمانوں کی باری بھی آ گئی ہے۔ مسلمانوں کا ایک مشہور فرقہ ایک دوسرے مشہور فرقے کو "گستاخ رسولؐ" قرار دیتا ہے اور دوسرا فرقہ اسے "مشرک" سمجھتا ہے چنانچہ ایک دوسرے کی مسجدوں پر بموں سے حملے کئے جاتے ہیں اور " گستاخ رسولؐ" اور "مشرک نمازیوں" کو باری باری سجدے کی حالت میں تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ اب ہر شخص کا اپنا اسلام ہے، اپنے قوانین ہیں اور اپنے فیصلے ہیں جن پر عملدر آمد میں نہ مفتی آڑے آتے ہیں نہ ملکی قانون ان کا رستہ روکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں ہم نعوذ باللہ ان سے زیادہ مذہبی ہو گئے ہیں جن کی وساطت سے ہم تک مذہب پہنچا۔ خدا اور اس کے رسولؐ کا فرمان ہے کہ کسی کے گھر میں دستک اور اس کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی کوشش نہ کرو۔ خلیفہ وقت حضرت عمر فاروقؓ جب دیوار پھلانگ کر ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں اور گھر میں موجود خاتون سے پوچھتے ہیں کہ تم اتنی اونچی آواز میں گانا کیوں گا رہی تھیں تو وہ پوچھتی ہے تم کون ہو؟ خلیفہ وقت جواب دیتے ہیں "میں عمرؓ ہوں، امیرالمومنین ہوں" وہ عورت کہتی ہے "اگر تم امیرالمومنین ہو تو کیا تمہیں رسولؐ خدا کا یہ فرمان یاد نہیں کہ کسی چار دیواری میں بغیر اجازت کے داخل ہونا خلاف اسلام ہے؟" اس پر امیرالمومنین کے ماتھے پر عرق ندامت نمودار ہوتا ہے، آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہیں "مجھ سے غلطی ہوئی، خاتون مجھے معاف کر دو!"

آج ہم ذرا سا شک پڑنے پر گھروں پر ہلہ بول دیتے ہیں، اگلے روز بغیر عدالتی تحقیق کے اخباروں میں ان کی تصویریں شائع ہوتی ہیں اور یوں خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ نیوائز پر ہم "اسلام" کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور گنہ گاروں کے لئے وہ سزائیں تجویز کرتے ہیں جو اتفاق سے اللہ تعالیٰ کے ذہن میں نہیں آئی تھیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے کہ ہم گنہ گاروں کے لئے خدا اور اس کے رسولؐ کی تجویز کی ہوئی سزاؤں اور اس کے طریق کار سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہم نے اسلام

کے خوبصورت چہرے پر مذہبی جنونیت کا تیزاب پھینک کر اسے مسخ کر دیا ہے۔ جن لوگوں نے تنگ دلی کی یہ آگ بھڑکائی ہے' ان سے یہ آگ بجھانے کی توقع نہ کریں بلکہ اسلام کے سچے عاشق آگے بڑھیں اور اسلام سے بیزار ہوتی نئی نسل کو بتائیں کہ اصل اسلام وہی ہے جو خدا نے رسولؐ پر اتارا اور حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جس کی عملی شکل سامنے آئی۔ موجودہ اسلام چند سنگدلوں کی تخلیق ہے اور اب خود ان پر برا وقت آگیا ہے۔"

حواشی:

1۔ عبدالحکیم' ڈاکٹر خلیفہ۔ "اقبال اور ملا" ص: 13

2۔ ہفت روزہ "لیل و نہار" کراچی: 19 اپریل 1970ء

3۔ "روشن خیال" (کراچی: جلد ا شمارہ 2)

4۔ ہفت روزہ "لیل و نہار" (کراچی: 19 اپریل 1970ء)

5۔ جہاں تک ٹیلی ویژن اور وی سی آر کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو ان کے حرام نہ ہونے کا فتویٰ مولانا مدنی میاں نے دیا تھا۔ مولانا مدنی میاں ہندوستان کی مشہور خانقاہ کچھوچھا شریف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے فضل و کرم کا شہرہ یورپ میں بھی ہے ان سے ریڈیو' کیمرہ' ٹیلویژن اور ویڈیو کیسٹ کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کے جواب میں انھوں نے "وہ جائز مناظر جن کو دیکھنے اور سننے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہ ہو" کی شرط عاید کرتے ہوئے ان کے استعمال کی اجازت دے دی ("ٹی وی اور وی سی آر کی شرعی حیثیت" از مولانا مدنی میاں مطبوعہ روز نامہ نوائے وقت لاہور: 4 جولائی 1986ء)

6۔ ماہنامہ "ضیائے حرم" لاہور' فروری 1994ء

8- "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا..."

"رخت سفر:"

کسی بھی معلم، ناصح، واعظ، قائد، سردار، راہنما، ہادی، مرشد، معلم یا گرو کے پاس منجملہ دیگر امور کے اقبال کے الفاظ میں نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز بھی ہونی چاہیے ورنہ بات نہ بنے گی کہ ان سے ایک تو اس کی شخصیت میں تخلیقی جوہر کی نمو ہو گی اور دوسرے وہ کیفیت پیدا ہو گی جسے صوفیاء گدازی قلب قرار دیتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر بقیہ دو خصوصیات کے مقابلہ میں "نگاہ بلند" کو اساسی اہمیت کی حامل سمجھتا ہوں کہ اس میں Vision اور Visionary کے مفاہیم بھی شامل کر لیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

اب ذرا اس معیار پر اپنے "حضرات" کو پرکھیے تو ان میں سے ایسے کتنے ہیں جو اقبال کے معیار پر پورا اترنے کے اہل قرار پائیں گے؟ معدودے چند، ورنہ اکثریت کا تو یہ حال ہے:

ڈرانے والے یہ طرز خطاب کیسا ہے
عذاب آنے سے پہلے عذاب کیسا ہے

ویسے تو ہمارے "حضرات" کا ہدف تمام معاشرہ ہی ہوتا ہے جس پر انداز و اسلوب بدل کر مستقلاً تنقید جاری رہتی ہے لیکن مذہبی شخصیات کے دراصل تین ہدف مستقل نوعیت کے ہیں۔

(الف) فرقہ مخالف (ب) جنس (ج) عورت

"میر کارواں:"

ان میں سے اول الذکر کے بارے میں تو خود کو کچھ کہنے کا اہل نہیں پاتا کہ میں اتنے گہرے پانیوں میں اترنے کو تیار نہیں۔ تاہم قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی "کار جہاں دراز ہے" (جلد دوم ص: 72-271) سے یہ اقتباس بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں جس میں انہوں نے یہ

بتایا ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد "ایک جوشیلے مذہب پرست اور اینٹی برٹش آئیڈلسٹ نوجوان تھے" انھوں نے تحریک پاکستان کے لیے بہت کام کیا مگر پاکستان کے بجائے عراق جا کر آباد ہو گئے۔ قرۃالعین حیدر نے اپنے ابا جان کے پرانے دوست عبدالرحمٰن صدیقی سے یہ دریافت کیا:

"راجہ صاحب پاکستان میں کیوں نہ رہے؟"

"سنو، تقسیم سے چند روز قبل نئی دہلی 10- اورنگ زیب روڈ کا واقعہ ہے، ڈنر کی میز پر راجہ صاحب نے قائداعظم سے دریافت کیا پاکستان کا نظام حکومت کیا ہو گا؟"

"قائداعظم مرحوم نے پوچھا "آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے" راجہ صاحب نے جواب دیا

"اسلام اور ملت کا سب سے زیادہ دیندار، متقی، عالم با عمل صالح ترین شخص ہمیشہ ملک کا سربراہ بنایا جائے"

"یہ تو شعبہ امامت کا تصور ہے" میں نے اپنی پلیٹ تپائی پر رکھتے ہوئے عبدالرحمٰن صدیقی سے کہا۔

"قطعی" صدیقی نے فرمایا۔

" اور اقبال کا مرد مومن"

" ہاں قائداعظم نے ارشاد کیا تم بیسویں صدی میں قرون وسطیٰ کے حالات کا تصور کر رہے ہو پاکستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہو گی"

راجہ صاحب بولے "سر میں نے اتنے برس مسلم لیگ کی جدوجہد محض ایک اسلامی مملکت اور اسلامی آئین کے نصب العین کو سامنے رکھ کر کی تھی"

" کون سے اسلام کا ؟ اسلام میں بہتر فرقے ہیں "قائداعظم نے دریافت کیا۔

راجہ صاحب خاموش ہو گئے۔"

"73:"

جہاں تک اسلام میں بہتر فرقوں والی حدیث کا تعلق ہے تو میں نہیں سمجھ سکا کہ بہتر کی تعداد کیسے زبان زد عوام ہو گئی جبکہ اصل حدیث میں فرقوں کی تعداد 73 ہے۔ "مشکوۃ" میں سے حدیث شریف درج کی جاتی ہے:

" حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ البتہ تحقیق میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا اور بالکل درست اسی طرح ہو گا جیسا کہ دو جوتیاں برابر اور ٹھیک ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی نے اپنی ماں سے علانیہ بدفعلی کی ہو گی تو میری امت میں بھی ایسا ہو گا جو یہ کام کرے گی اور بنی اسرائیل کی قوم بہتر فرقوں میں منقسم ہو گئی تھی میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہو گی جن میں سے ایک فرقہ جنتی ہو گا اور باقی سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنتی فرقہ کونسا ہو گا' آپ نے فرمایا وہ فرقہ ہو گا جو اس چیز پر چلے گا جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں۔"

مسلمانوں میں فرقہ بازی اور فرقہ پرستی کی غالباً یہی وجہ ہے کہ آنحضرت کی حدیث مبارک کے اصل پیغام کی روح کو فراموش کر کے لفظی طور پر اسے درست ثابت کر دیا جائے یہ فراموش کر کے کہ صرف ایک فرقہ کو چھوڑ کر بقیہ سب جہنمی ہوں گے۔ علامہ اقبال نے "سر سید کی لوح تربت پر" میں اس فرقہ بازی کی تفرقہ بازی کے بارے میں یہ کہا تھا:

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

اس تناظر میں ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ ارشاد خصوصی توجہ چاہتا ہے:

"... میں نے سیکولر ازم کا لفظ بھی باقاعدہ استعمال کیا تھا لیکن ایک اور انداز میں' جب علماء کنونشن میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ فکری انقلابات کا حل کیا ہو؟ میں نے کہا آپ حکومت کو سیکولر بنا دیجئے اس معنوں میں کہ پرسنل لاء کے معاملے میں حکومت بالکل چھوٹ دے دے وہ مداخلت نہ کرے۔ حکومت کا کوئی پرسنل لاء نہ ہو۔"

ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے ارشاد احمد حقانی کو دیئے گئے انٹرویو میں کیا (مطبوعہ جنگ لاہور 12 مارچ 1983ء) اسی انٹرویو میں انہوں نے ایک اور مقام پر بھی اس بات کا اعادہ کیا:

"باقی رہے پبلک لاء اس کو سیکولر کر دیجئے اس معنی میں اس میں کسی مذہبی فرقے کو تسلیم نہ کیجئے"

خود اقبال سے پہلے حالی نے یوں کہا تھا:

فساد مذہب نے ہیں جو ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے کہ صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

الحمداللہ کہ صدیوں سے یہ جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ انشاء اللہ! چنانچہ اب فرقہ پرستی اور اس سے جنم لینے والی فرقہ دشمنی اس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ مسجد خانہ خدا کے برعکس مخصوص فرقہ کی ملکیت میں تبدیل ہو چکی ہے جس کے باعث "غلط" فرقہ والا وہاں نماز ادا نہیں کر سکتا۔

"سیکولرازم:"

ہمارے شعلہ نوا مقرروں، کالم نگاروں، خطیبوں، مذہبی جیالوں، وزراء، سیاستدانوں اور مخصوص نظریات کے حامل دانش وروں کے ہاتھوں جن(۱)الفاظ کی خصوصی درگت بنی ان میں سیکولر/ سیکولرازم بھی شامل ہیں کہ کفر و الحاد کے مترادف ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ہاں دستور ہے بلا تحقیق و تفحص انہیں یوں استعمال کیا گیا کہ یہ اب اچھے خاصے ہوا کی صورت اختیار کر چکے ہیں حالانکہ اگر یہ کفر و الحاد کے مترادف ہوتے تو ڈاکٹر اسرار احمد کے پایہ کا دینی محقق تو استعمال نہ کرتا۔

سیکولر/ سیکولرازم دراصل مذہبی کے برعکس علمی اصطلاح ہے اور عمرانی مفاہیم کی حامل رہی ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے بموجب یہ متنوع معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے— طویل وقت، لمبی مدت کے بعد ہونے والا کوئی وقوعہ (مثال: سیکولر گیمز) اساطیری پرندہ ققنس (فینکس: سیکولربرڈ) ابتدائے آفرینش میں کھولتے کرۂ ارض کے سرد اور ٹھوس ہونے کا جغرافیائی عمل (سیکولر کولنگ) جزوقتی پادری (سیکرلر پادری) یہ اس لفظ سے وابستہ چند قدیم مفاہیم ہیں اور ان سب میں بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر وقت کا تصور کار فرما ہے— لیکن بعد میں ان مفاہیم کے ساتھ مذہبی اور روحانی اثرات سے آزاد فنون لطیفہ اور تخلیقات کے لئے بھی اس کا استعمال شروع ہو گیا (مثال: سیکولر پینٹنگ، سیکولر لٹریچر) علاوہ ازیں یہ ان علمی نظریات اور تصورات کے لئے بھی بروئے کار لایا جانے لگا جن کے بموجب جملہ امور زیست کا مذہب کے تابع ہونا لازم نہیں۔

مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی مطبوعہ "قومی انگریزی اردو لغت" میں سیکولر کے معانی کے ضمن میں یہ معلومات ملتی ہیں "اس جہان میں مادی اشیاء سے متعلق دنیوی، لا دینی، مذہبی یا مقدس حوالہ سے خالی (جیسے سیکولر میوزک) سکہ بند پادریوں کے برعکس ایسے پادریوں کا جنہوں نے ترک دنیا کا عہد نہ کیا ہو اور ان اصولوں کو نہ اپنایا ہو، لمبے وقفوں

کے بعد وقوع پذیر ہونے یا مشاہدے میں آنے والا جیسے ایک صدی میں ایک مرتبہ' بہت طویل عرصہ پر محیط' (اسم) دنیا دار' وہ پادری جس پر کلیسائی قوانین کی پابندی واجب نہ ہو۔"

سیکولرازم کے بارے میں یوں لکھا ہے "لادینیت' لا دینی جذبہ یا رجحانات' بالخصوص وہ نظام جس میں جملہ مذہبی عقائد و اعمال کی نفی ہوتی ہے یہ نظریہ کہ عام تعلیم اور مدنی ماند بود کے معاملات میں مذہبی عنصر کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔" جبکہ اسی لغت میں سیکولرسٹ / سیکولرسٹک کا مفہوم ہے "اخلاقیات کا قائل' لادین / اخلاقی' لا دینی"

اردو لغت بورڈ کراچی کی مدون کردہ (اردو لغت تاریخی اصولوں پر) "میں سیکولر بمعنی" عقیدے کی مداخلت سے پاک' دین یا مذہب سے غیر متعلق' لادینی۔ غیر مذہبی" اور سیکولرازم بمعنی "لادینیت' مذہبی عقیدے سے بریت' ایسا نظریہ حیات جو عقاید کی مداخلت سے پاک ہو"

— ان تین مستند لغات سے جہاں اس لفظ کے متنوع استعمالات واضح ہوتے ہیں وہاں یہ بھی کہ بے دینی اور لا دینی — کفر و الحاد نہیں — بلکہ اتنی سی بات ہے کہ دنیا دنیا والوں کے لئے ہے اور دین دین والوں کے لئے!

گذشتہ ابواب میں یورپ میں مذہب' عقیدہ' خدا' مسیح' بائبل اور تثلیث کے نام پر چرچ کے مظالم۔ علمی ترقی اور سائنسی تحقیقات میں کلیسا کی رکاوٹ اور پوپ کی متوازی مذہبی حکومت کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ دراصل مذہبی جبر کی یہ فضا ہی مذہب کو حکومت سے جدا کرنے کا سبب بنی تھی اور دیکھا جائے تو اس کے بعد سے ہی علمی' عقلی' فلسفیانہ اور سائنسی امور میں ترقی کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔ بس یہی محرک ہے سیکولرازم کا اور یہی اس کا علمی' سیاسی اور مذہبی مفہوم ہے۔

اگر علوم کو مذہبی اور سیکولر میں تقسیم کرنا ہو تو معقولات کے بر عکس منقولات سیکولر قرار پاتے ہیں یعنی فلسفہ' منطق اور سائنس اور ان ہی سے مسلم معاشرہ ہمیشہ الرجک رہا ہے۔

جہاں تک برصغیر کی سیاست میں مذہبی رجحانات کا تعلق ہے تو عجب پر تضاد صورت نظر آتی ہے۔ مسلم لیگ مذہبی جماعت نہ تھی مگر اسلام کے نام پر پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہی تھی جبکہ بیشتر مذہبی جماعتیں سیکولر کانگریس کے ساتھ تھیں اور ان کے راہنما قوم پرست (نیشنلسٹ) کہلاتے تھے' غیر مذہبی مسلم لیگ اسلام کا پرچم بلند کر کے کامیاب ہو گئی جبکہ مذہبی قائدین مات کھا گئے' پاکستان کی سیاست میں ایک اور متضاد صورت حال ذوالفقار

علی بھٹو کی صورت میں نظر آئی کہ مروج مفہوم میں مذہبی نہ ہونے کے باوجود مرزائیوں کو اقلیت قرار دے دیا' شراب اور ریس پر پابندی عائد کی اور جمعہ کی تعطیل کر دی جبکہ ضیاالحق کے عہد میں ریس پر سے پابندی اٹھا لی گئی- ایسے میں انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سارے قصہ میں مذہب کا کردار کیا تھا؟ مذہبی کون تھا؟ سیکولر کون تھا؟

قائداعظم نے اگر پاکستان میں ملا راج نافذ کرنا ہوتا تو کابینہ میں ایک ہندو اور ایک مرزائی کو وزیر نہ لیتے!

اور یہ بھی ہماری کرداری دو عملی کے کمالات میں سے ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر غیرمذہبی زندگی گزارنے کے باوجود ہم مذہب کے نام پر جذباتی ہو جاتے ہیں- اگر مسلمان صحیح معنوں میں اسلام کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو' قرآن مجید کے ارفع کرداری سانچہ میں خود کو ڈھالنے کے لئے سعی کناں ہو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ اور احادیث شریف کے مطابق عمل کی ترجیحات کا تعین کر رہا ہو تو پھر اس کے پاس دوسرے کو ہدف بنانے' کسی کے کردار پر نکتہ چینی کرنے' فرقہ مخالف میں کیڑے ڈالنے اور برعکس نظریہ رکھنے والے میں سے کیڑے نکالنے کے لئے فالتو وقت ہی نہ ہو گا- اصل مذہبی مفہوم میں رزق حلال پیدا کرنا' روح اسلام کے مطابق حقوق العباد کا احترام اور خالص دینی جذبہ سے نماز پنج گانہ کی ادائیگی اتنے بڑے فریضے ہیں کہ کسی اور کی جانب دھیان ہی نہیں جا سکتا-

اسلام میں کامیاب انسان کا معیار جاہ و منصب اور شہرت و ثروت کے برعکس صرف تقویٰ ہے اور حضرت عمرؓ کے بموجب کانٹوں بھری راہ پر چلتے وقت دامن کو کانٹوں سے بچانے کا نام تقویٰ ہے- پاکستان میں حاکم سے لے کر محکوم تک کتنے اس اعلیٰ ترین کرداری معیار پر پورے اترتے ہیں- کندن بننے کے لئے سونے کو کٹھالی میں پگھلنا پڑتا ہے-

مذہب اور سیاست' تہذیب اور تمدن' نظریات اور تصورات' تخلیق اور تنقید کی تاریخ سے یہ نکتہ اجاگر ہوتا ہے کہ ایک خاص حد سے تجاوز کے بعد عمل اپنے ردعمل کو جنم دیتا ہے- پنڈولیم ساکت نہیں رہ سکتا اس نے لوٹ کر آنا ہوتا ہے' اوپر پھینکی جانے والی شے نے ہر حالت میں نیچے بھی گرنا ہے یہ تاریخ' حرکت اور فطرت کے قوانین ہیں لہذا ان سے مفر نہیں- انتہا پسند کو برعکس کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے:

چہ اکار کند عاقل کہ باز آید پشیمانی!

"گلستان من!"

مجھے یاد ہے 1988ء کے الیکشن کے بعد نواز شریف نے بے نظیر کے خلاف دینی علماء کا اجلاس (لاہور میں) بلایا تھا' سب دینی علماء اس پر تو متفق تھے کہ ازروئے شرع بے نظیر وزیراعظم نہیں بن سکتی لیکن نماز ساتوں دینی راہنماؤں نے الگ الگ پڑھی تھی۔ شاید اس لیے اب مسلمان کے لیے کلمہ گو ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کی کسی مخصوص فرقہ سے وابستگی بھی ضروری ہے۔ چند برس پہلے تک فرقہ پرستی کا اظہار محض جوش خطابت سے ہوتا تھا مگر اب اسلحہ کی فراوانی مسلح تصادموں میں تبدیل ہو چکی ہے اور بے قصور نمازیوں کے قتل کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ 31 اگست 1993ء کو فجر کی نماز کے وقت مسجد احسان (چوبرجی۔ لاہور) میں نمازیوں پر فائرنگ کے نتیجہ میں آٹھ نمازی شہید ہوئے۔ 21 جنوری 1994ء کو مظفر گڑھ سے 65 کلو میٹر دور قومی شاہراہ پر واقع قصبہ شہر سلطان میں نماز جمعہ کے دوران ہینڈ گرینڈ پھینک کر 5 نمازیوں کو شہید اور 24 کو زخمی کر دیا گیا جبکہ 5 فروری 1994ء کبیر والا کے نواحی قصبہ گکڑ ہینڈ کی ایک مسجد میں فجر کی نماز کے وقت مسجد میں ہینڈ گرینڈ اور کلاشنکوف کی فائرنگ سے ایک نمازی شہید اور 10 زخمی ہو گئے۔ 12 مارچ 1994ء کے اخبارات کے بموجب فیصل آباد اور مردان کی مساجد میں فائرنگ کے نتیجہ میں پانچ نمازی شہید اور 10 زخمی ہوئے۔ 23 اپریل 1994ء کی خبر کے مطابق شیخوپورہ روڈ پر جیا موسیٰ (شاہدرہ) کی جامع مسجد محمدی میں عصر کی نماز کے بعد لوگ اٹھنے ہی والے تھے کہ ہینڈ گرینڈ پھینکنے سے 26 نمازی زخمی ہو گئے۔

یکم مارچ 1994ء کی خبر کے مطابق "کراچی میں ڈنڈا بردار مولویوں کا نمازیوں پر حملہ' پیش امام ہلاک' 6 نمازی زخمی' حملہ آور دس منٹ تک ڈنڈے برسانے کے بعد فرار ہو گئے۔"

— یہ صرف سال رواں کے ابتدائی چار ماہ کے واقعات ہیں' اس کے بعد بھی ایسے حادثات ہوتے رہے ہیں۔ ان خبروں پر افسردہ ہونے والے اصحاب کو مژدہ ہو کہ ایسا صرف پاکستان ہی میں نہیں ہو رہا بلکہ دیگر اسلامی ممالک بھی اس سے محفوظ نہیں 14 مارچ 1994ء کے جنگ سے الجزائر کی خبر پیش ہے:

— "لندن (ریڈیو رپورٹ) الجزائر کے وزیر مذہبی امور عبدالحافظ لامکرانے انکشاف کیا ہے کہ ملک میں جاری تشدد کے دوران مساجد کے 27 اماموں کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ مساجد سے قالین اور چٹائیاں اٹھوالی گئی ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ امام کب اور

کتنے عرصے میں مارے گئے تاہم خیال یہ ہے کہ حکومت نے جب سے مساجد کو اپنے کنٹرول میں لیا ہے اس وقت سے اب تک ان امام صاحبان کو مارا گیا ہے۔ وزیر موصوف کے مطابق حکومت کے حامی اخبار کو بتایا کہ ہلاک کئے جانے والے تمام امام حکومت کے مقرر کردہ تھے انہوں نے ان وارداتوں کا ذمہ دار اسلامی تنظیموں کو ٹھہرایا۔"

اس صورت حال پر 7 فروری 1994ء کو جنگ—(لاہور) نے جو اداریہ قلم بند کیا اس کی اختتامی سطریں پیش ہیں:

"مساجد اور نمازیوں پر بڑھتے ہوئے حملوں کے واقعات افسوسناک ہی نہیں قابل تشویش ہیں اور ملک میں بڑھتی ہوئی مذہبی عدم روا داری اور اختلافات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے واقعات میں قوم کے لیے خیر کا کوئی پہلو نہیں اس سے قومی یک جہتی اور اتحاد کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔ جہاں حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے سنگین واقعات کے مجرموں کا سراغ لگا کر انہیں سخت سزا دے وہاں مذہبی حلقوں اور جماعتوں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ رواداری کا مظاہرہ کریں اور انتہا پسندی کی روش ترک کر دیں۔"

اگرچہ یہ اچھی بات نہیں لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں مذہبی تعصب ملتا ہے لیکن غیرمذاہب والے اس تعصب کا نشانہ بنتے ہیں مگر ہم مسلمانوں کا عجب عالم ہے کہ غیر مذاہب کے لیے تو مذہبی روا داری کا اظہار ممکن ہے مگر اپنوں کے لیے نہیں، یہ فراموش کر کے کہ اسلام سلامتی کا دین ہے ہر کلمہ گو مسلمان ہے اور دین کے رشتہ سے سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔مسالک و مسائل پر اختلافات کیا صورت اختیار کر لیتے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل خبر(جنگ لاہور 13 اپریل 1994ء) سے لگایا جا سکتا ہے:

"سانگلہ ہل (نامہ نگار) ریذیڈنٹ مجسٹریٹ سعید احمد نے اہل حدیث اور اہل سنت مسالک کے اٹھارہ اٹھارہ علمائے کرام کے مابین جامع مسجد اہل حدیث باغ والی میں مناظرہ کرا دیا لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ مناظرے کی صدارت مریدکے سے آئے ہوئے اہل حدیث عالم مولانا عبدالرحمان نے کی اور اہل سنت کی طرف سے فیصل آباد سے آئے ہوئے پروفیسر محمد سعید احمد اسد اور اہل حدیث کی طرف سے لاہور سے آئے ہوئے مولانا رحمت اللہ ربانی نے دلائل پیش کئے۔ مناظرے کے دوران مسجد کے باہر کھڑے مشتعل افراد اپنے اپنے علماء کے حق میں نعرے بازی کرتے رہے۔ اڑھائی گھنٹے کی طویل بحث کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہو سکا- بعدازاں مجسٹریٹ اور پولیس انتظامیہ کی موجودگی میں مسلک اہل سنت کے

مشتعل افراد جلوس کی شکل میں نعرہ بازی اور کلاشن کوفوں سے ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے مرکزی رضوی جامع مسجد کی طرف چل دیئے اور اہل حدیث مسلک کے مشتعل نوجوان باغ میں مسجد کی چھت پر کھڑے ہوئے فائرنگ کرتے رہے اس واقعہ سے شہر میں کشیدگی بڑھ گئی ہے۔ شہر کی مختلف سیاسی اور سماجی تنظیموں نے مطالبہ کیا ہے کہ فرقہ واریت کو ہوا دینے والے شرپسند عناصر کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے۔"

اس کے ساتھ یہ خبر بھی ملا لیں:

"لاہور (خصوصی رپورٹ) صوبائی دارالحکومت میں مذہبی منافرت کے 16 واقعات میں اب تک 30 افراد ہلاک 122 زخمی ہوئے جن میں سے متعدد معذور بھی ہو گئے۔ رسول پارک اچھرہ کی مسجد میں دھماکے سے قبل محمدیہ مسجد جیاموسیٰ شاہدرہ میں بھی اسی طرح دو گرنیڈ نماز عصر کے وقت پھینکے گئے جس سے 26 نمازی زخمی ہوئے۔ مذہبی منافرت کے واقعات میں دھماکوں اور فائرنگ کے ذریعے ہلاک کرنے کے 16 واقعات ہوئے' صرف صادق گنجی اور سکندر شاہ کے قتل میں ملوث افراد کا سراغ مل سکا اس کے علاوہ اب تک کسی واقعہ کا ملزم نہیں پکڑا جا سکا۔" (روز نامہ جنگ 13 جولائی 1994ء)

فروعی اختلافات نے نفرت کے جو بیج بوئے تھے آج ان کی خونیں فصل تیار ہو چکی ہے کہیں صورت حال وہی تو نہیں ہو چکی جس کے بارے میں کوفہ میں حجاج بن یوسف نے کہا تھا کہ سروں کی فصل پک چکی ہے اور وہ کٹنے کو تیار ہے۔ وہ ملک جو اسلام کے نام پر بنا تھا اب اس میں اسلام کے نام لیوا کو کسی غیر مذہب کے بجائے خود اسلام کے نام لیوا ہی سے خطرہ ہے۔ مذہبی نفرت کے شعلوں کو ہوا دینے والے یہ بھول چکے ہیں کہ آگ ایک حد سے آگے بڑھ جائے تو اس کے شعلوں کی لپیٹ میں اپنے بیگانے سبھی آ سکتے ہیں۔ جنگل جلتا ہے تو درختوں کی شاخوں پر بسیرا لینے والے پرندے بھی شکار ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان بے چاروں کا آگ لگانے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

— اور آخر میں "دہشت گردی یا مذہبی فرقہ پرستی" کے عنوان سے جنگ (13 مارچ 1994ء) کے اداریہ سے متعلقہ اقتباسات:

"فرقہ واریت کا زہر قوم کے رگ و ریشے میں اس تیزی سے اتر رہا ہے کہ اب مساجد اور اور عبادت گاہیں بھی قاتلانہ حملوں سے محفوظ نہیں رہیں اور آئے دن کسی نہ کسی جگہ مذہبی رہنماء کے قتل اور مصروف عبادت افراد پر فائرنگ کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ مساجد پر نماز کے دوران حملوں میں کئی نمازی شہید اور

زخمی ہو چکے ہیں۔ اس وقت جبکہ ملک سنگین خطرات میں گھرا ہوا ہے اور اندرون ملک مکمل یکجہتی اور اتحاد کی ضرورت ہے، ہماری صفوں میں پایا جانے والا مذہبی انتشار اور تشدد کا رجحان قومی یکجہتی کو بری طرح متاثر کرے گا۔ اس تعصب اور انتشار کی جڑیں ضیاء الحق کے دور حکومت میں تھیں جس نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے نسلی، لسانی، گروہی اور مذہبی فرقہ پرستی کو ہوا دی اور ان کی سرپرستی کی۔ یہ ذمہ داری سیاسی رہنماؤں، علمائے کرام، دانشوروں اور ہر محب وطن شہری کی ہے کہ وہ عصبیت کا زہر ختم کرنے کے لئے اپنے اپنے دائرہ اثر میں کام کرے اور حکومت ایسے عناصر کو سختی سے کچلنے کا اہتمام کرے جو قومی اتحاد کو نقصان پہنچانے کے لئے مذہبی منافرت اور تفرقہ پسندی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اگر اس پر قابو نہ پایا گیا تو ہماری اندرونی یکجہتی کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے جو کسی بھی بیرونی دشمن کی جارحیت کی کامیابی کا راستہ ہموار کر دے گا۔"

"مسلمان کون ——؟"

جس آسانی سے کسی کو کافر قرار دے دیا جاتا ہے اس آسانی سے مسلمان نہیں قرار دیا جاتا۔ یہ ہے ہماری متضاد صورت حال۔ 1953ء کے فرقے وارانہ فسادات کے ضمن میں جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی کی سربراہی میں قائم کردہ تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ سے متعلقہ اقتباس بحوالہ روشن خیال (کراچی جنوری 1993ء) پیش ہے:

"یہ مسئلہ بنیادی طور پر اہم ہے کہ فلاں شخص مسلم ہے یا غیر مسلم اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اکثر ممتاز علماء سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ مسلم کی تعریف کریں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اگر مختلف فرقوں کے علماء احمدیوں کو کافر کہتے ہیں تو ان کے ذہن میں نہ صرف اس فیصلے کی وجوہ بالکل روشن ہوں گی بلکہ وہ "مسلم" کی تعریف بھی قطعی طور پر کر سکیں گے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ فلاں شخص یا جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ دعوی کرنے والے کے ذہن میں اس امر کا واضح تصور موجود ہو کہ "مسلم" کس کو کہتے ہیں۔ تحقیقات کے اس حصے کا نتیجہ بالکل اطمینان بخش نہیں نکلا اور اگر ایسے سادہ معاملے کے متعلق بھی ہمارے علماء کے دماغوں میں اس قدر ژولیدگی موجود ہے تو آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ پیچیدہ معاملات کے متعلق

ان کا کیا حال ہو گا۔ ذیل میں ہم "مسلم" کی تعریف ہر عالم کے اپنے الفاظ میں درج کرتے ہیں۔ اس تعریف کا مطالبہ کرنے سے پہلے ہر گواہ کو واضح طور پر سمجھا دیا گیا تھا کہ آپ وہ قلیل سے قلیل شرائط بیان کیجئے جن کی تکمیل سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور یہ تعریف اس اصول پر مبنی ہونی چاہیے جس کے مطابق گریمر میں کسی اصطلاح کی تعریف کی جاتی ہے' نتیجہ ملاحظہ ہو:

مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری' صدر جمعیت العلمائے پاکستان:

س۔ مسلم کی تعریف کیا ہے؟

ج۔ اول: وہ توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔

دوم: وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمام انبیائے سابقین کو خدا کا سچا نبی مانتا ہو۔

سوم: اس کا ایمان ہو کہ پیغمبر اسلام صلعم انبیاء میں آخری نبی ہیں۔ (خاتم النبیین)

چہارم: اس کا ایمان ہو کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام پیغمبر اسلام صلعم پر نازل کیا۔

پنجم: وہ پیغمبر اسلام صلعم کی ہدایت کے واجب طاعت ہونے پر ایمان رکھتا ہو۔

ششم: وہ قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

س: کیا تارک صلوٰۃ مسلم ہوتا ہے؟

ج: جی ہاں۔ لیکن منکر صلوۃ مسلم نہیں ہو سکتا۔

مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان:

س: از راہ کرم مسلم کی تعریف کیجئے۔

ج: وہ شخص مسلم ہے جو (1) قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور (2) رسول اللہ صلعم کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہو۔ ہر شخص جو ان دو شرطوں کو پورا کرتا ہے مسلم کہلانے کا حق دار ہے اور اس کے لیے اس سے زیادہ عمل کی ضرورت نہیں۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی:

س: از راہ کرم مسلم کی تعریف کیجئے:

ج: وہ شخص مسلم ہے جو (1) توحید پر (2) تمام انبیاء پر (3) تمام الہامی کتابوں پر (4) ملائکہ پر (5) یوم الآخرہ پر ایمان رکھتا ہو۔

س: کیا ان باتوں کے محض زبانی اقرار سے کسی شخص کو مسلم کہنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور آیا ایک مسلم مملکت میں اس سے وہ سلوک کیا جائے گا جو مسلمانوں سے کیا جاتا ہے؟

ج: جی ہاں

س: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہوں تو کیا کسی شخص کو اس کے عقیدے کے وجود پر اعتراض کا حق حاصل ہے ؟

ج: جو پانچ شرائط میں نے بیان کی ہیں وہ بنیادی ہیں۔ جو شخص ان شرائط میں سے کسی شرط میں تبدیلی کرے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

غازی سراج الدین منیر:

س: از راہ کرم مسلم کی تعریف کیجئے۔

ج: میں ہر اس شخص کو مسلم سمجھتا ہوں جو کلمہ لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے اور رسول پاک صلعم کے نقش قدم پر چل کر زندگی بسر کرتا ہے۔

مفتی محمد ادریس، جامعہ اشرفیہ، نیلا گنبد لاہور:

س: از راہ کرم مسلمان کی تعریف کیجئے۔

ج: لفظ مسلمان فارسی زبان کا لفظ ہے۔ مسلم کے لیے فارسی میں جو لفظ مسلمان بولا جاتا ہے اس میں اور لفظ مومن میں فرق ہے۔ میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں لفظ مومن کی مکمل تعریف کروں کیونکہ اس امر کی وضاحت کے لیے بے شمار صفحات درکار ہیں کہ "مومن" کیا ہے؟ جو شخص اللہ کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے وہ مسلم ہے اس کو توحید الٰہی، رسالت انبیاء اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا چاہیے جو شخص اذان یا قربانی پر ایمان نہیں رکھتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس طرح بے شمار دیگر امور بھی ہیں جو ہمارے نبی کریم سے ہم کو تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں۔ مسلم ہونے کے لیے ان سب امور پر ایمان لانا ضروری ہے، میرے لئے یہ قریب نا ممکن ہے کہ ان

تمام امور کی مکمل فہرست پیش کروں۔

حافظ کفایت حسین، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ:

س: مسلمان کون ہے؟

ج: جو شخص (1) توحید (2) نبوت (3) قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ مسلمان کہلانے کا حقدار ہے۔ یہ تین بنیادی عقائد ہیں جن کا اقرار کرنے والا مسلمان کہلا سکتا ہے۔ ان تین بنیادی عقائد کے معاملے میں شیعوں اور سینوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، ان تین عقیدوں پر ایمان رکھنے کے علاوہ بعض اور امور ہیں جن کو "ضروریات دین" کہتے ہیں۔ مسلمان کہلانے کا حقدار بننے کے لیے ان کی تکمیل ضروری ہے۔ ان ضروریات کے تعین اور شمار کے لئے مجھے دو دن چاہیں لیکن مثال کے طور پر یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ احترام کلام اللہ، وجوب نماز، وجوب روزہ، وجوب حج مع الشرائط اور دوسرے بے شمار امور "ضروریات دین" میں شامل ہیں۔

مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیت العلمائے پاکستان:

س آپ کے نزدیک مسلمان کون ہے؟

ج: جو شخص ضروریات دین پر ایمان رکھتا ہے وہ "مومن" ہے اور ہر مومن مسلمان کہلانے کا حقدار ہے۔

س: ضروریات دین کون کون سی ہیں؟

ج: جو شخص پنج ارکان اسلام پر اور ہمارے رسول پاک صلعم پر ایمان رکھتا ہے وہ ضروریات دین کو پورا کرتا ہے۔

س آیا ان پنج ارکان اسلام کے علاوہ دوسرے اعمال کا بھی اس امر سے کوئی تعلق ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہے یا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔؟

نوٹ گواہ کو سمجھا دیا گیا تھا کہ دوسرے اعمال سے وہ ضوابط اخلاقی مراد ہیں جو زمانہ حاضر کے معاشرے میں صحیح سمجھے جاتے ہیں۔

ج: یقیناً تعلق ہے۔

س: پھر آپ ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہیں گے جو ارکان خمسہ اور رسالت پیغمبر اسلام پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کی چیزیں چرا لیتا ہے۔ جو مال اس کے سپرد کیا جائے اس کو غبن کر لیتا ہے، اپنے ہمسائے کی بیوی کے

متعلق نیت بد رکھتا ہے اور ایسے محسن سے انتہائی ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے؟

ج : ایسا شخص اگر ان عقیدوں پر ایمان رکھتا ہے جو ابھی بیان کیے گئے ہیں تو ان تمام اعمال کے باوجود وہ مسلمان ہو گا۔

مولانا محمد علی کاندھلوی، دارا لشابیہ، سیالکوٹ :

س : از راہ کرم مسلمان کی تعریف کیجئے۔

ج : جو شخص نبی کریم صلعم کے احکام کی تعمیل میں تمام ضروریات دین کو بجا لاتا ہے وہ مسلمان ہے۔

س : کیا آپ ضروریات دین کی تعریف کر سکتے ہیں۔؟

ج : ضروریات دین ہر مسلمان کو معلوم ہیں خواہ وہ دینی علم نہ رکھتا ہو۔

س : کیا آپ ضروریات دین کو شمار کر سکتے ہیں؟

ج : وہ اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا ذکر بے حد دشوار ہے۔ میں ان ضروریات کو شمار نہیں کر سکتا۔ بعض ضروریات دین کا ذکر کیا جا سکتا ہے مثلاً صلوٰۃ وصوم وغیرہ

مولونا امین احسن اصلاحی :

س : مسلمان کون ہے؟

ج : مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیاسی مسلمان دوسرے حقیقی مسلمان۔ سیاسی مسلمان کہلانے کی غرض سے ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ :

(1) توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔

(2) ہمارے رسول پاک کو خاتم النبین مانتا ہو یعنی اپنی زندگی کے متعلق تمام معاملات میں ان کو آخری سند تسلیم کرتا ہو۔

(3) ایمان رکھتا ہو کہ خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

(4) روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

(5) قرآن مجید کو آخری الہام الٰہی یقین کرتا ہو۔

(6) مکہ معظمہ کا حج کرتا ہو۔

(7) زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔

(8) مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا ہو۔

(9) اسلامی معاشرے کے ظاہری قواعد کی تعمیل کرتا ہو۔

(10) روزہ رکھتا ہو۔

جو شخص ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہو وہ ایک اسلامی مملکت کے پورے شہری کے حقوق کا مستحق ہے اگر وہ ان میں سے کوئی ایک شرط پوری نہ کرے گا تو وہ سیاسی مسلمان نہ ہو گا (پھر کہا) اگر کوئی شخص ان دس امور پر ایمان کا محض اقرار ہی کرتا ہو گو ان پر عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو یہ اس کے مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے۔

حقیقی مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کے تمام احکام پر عین اس طرح ایمان رکھتا ہو اور عمل کرتا ہو جس طرح وہ احکام و ہدایات اس پر عائد کیے گئے ہیں۔

س۔ کیا آپ یہ کہیں گے کہ صرف حقیقی مسلمان ہی "مرد صالح" ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ اگر ہم آپ کے ارشاد سے یہ سمجھیں کہ آپ کے نزدیک سیاسی مسلمان کہلانے کے لیے صرف عقیدہ کافی ہے اور حقیقی مسلمان بننے کے لیے عقیدے کے علاوہ عمل بھی ضروری ہے تو کیا آپ کے نزدیک ہم نے آپ کا مفہوم صحیح طور سے سمجھا ہے؟

ج۔ جی نہیں۔ آپ میرا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھے۔ سیاسی مسلمان کے معاملے میں بھی عمل ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان عقائد کے مطابق عمل نہیں کرتا جو ایک سیاسی مسلمان کے لیے ضروری ہیں تو وہ سیاسی مسلمانوں کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔

س۔ اگر کوئی سیاسی مسلمان ان باتوں پر ایمان نہ رکھتا ہو جن کو آپ نے ضروری بتایا ہے تو کیا آپ اس شخص کو بے دین کہیں گے۔؟

ج۔ جی نہیں میں اسے محض بے عمل کہوں گا۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ کی طرف سے جو تحریری بیان پیش کیا گیا اس میں مسلم کی تعریف یہ کی گئی کہ مسلم وہ شخص ہے جو رسول پاک صلعم کی امت سے تعلق رکھتا ہے اور کلمہ طیبہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے۔

ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرہ کی ضرورت ہے؟ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں اگر ہم اپنی طرف سے مسلم کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم دین نے کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ

اسلام سے خارج کر دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے۔"

— جبکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ "مسلم" کا لغوی مطلب ہے "سر جھکا دینے والا" یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکا دینے والا۔ سورۃ البقرۃ آیت 112 کے بموجب "وہ جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دے اور یہ جھکنا خوبصورت انداز میں ہو"

"کافر گر:"

س۔ حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ، امام ابو حنیفہ، امام محمد بن ادریس شافعی، امام احمد بن حنبل، غزالی، رازی، ابن رشد، بو علی سینا، منصور حلاج، عمر خیام، ابن عربی، شیخ شہاب الدین، سرمد، شاہ ولی اللہ، شاہ اسماعیل شہید، سید احمد شہید، سرسید احمد خاں، مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالباری فرنگی محل، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علیخاں، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمود الحق، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، قائداعظم، علامہ اقبال، مولانا احمد علی، سید عطا اللہ شاہ بخاری— میں کیا خصوصیت مشترک ہے؟

ج۔ ان سب پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے۔

بقول شورش کاشمیری:

زباں بگڑی قلم بگڑا روش بگڑی چلن بگڑا
خود اپنے ہاتھ سے کافر گروں کا پیرہن بگڑا
چلا تکفیر کا جھکڑ کہ شرق و غرب کانپ اٹھے
اٹھی دشنام کی آندھی مزاج اہرمن بگڑا

کیونکہ دینی راہنما، مشائخ، مذہبی مبلغین، علماء و فضلا اور مولوی و ملا— مسلمان کی تعریف پر متفق نہیں اس لیے کسی کو بھی کافر، زندیق، بے دین، ملحد، دھریہ قرار دے دینا کتنا سہل ہو جاتا ہے اس کا اندازہ فتوی سازی کی تاریخ سے ہو جاتا ہے جو طویل ہونے کے ساتھ ساتھ اس بنا پر عبرت انگیز بھی ہے کہ عالم اسلام کی کیسی کیسی عہد ساز شخصیات کو کافر قرار دے دیا گیا۔ اس امر کو فراموش کر کے کہ کسی کو کافر قرار دینے کا مطلب مسلمانوں کے اس کے ساتھ ہر نوع کے سماجی رشتوں کے انقطاع کے ساتھ ساتھ اس کا

اپنی بیوی سے نکاح بھی فسخ ہو جاتا ہے اور از روئے شریعت حاکم وقت پر اس کا قتل لازم ہو جاتا ہے۔ بقول ذوق:

واجب القتل اس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

جبکہ حالی کے بقول:

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

نیت اور دل کا حال صرف خدا ہی جانتا ہے لہٰذا آنحضرت کی نبوت پر یقین رکھنے والا اور قرآن مجید کو خدا کی کتاب ماننے والا کلمہ گو مسلمان ہے لیکن ہمارے ہاں ان امور کو فراموش کر کے صرف خیالات و نظریات کی بنا پر کسی کو بھی کافر قرار دیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں قرآن مجید میں اور احادیث میں بے حد احتیاط کی تلقین کی گئی ہے مولانا محمد نصیر شادانی مضمون بعنوان "فتویٰ تکفیر کا شرعی جائزہ" میں رقم طراز ہیں:

"یہاں اس امر کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہو گا کہ از روئے شریعت اسلام کافر کون ہے؟ کافر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کی صفات کا انکار کرے یا اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک قرار دے یا محمد مصطفیٰ صلعم کی رسالت کا انکار کرے یا قرآن مجید کو کلام الٰہی نہ سمجھے۔ ان اصولی امور کے علاوہ جزئیات عقائد میں اختلاف ہرگز وجہ کفر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص وجود وحدت باری تعالیٰ مع صفات اور نبوت ختم المرسلین پر ایمان رکھتے ہوئے یہ تصور رکھتا ہے کہ دنیا میں دولت کی ناہمواری کو ایک خاص انتظامی طریقہ سے دور کیا جا سکتا ہے اور فلاں نظم و نسق سے عوام کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں تو یہ خیال ہرگز وجہ کفر نہیں ہو سکتا۔

اسلام تو دنیا کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں داخل کرتا ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمان تو کافروں کو مسلمان بنانے میں روحانی لذت محسوس کرتے تھے لیکن اس دور انحطاط میں مسلمانوں کو کافر بنانا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے پھر یہ تکفیر جب ایک سیاسی چٹخارے کے طور پر استعمال کی جائے تو اور بھی موجب لذت سمجھی جاتی ہے حالانکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ جو مسلمان ایک خدا ایک رسول ایک کتاب اور ایک قبلہ پر یقین رکھتے ہیں جب تک ان سے ضروریات دین میں سے کسی بات کا انکار صریحی طور پر ثابت نہ ہو وہ یقینی طور پر

مسلمان ہیں۔ انہیں کافر کہنا گناہ کبیرہ اور فعل حرام ہے چنانچہ قرآن کریم میں ہے:
اور جو شخص تمہیں سلام کہے تم اسے یہ نہ کہنا کہ تم مومن نہیں ہو آنحضرت رحمت اللعالمین کا ارشاد ہے:
جو شخص کسی مسلمان پر کفر کی تہمت لگائے تو وہ گویا اس کا قاتل ہے پھر حضور نے یہ بھی فرمایا:
جس شخص نے اپنے بھائی کو کافر کہا تو یہ کفران دونوں میں سے ایک پر ضرور لوٹے گا (یعنی کافر کہنے وال پر ہی عود کرے گا)
شرح فقہ اکبر امام ابو حنیفہ میں ہے:
جو بات کفر سے متعلق ہے اس کی حقیت یہ ہے کہ قائل کی مراد پوری طرح معلوم کی جائے اگر اس میں ننانوے احتمالات کفر کے ہوں اور ایک احتمال یہ ہو کہ اس کا مقصد کفر نہیں ہے تو مفتی اور قاضی کے لیے اولیٰ یہی ہے کہ وہ اس احتمال پر فتویٰ دے کیونکہ ایک ہزار کافروں کو اسلام میں رکھ لینا آسان ہے لیکن ایک مسلمان کو اسلام سے خارج کرنے کی غلطی بہت اشد ہے۔ سلطان اورنگ زیب کے فتاویٰ عالمگیری میں ہے جب کسی بات میں کئی پہلو ایسے نکلتے ہوں جو کفر تک لے جاتے ہوں اور ایک پہلو ایسا بھی ہو جس میں اسلام سے انکار نہ نکلتا ہو تو مفتی اور قاضی پر لازم ہے کہ وہ اس ایک وجہ سے اسلام کا اعتبار کرے اور اس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ دے۔ مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن سے کام لینا چاہیے۔
پھر جو لوگ بار بار اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں اور ضروریات دین میں سے کسی کا انکار ان سے صریحاً ثابت نہ ہو انہیں محض بدگمانی سے کافر کہتے چلے جانا اور یہ عنوان اختیار کرنا کہ وہ دل سے نہیں کہہ رہے یہ ایک اور غلطی اور گناہ کبیر ہے۔
حضور رحمت اللعالمین فرماتے ہیں:
بدگمانی سے بچو کہ ایسا گمان خود سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ حضور ایک ایسی ہی بدگمانی کے جواب میں اسامہ بن زید سے فرماتے ہیں:
"اے اسامہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ واقعی اس نے دل سے اقرار کیا تھا یا ڈر کے مارے اسلام قبول کیا تھا؟"(2)

"وقولوا للناس حسنا!"

"اپنی آواز ذرا پست رکھ' بے شک سب آوازوں سے بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی

ہے" (لقمان 31 سورۃ 19)

"اور لوگوں سے اچھی بات کہو" ! (سورۃ البقرۃ_ آیت- 10)

مگر اس کے برعکس ان فتووں کی زبان اور اسلوب کیسا ہوتا ہے- شورش کاشمیری کے مضمون "کیا یہ سب کافر ہیں؟ شرم تم کو مگر نہیں آتی" (مطبوعہ ہفت روزہ "چٹان" لاہور 15- اکتوبر 1962ء) سے نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے:

"شاہ اسماعیل کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

ا- "میرا مسلک یہ ہے کہ وہ یزید کی طرح ہے اگر کوئی کافر کہے تو ہم منع نہ کریں گے اور خود کہیں گے نہیں' البتہ سید احمد' خلیل احمد' رشید احمد (گنگوھی) اور اشرف علی (تھانوی) کے کفر میں جو شک کرے وہ خود کافر ہے—

"الملفوظ" (حصہ اول) صفحہ نمبر 134 مطبوعہ نوری کتب خانہ' بازار داتا صاحب لاہور

2- وہابی رافضی و غیرہم کفار و مرتدین کے جنازہ کی نماز انہیں ایسا جانتے ہوئے پڑھنا کفر ہے- (الملفوظ صفحہ نمبر 90)

3- بعض علی گڑھی کو سید صاحب کہتے ہیں (سائل جواب میں) ارشاد ہوتا ہے وہ ایک خبیث مرتد تھا- (الملفوظ حصہ سوم صفحہ 92)

یہ فتاویٰ جن کی مسلسل اشاعت اور فروخت ہو رہی ہے کسی معمولی ملا کے نہیں بلکہ اصاغر بریلی کے بحرالعلوم عطیہ نبی الامت صاحب حجتہ قاہرہ موید سنت زاہدہ' مجدد مایہ حاضرہ اعلیٰ الحضرت مولانا محمد احمد رضا خاں صاحب حنفی قادری برکاتی قدس سرالعزیز و نوراللہ مرقدہ کے ہیں اور مرتب ہیں فاضل جلیل عالی جناب مولانا مولوی محمد مصطفیٰ رضا خاں صاحب قادری نوری سلمہ— ناشر ہیں سید محمد حسن جیلانی قادری "[3]

جہاں تک اس فتوی سازی کا تعلق ہے تو عاشق رسول' قرآن مجید کو اپنی روح میں اترتا محسوس کرنے والے مفکر' مغرب کو اسلام کی بصیرت سے روشناس کرانے والے شاعر مشرق اور تصور پاکستان کے خالق علامہ اقبال کے بارے میں 1925ء میں مسجد وزیر خاں کے خطیب ابو محمد ولدار بھٹی کا فتوی درج ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسم پروردگار اور یزداں عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے اور اوتار ہنود کے

نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں۔ دریں صورت یزداں اور پروردگار کو آفتاب کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ھذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہین موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہین بزرگان دین فسق، لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکور توبہ نہ کرے اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔"(4)

—ایسے میں مصحفی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

دیکھ کر کتنے نصاریٰ تجھ کو مومن ہو گئے
بلکہ مومن بھی کئی اسلام سے جاتے رہے

"لیل و نہار" (کراچی: 19 اپریل 1970ء) میں قائداعظم پر کفر کے فتویٰ کا اشتہار شائع کرتے ہوئے فتویٰ کی عبارت نقل کی گئی ہے اس سے کچھ اقتباسات پیش ہیں:

"... 17-18 اپریل 1938ء کو کلکتے میں مسلم لیگ کا اجلاس مسٹر محمد علی جینا کی زیر صدارت ہوا جس کے خطبہ صدارت میں جینا صاحب نے فرمایا:

"ہم نے نام نہاد مولاناؤں کے اقتدار کا خاتمہ ایک حد تک کر دیا ہے جو دوسروں کی انگیخت پر قوم کے جذبات سے کھیلتے ہیں" ہمیں پورے انہاک اور جوش سے اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا چاہیے، اس جنگ آزادی میں ہمیں اپنی عورتوں کو بھی ساتھ رکھنا چاہیے۔"

دیکھو مکتبہ لیگ بھنڈی بازار، بمبئی نمبر2 کی شائع کردہ سیرت محمد علی جناح، صفحہ 2

2 جولائی 1939ء کو رات کے 9 بجے ڈونگری میر قیصر باغ شہر بمبئی میں مسلم لیگ کا ایک عام جلسہ زیر صدارت سر علی محمد خاں لیڈر آف مسلم لیگ ہوا۔ اس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے لیڈر راجہ محمود آباد نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا افسوس ہے کہ آج چالاکی سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کے سوالات اٹھا کر مسلمانوں میں نا اتفاقی پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اسلام میں کوئی اختلاف نہیں مگر ہاں سیاست میں ہے۔ آج مذہب کے نام سے لوگوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے، آگے چل کر آپ نے کہا ہمارے مولوی اور مولانا کہلوانے والے ہمکو ملیا میٹ کر رہے ہیں انہوں نے مذہبی دکانیں کھول رکھی ہیں۔" دیکھو گجراتی اخبار انصاف روزانہ بمبئی مورخہ 3 جولائی 1939ء نمبر110 جلد نمبر2 کا صفحہ 601"

— اور اب بانی پاکستان پر کفر کے فتوے کی عبارت نقل کی جاتی ہے:

"..... مسٹر محمد علی جینا جس کو لیگ اپنا قائداعظم اور قائد ملت اسلامیہ کہتی ہے وہ

مذہبا" "اثنا عشری رافضی خوجہ ہے"، حکم شریعت مسٹر جینا کے کافر مرتد ہونے کے لیے اس کا اثنا عشری رافضی ہونا ہی بس دلیل ہے مگر مسٹر جینا اگر صرف انہی دو کفروں پر اکتفا کرتا تو قائداعظم کی خصوصیت کہاں رہتی لہٰذا وہ اپنی اسپیچوں اپنے لیکچروں میں نئے نئے کفریات بکتا رہتا ہے....."

"لیل و نہار" کے اسی شمارہ میں طبع ایک مضمون "رات میں نے قتل حسینؓ پر بہت غور کیا" (بحوالہ جواہر الکلام صفحہ 88 از آقائی حاجی مرزا حسن مطبوعہ 1393ھ مطبع علمی تبریز — ایران) سے حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کے قتل کے فتووں کے بارے میں متعلقہ عبارت درج کی جا رہی ہے:

"حضرت علی پر خارجیوں نے کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا اور ان کو واجب القتل قرار دیا تھا لیکن حضرت سیدا لشہداء کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے قتل کے محضر پر دربار بنی امیہ کے ایک سو قاضیوں اور مفتیوں کی مہریں لگی تھیں اور سر فہرست قاضی شریح کا نام تھا" — بصرہ کے والی ابن زیاد نے جب حضرت امام حسینؓ کے قتل کا فتویٰ طلب کیا تو "قاضی شریح نے انکار کیا اور اپنا قلمدان اپنے سر پر دے مارا" مگر رات کو جب "ابن زیاد نے چند تھیلیاں زر کی اس کے لیے بھیج دیں" تو صبح اٹھ کر "نواسہ رسول کے قتل کا فتویٰ اس مضمون کا لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے نزدیک ثابت ہو گیا ہے کہ حسین ابن علی دین رسول سے خارج ہو گیا ہے لہٰذا وہ واجب القتل ہے۔"

ایک روایت ہے ان کے قتل کے فتویٰ کا مضمون اس طرح تھا کہ:

یہ امر میرے نزدیک تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ حسین ابن علی نے امام المسلمین امیرالمومنین یزید بن معاویہ پر خروج کیا ہے پس تمام لوگوں کو ان کا دفع کرنا اور قتل کرنا واجب ہے۔

ابن عربی کہتا ہے کہ اس فتویٰ کی وجہ سے ابن زیاد کے لشکریوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور کثرت سے لوگ حسین سے جنگ کرنے والی فوج میں داخل ہوئے"

"کافر سازی:"

اگر باب علم حضرت علیؓ اور نواسہ رسول نہ بخشے گئے اور انھیں کافر قرار دے دیا گیا تو پھر دیگر دینی شخصیات یا اہل علم پر کفر کے فتووں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اس سے یہ

بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کافر سازی کوئی آج کا وقوعہ نہیں بلکہ یہ چودہ سو سال پرانا ہے۔ خود برصغیر کی علمی' مذہبی اور تہذیبی تاریخ اس نوع کے فتاویٰ سے بھری پڑی ہے اور آج بھی یہ سلسلہ پوری شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ اس امر کے باوجود کہ "ضیاالحق نے مسجدوں کے خطیبوں کے بارے میں ایک سروے کرا دیا جس سے معلوم ہوا کہ ہمارے 90 فی صد خطیبوں کو نماز کا ترجمہ نہیں آتا" (ڈاکٹر مرتضیٰ ملک : جنگ لاہور 7 مئی 1994ء)

"سیاسی ہتھیار: تکفیر!"

یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ بیشتر مذہبی جماعتیں قائداعظم اور پاکستان کے خلاف تھیں' بعض اس لیے کہ وہ کانگریس کی ہم نوا تھیں' بعض اس لیے کہ قائداعظم کے پاس ان کی برانڈ کا اسلام نہ تھا اور بعض محض اس لیے کہ قائداعظم شیعہ تھے لہٰذا قائداعظم اور تصور پاکستان کی دل کھول کر مخالفت کی گئی وہ تو اللہ ہی کو پاکستان کا بننا منظور تھا ورنہ مذہبی راہنماؤں نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور اب یہی طبقہ خود کو پاکستان میں دین کا محافظ گردانتا ہے سو شوق تکفیر جاری ہے۔ روزنامہ جنگ (کراچی : 17 مارچ 1970ء) میں مولانا احتشام الحق تھانوی کا ایک طویل بیان چھپا تھا جس میں انہوں نے ان 113 مولویوں کی حمایت کی تھی جنہوں نے اشتراکی خیالات رکھنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا تھا۔ واضح رہے کہ اس فتویٰ پر سب سے پہلے دستخط بھی آپ ہی کے تھے۔ ملک کے تمام روشن خیال حضرات دانشوروں اور صحافیوں نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اب بھی یہ واقعہ فتویٰ سازی کے ضمن میں ایک مثال بن کر رہ گیا ہے۔ کہنے کا مقصد ہے کہ مختلف حکمران اپنے عہد میں حسب منشاء اور حسب ضرورت فتوے حاصل کرتے رہے ہیں لیکن جب 1857ء میں مسلمان انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی لڑ رہے تھے تو اس وقت کے علماء میں سے بعض کا اس جنگ کے بارے میں کیا رد عمل تھا اس کے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو پیام شاہجہانپوری کا ہفت روزہ "تقاضے" (لاہور : خصوصی شمارہ "1857ء کا جہاد" 15 مارچ' یکم اپریل 1983ء)

ہم نے 1990ء کے عام انتخابات میں بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب عبدالقادر آزاد کو ٹیلی ویژن پر دیکھا جس نے قرآن مجید سر پر رکھ کر یہ کہا کہ پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے والے دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے یوں بیک جنبش لب کفار کی تعداد میں لاکھوں کا اضافہ کر دیا۔ ہر چند کہ بدلے سیاسی حالات میں وہ اب اس کی تردید کرتے ہیں (روزنامہ جنگ لاہور 28 نومبر 1993ء)

ہمارے ہاں ہر الیکشن پر سیاسی مخالفین کے لیے حسب حال فتوے حاصل کیے جاتے ہیں۔ 1965ء کے صدارتی انتخابات میں پیر دیول شریف نے یہ اعلان کیا کہ اس نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر مراقبہ کیا تو دوران مراقبہ داتا صاحب نے بتایا کہ محترمہ فاطمہ جناح کے حامی گمراہ ہیں لہٰذا اس کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ 1971ء کے الیکشن میں ایک عالم دین کے بموجب پیپلز پارٹی کے خلاف ووٹ دینے والا ہر ووٹر لاکھوں نیکیوں کا حقدار ہو گا۔

1993ء کے انتخابات کے نتیجہ میں پیپلز پارٹی کی حکومت بنی۔ جب اسمبلی کی عمارت کو آگ لگی تو اسے بھی مذہبی رنگ دیتے ہوئے مولانا عبدالستار نیازی نے کہا کہ پیپلز پارٹی کی جیت کی وجہ سے اسمبلی کو آگ لگی ہے۔ سینٹر سمیع الحق نے فرمایا۔ "حالیہ انتخابات میں (مسلمان) عوام نے اسلامی قوتوں (جماعتوں اور افراد) کو مسترد کیا اس لیے پارلیمنٹ کی عمارت جل کر راکھ ہو گئی" مزید یہ کہ اس عمارت کا جلنا "پوری قوم بالخصوص منتخب نمائندوں پر خدا کا قہر ہے۔" سینیٹر حافظ حسین احمد کا ارشاد تھا"پارلیمنٹ کا نقشہ ایک یہودی نے تیار کیا تھا اس لیے یہ کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔" چند روز کے بعد سینیٹر سمیع الحق نے یہ بھی کہا۔ "قومی اسمبلی کو آگ اس لیے لگی کہ اس اسمبلی نے سینٹ کی طرف سے بھجوائے جانے والے شریعت بل کو مسترد کر دیا تھا۔"

احمد ندیم قاسمی نے اس پر اپنے احتجاجی کالم بعنوان "پارلیمنٹ کی آتش زدگی اور عقل و منطق کا زوال" (جنگ۔ لاہور) کا اختتام اس شعر پر کیا:

یوں مسلماں تو بہت ہیں مگر اب تک نہ سنا
اک مسلماں سے بھی اک پیر و اسلام کا نام

اور اسی سے ذہن یگانہ کے ان شعر کی طرف جاتا ہے:

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا

بھارت میں مسلمانوں کی جو حالت زار ہے وہ تبصرہ کی محتاج نہیں' ایسے میں جبکہ ہندو اکثریت سیاسی سماجی اور مذہبی ہر لحاظ سے انہیں پریشان کر رہی ہے اور دن دھاڑے بابری مسجد منہدم کر دی گئی تو وہاں بھی اتفاق اور بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے کے برعکس ایک دوسرے کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا عمل جاری ہے ملاحظہ ہو یہ خبر:

"نئی دہلی (ریڈیو رپورٹ) بھارت میں مہدوی فرقے کو دائرہ اسلام سے خارج

کرنے کے فتویٰ کے بعد مسلمان برادری میں باہمی کشیدگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مہدویوں کے مطابق انہیں دائرہ اسلام سے خارج کرنے کے فتویٰ کے پیچھے مجلس اتحاد المسلمین تنظیم کی اندرونی دھڑے بندی کار فرما ہے۔ بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق بھارت میں اس وقت مہدویوں کی تعداد 15 لاکھ ہے جو زیادہ تر حیدر آباد دکن، بنگلور، جونپور اور احمد آباد میں رہتے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ یعنی ڈیڑھ لاکھ مہدوی حیدر آباد دکن میں رہتے ہیں اور ان میں فتویٰ کے باعث سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ مہدویوں کے بقول فتویٰ کی بنیاد حج، روزہ، زکوٰۃ نماز اور قربانی وغیرہ کے مسائل پر ہو سکتی ہے مگر یہ فتویٰ سیاسی ہے۔ رپورٹ کے مطابق فتویٰ دینے والی تنظیم کے رہنما اور رکن پارلیمنٹ سلطان صلاح الدین اویسی نے اس تاثر کو غلط قرار دیا ہے کہ یہ فتویٰ سیاسی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ہم ایسے سیاسی فتویٰ دے کر اپنے مسلمان ووٹ بینک میں کمی کر سکتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مہدویوں کے مطابق حضرت مہدی ساڑھے پانچ برس پہلے بھارتی شہر جونپور میں ظاہر ہو چکے ہیں۔"

(روزنامہ جنگ لاہور 5 مارچ 1994ء)

اور ملاحظہ ہو یہ خبر بھی جس کی سرخی ہے۔ "مولانا نورانی کا ساتھ دینا آخروی سعادت کا باعث ہے۔ خواجہ سرفراز تونسوی!" — روزنامہ جنگ (15 جنوری 1994ء) کے مطابق لاہور میں "جمعیت علماء پاکستان کی مرکزی نائب صدر سجادہ نشین تونسہ شریف حضرت خواجہ سرفراز نے کہا ہے کہ قائد اہل سنت علماء شاہ احمد نورانی اصولی سیاست کے سچے امین اور ہر سنی کے دل کی دھڑکن ہیں اور مفاد پرستی و لالچ کے اس دور میں امام نورانی کا ساتھ دینا آخروی سعات کا باعث ہے۔"

"مرغ قبلہ نما:"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر علماء کرام اور مفتیان عظام جو ہر بات اور شخص کے بارے میں فتویٰ صادر فرماتے ہیں تو کس اتھارٹی یا اختیار کی بنا پر؟ کیا ہمارے ہاں کوئی ایسا مستند دینی ادارہ ہے جو ڈگری کی مانند اس امر کی توثیق کرتا ہو کہ فلاں بزرگ خصوصی تعلیمی استعداد پر استوار اہلیت کی بنا پر اس امر کے تصفیہ کا اہل ہو چکا ہے کہ فلاں شے مکروہ، ممنوع، حرام، یا موزوں و روا اور حلال ہے۔ یہ کتاب قابل ضبطی/ قابل سوختی ہے، یہ

شخص ملحد اور دھریہ ہے لہٰذا اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور یہ شخص کافر ہو چکا ہے اس لیے اس کا نکاح فسخ ہو گیا ہے' اس نوع کے سوالات کا پیدا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ ڈاکٹر محمد طفیل (ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد) کے مقالہ بعنوان "حدیث نبوی- فتاوٰی رضویہ کا بنیادی ماخذ" کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"عصر حاضر کے نامور محدث اور فقیہہ امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ (1272-1340ھ) نے فتویٰ نویسی کا آغاز 14 شعبان 1826ء کو کیا اس وقت آپ کی عمر 13 سال 10 ماہ اور چار دن تھی-"(5)

پاکستان میں تمام دینی مدارس اور اسلامی جامعات انفرادی حیثیت میں کارکردگی کرتی ہیں بالعموم ان کا تعلق کسی مخصوص مذہبی فرقہ یا مسلک سے ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے درسی نصاب اور طریقہ تدریس متعین ہوتا ہے- ان اداروں کے سربراہ علماء اور فضلاء تمام تر علم و فضل کے باوجود بھی— یونیورسٹی کی مانند— ملکی یا بین الاقوامی یا کم از کم بین الاسلامی سطح پر تسلیم شدہ کسی مربوط نظام تعلیم سے وابستہ نہیں ہوتے- وابستہ کیا ان کی تو اساسی صفت ہی ملکی سطح پر مروج اور مربوط نظام تعلیم سے خارج اور غیر متعلق ہونا ہے- بالفاظ دیگر قومی سطح پر تسلیم شدہ اور مشترک الاساس نظام پر استوار ایسا کوئی ادارہ نہیں جو مخصوص مدت تک حصول تعلیم کے نتیجہ میں ایک خاص علمی سطح حاصل کر لینے کے باعث فارغ التحصیل کو فتوی سازی کے اختیارات تفویض کر دیتا ہو- گویا مشترک معیار کے فقدان کے نتیجہ میں معاملہ انفرادی تعلیم' ذہنی سطح اور فکری کشادگی کا ہے' ایسے میں اگر فتووں میں تنوع اور آراء میں تناقص ملتا رہا تو مقام تعجب نہیں—

اس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بڑی جرات سے صورت حال کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے:

"جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے اس لیے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں- اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر

مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اپنے ارد گرد دو سو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں سوچتے ہیں اسی میں رہتے ہیں اور اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں..... دو سو برس کی جو وسیع خلیج انہوں نے اپنے اور زمانہ حال کے درمیان حائل کر رکھی ہے وہ اسلام اور جدید دنیا کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہیں ہونے دیتی جو اسلامی تعلیم کی طرف جاتا ہے وہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا جو دنیا کے کام کا بننا چاہتا ہے وہ اسلامی تعلیم سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے۔" ("تنقیحات" ص۔ (43

حواشی:

۱۔ ایسا ہی ایک اور بدنام لفظ "زندیق" ہے جو درحقیقت زرتشت کے پیروکاروں کے لئے تھا مگر بالعموم کفر و الحاد اور بے دینی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دیکھئے علامہ اقبال نے اس لفظ کے حوالہ سے ملا پر کیسی چوٹ کی ہے:

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

2۔ ہفت روزہ "لیل و نہار" (کراچی: 19 اپریل 1970ء)

3۔ ـــایضاًــ

4۔ بحوالہ "ذکر اقبال" از عبدالمجید سالک، ص: 30۔ 129

5۔ مقالہ مطبوعہ ماہنامہ "ضیائے حرم" لاہور۔ اگست 1993ء

9- "فحاشی اور عریانی کا سیلاب"

ہماری مذہب نما سیاسی جماعتوں کے پاس قومی اقتصادیات اور ملکی فلاح کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل نہیں اس لیے اسلام اسلام کرنے کے ساتھ اصل مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے عریانی اور فحاشی کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں یہ جانے بغیر کہ عریانی اور فحاشی کسے کہتے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ملاؤں اور مذہب نما سیاسی جماعتوں میں اور کسی بات پر اتفاق رائے ہو یا نہ ہو مگر اس پر یقیناً سب متفق ملیں گی کہ پاکستان میں بے حیائی، عریانی اور فحاشی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ جنس کے اس سیلاب کے ایک کنارے پر فحش عید کارڈ ہیں تو دوسرے پر ٹیلی ویژن اور فلمیں (بلکہ ان کے اشتہارات اور بورڈز بھی) ہیں تو درمیان میں عریانی کا موجیں مارتا اور فحاشی کا گرداب بہ داماں سیلاب ہے جس میں پاکستانی قوم بے بس تنکے کی مانند بہے جا رہی ہے۔

"بھان متی کا کنبہ:"

پاکستان میں کثرت استعمال کے باعث بھان متی کے کنبہ کے جو الفاظ معانی گنوا کر مفہوم مسخ کرا چکے ہیں ان میں قوم، عوام، فلاحی مملکت، سستا اور فوری انصاف، جامع منصوبہ، اعلیٰ اختیارات کا کمیشن، اسلامی مساوات، غدار، بھارتی ایجنٹ، یہودی لابی کے ساتھ ساتھ بے حیائی، جنس، عریانی اور فحاشی بھی ہیں۔ گرمی میں ایک سانس میں ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کر دینے کی مانند ان الفاظ کے استعمال سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان سے وابستہ مفاہیم کے بارے میں قطعی اور واضح شعور نہیں ہے انگریزی میں Obscenity, Sex, Pornography مخصوص معانی کے حامل ہیں جبکہ ہمارے ہاں بے حیائی، جنس، عریانی، فحاشی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ منفی بلکہ دشنامی اسلوب میں!

اس موقعے پر لمبی چوڑی اکیڈمک بحث سے گریز کرتے ہوئے مختصر ترین الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بے حیائی محض حیا سے اجتناب ہے۔ حیا اک ادائے ناز ہے لہٰذا اضافی۔ جنس انسانی جبلت ہے اور ہم سب اسی کا ثمر ہیں۔ عریانی ادب اور فنون لطیفہ سے وابستہ تخلیقات میں ناگفتنی کو گفتنی اور مخفی کو واشگاف کرنے کا ہنرمندانہ قرینہ ہے مگر فن کارانہ

اسلوب ہے کہ بعض اوقات تخلیق کے مخصوص تقاضوں، سماجی حقیقت نگاری، مخصوص صورت حال یا کردار سے وابستہ واقعیت نگاری کے لیے لازم ہوتا ہے۔ فحاشی جنسی فعل کی ایسی انتہائی واشگاف اور غیر تخلیقی صورت ہے جو فنکارانہ حسن سے تہی، غیر جمالیاتی اور محض کمرشل ہوتی ہے۔ زرد ادب اور نیلی فلمیں اس کی عامیانہ مثالیں ہیں جبکہ اردو ادب سمیت مصوری اور سنگ تراشی میں عریانی کی فن کارانہ مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ عربی میں لفظ فحش بے حیائی کے معنی میں آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد طفیل کے مقالہ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (مطبوعہ "ضیائے حرم" لاہور اپریل 1993ء) سے اس کے متنوع استعمالات کی مثالیں پیش ہیں:

۱۔"فواحش کی واحد فحش" ہے۔ لسان العرب میں اس کے درج ذیل معانی بیان ہوئے ہیں:

ا۔ **کل خصلتہ قبیحتہ فہی فاحشتہ من الاقوال والا فعال کماذکر فی حدیث عائشتہ لاتقولی ذلک فان اللہ لایحب الفحش ولاالتفاحش۔** "ہر بری عادت فحش شمار ہوتی ہے، چاہے اس کا تعلق اقوال سے ہو یا افعال سے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ فحش امور اور بے حیائی اپنانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

ب۔ **کل شئی جاوزحدھا وقدرہ فھو فاحش۔**
"ہر وہ چیز فحش ہے جو اپنی مقررہ حد اور مقدار سے تجاویز کر جائے۔"

ج۔ **کل امرلایکون موافقاللحق والقدر فھو فاحشتہ**
"ہر وہ معاملہ جو صداقت اور مقررہ مقدار کے مطابق نہ ہو وہ فاحشہ ہے۔"

د۔ **الفاحش، سیئی الخلق۔**
"بد اخلاق انسان کو فاحش کہتے ہیں۔"

ہ۔ **الفاحش فی الحدیث، کل مایشتد قبیحتہ من الذنوب والمعاصی۔**
"حدیث میں فاحش سے ہر وہ شخص مراد ہے جو گناہوں اور برائیوں کا ارتکاب بکثرت کرتا ہے۔"

ز۔ **افحش، القبیح من القول والفعل یقال افحش علیہ فی المنطق ای قال الفحش کما فی الحدیث ان اللہ یبغض الفاحش والمتفحع، الذی یتکلف بسبب الناس ویتعملہ۔**
"فحش سے قول و فعل میں برائی کرنا مراد ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں "افحش علیہ

القول" یعنی اس شخص نے فحش بات کہی جیسا کہ حدیث نبویؐ میں ہے' اللہ تعالی فحش کلام کرنے والے اور بتکلف فحاشی اپنانے اور جان بوجھ کر دوسروں کو گالی دینے والے کو ناپسند کرتا ہے۔"

(ماخوذ از منظور افریقی- لسان العرب' ج 6 ص 325 بیروت' دارالصادر 1375ھ /1956ء)

2- **ما عظم قبحہ من الافعال والاقوال**

"فحش اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحت (برائی) میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔"

(راغب اصفہانی' ابوالقاسم الحسین بن محمد' المفردات فی الفاظ القرآن' ص 373-374 مصر' مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ 1351ھ /1961ء)

3- **الفحشاء وھی کل ما استفحش ذکرہ بقبح مسموعہ**

"الفحشاء (واحد فحش) سے ہر وہ چیز مراد ہوتی ہے جس کے ذکر سے وحشت ہو اور جس کے سنائی دینا برا محسوس ہو۔"

(ابن جریر طبری- جامع البیان عن تاویل آی القرآن' ج 3 ص 303- 304 طبع دارالمعارف مصر)

4- **الفحشاء' اصلہ قبح النظر' ثم استعمل فی ما یقبح من المعانی' والشرع ہوالذی یحسن ویقبح' فکل مانہت عن الشرع فھو من الفحشاء**

الفحشاء "کا حقیقی معنی نظر کی برائی ہے- پھر یہ لفظ برے معانی کے لئے استعمال ہونے لگا- اچھائی اوربرائی (حسن وقبح) کا معیار شریعت متعین کرتی ہے- پس ہر وہ چیز جس سے شریعت نے منع کیا وہ "فحشاء" میں سے ہے۔"

(القرطبی: ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری- الجامع لاحکام القرآن ج 2 ص 209- 210 القاہرہ' مطبوعہ دارالکتب المصریہ 1353ھ /1935ء)

مختلف لغات اور تفاسیر میں لفظ فحش کی جو تعبیر بیان کی گئی ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ قول و فعل فحش کی تعریف میں آتا ہے جو معاشرتی قدروں کے خلاف ہو اور جو اخلاقی حدود سے گرا ہوا ہو' جسے عرف و عادت میں ناپسند کیا جاتا ہو- تاہم اسلام میں حسن و قبح کا معیار شریعت مقرر کرتی ہے اور جس امر سے شریعت نے منع کیا ہے وہ فحش کی تعریف میں آتا ہے- یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے:

ولا تقربوا الفواحش ماظھر منھا وما بطن- (سورۃ الانعام آیت 152)

"اور بے حیائیوں کے پاس بھی نہ جاؤ چاہے ان میں سے پوشیدہ ہوں یا ظاہر۔"

قرآن حکیم نے فحاشی کے ارتکاب سے بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے۔ مذکورہ بالا حکم کے باوجود جو لوگ بے حیائی کی طرف راغب رہتے ہیں اور افواہوں یا دیگر حرکات کے ذریعے برائی کو فروغ دینے میں سرگرم عمل رہتے ہیں انہیں سرزنش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین امنوا لھو عذاب الیم فی الدنیاولا خرتہ۔ (سورۃ النور آیت 19)

"بے شک جو لوگ (مسلمانوں میں) بے حیائی کا چرچا کرنے کو عزیز رکھتے ہیں، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں درد ناک عذاب ہے۔"

اس دنیوی اور اخروی عذاب میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے بے حیائی کے کاموں سے سختی سے منع فرما دیا ہے۔

ان اللہ لا یامر بالفحشاء۔ (سورۃ الاعراف آیت 28)

"بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔"

وینھی عن الفحشاء اوالمنکر (سورۃ النمل آیت نمبر 130)

"اور اللہ تعالیٰ فحش اور منکر باتوں سے روکتا ہے۔"

فحاشی کو نا پسند کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک عمدہ معیار مقرر فرمایا کہ

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماکان الفحش فی شئی الاشانہ، وماکان الحیاء فی شئی الازانہ۔

(مشکوۃ المصابیح مسلسل حدیث نمبر 4639)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جس چیز میں فحاشی ہو وہ اسے عیب دار بنا دیتی ہے اور جس چیز میں حیا ہو وہ اسے زینت بخشتی ہے۔"

اس حدیث سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ فحاشی کی ضد حیاء ہے۔ اور حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے اور انسانوں کو جنت کی طرف لے جاتا ہے۔ مسلمان حیاء دار ہوتا ہے اور وہ اسلامی حدود وقیود میں رہ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ جب کہ بے حیاء انسان جو کچھ چاہیے کر گزرتا ہے۔ وہ اخلاقی، سماجی اور مذہبی حدود وقیود کا پابند نہیں ہوتا۔"

"جنس کے متنوع مظاہر:"

قدیم تہذیبوں اور غیر متمدن بلکہ وحشی معاشروں تک میں بعض مخصوص رسومات کی حد تک جنس اور مذہب کا گہرا تعلق رہا ہے۔ ہندوؤں میں لنگم اور یونی کی پوجا، متھن کا تصور اور جنوبی ہند میں کھجوراہا کے مندر کے اصنام — ان سب کی مذہبی اساس ہے لہٰذا ان میں عریانی اور فحاشی نہ تلاش کی جائے۔ اسی طرح عالمی سطح پر ادبیات اور اخلاقی حکایات میں بھی اسی نوع کا مواد مل جاتا ہے اسی لیے منگمری ہائڈ نے History of Pornography کا آغاز بائبل سے کیا ہے۔ ہمارے ہاں رومی اور سعدی کی حکایات سے سب آگاہ ہیں، خود اردو میں دکھن کی "بھوک بل" اور قلی قطب شاہ کی "پیاریوں" سے چلیں تو مثنویوں، ریختی، اور لکھنؤی غزل کا مطالعہ کرنے پر مُلّا اور محتسب کے نقطۂ نظر سے قابل گرفت مواد کی کمی نہ ملے گی مگر یہ سب اس زمانے کے تقاضوں کی مطابق تھا۔ قدیم سوسائٹی کتنی Permissive تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف "مرقع دہلی" ہی کا مطالعہ کافی رہے گا۔ ہمارے بزرگ تو امراؤ جان ادا کے محفل نشین رہے اور ہمیں صرف دیکھنے کو فلم ملی۔ نثری داستانوں میں بھی واشگاف مناظر وصل مل جاتے ہیں بلکہ انگریزی عملداری میں تو "باغ و بہار" کے "فحش" حصے سنسر کیے گئے تھے (ملاحظہ ہو ڈنکن فاربس کا لندن سے طبع کردہ "باغ و بہار" کا چوتھا ایڈیشن : 1860ء) پاک باز عربوں نے یورپ کو Perfumed Garden اور بیلی ڈانس جیسے تحائف دیئے ہیں کہنے کا مطلب ہے کہ "مخرب الاخلاق" میں ہم مشرقی بھی خود کفیل رہے ہیں۔

آج فلم میں عریانی اور فحاشی دیکھنے والے کو دراصل فلم کی تاریخ کا علم نہیں، 1914ء میں خاموش فلم "ہریش چندر" اور 1931ء میں ناطق "عالم آرا" کے بعد خاصی دیر تک فلموں میں بوسہ بازی اور غسل کے مناظر عام تھے — "عالم آرا" کی ہیروئن زبیدہ اور دیگر ہیروئنیں یاسمین، ببو، نادیہ، مہتاب وغیرہ سب اس مذموم حرکت کی گنہگار رہی ہیں۔ یہ تو کہیں بعد میں سنسر شروع ہوا اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے "انگارے" کی صورت میں ادب کی ضبطی اور منٹو کے افسانوں پر مقدمات کا آغاز ہوا ورنہ اس سے قبل تو مذہبی کتابوں پر احتجاج ہوا کرتا تھا (مثال "امہات الامہ" کی سوختنی) جنس مسئلہ نہ تھی۔

"دوپٹہ کی جنس:"

اس پس منظر میں پاکستان میں بے حیائی، جنس، عریانی اور فحاشی کے سدباب کے لیے

سنسر شپ کا جائزہ لیں تو فلم اور ٹیلیویژن سب سے بڑے ہدف نظر آتے ہیں۔ ضیاء کے دور آمریت میں جس طرح سے ملایت نے فروغ پایا اور آزاد خیالی کی تکذیب کرتے ہوئے جس زور شور سے خرد سوزی کی مہم شروع کر کے غیر تخلیقی رویوں کی آبیاری کی گئی یہ سر چڑھے سورج کی مانند ہے۔ اسی دور آمریت میں سخت ترین سنسر شپ سے فلم انڈسٹری کو بے بنیاد بنانے کی سعی کی گئی اور ٹیلی ویژن ڈراموں کو برقع پہنا کر یوں بے دست و پا بنا دیا گیا کہ تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے چند اہل قلم کی استثنائی مثال سے قطع نظر غیر تخلیقی افراد ہی قواعد و ضوابط سے مطابقت رکھنے والے ڈرامے "گھڑ" سکے۔ سب سے زیادہ نیوز ریڈرز اور اناؤنسرز کی کم بختی آئی' جنہیں نا محرم مردوں کی نگاہوں سے بچانے کے لیے زبردستی یوں دوپٹہ اوڑھنے پر مجبور کیا گیا جیسے ان کی ساری عریانی سر اور تمام فحاشی بالوں میں اتر آئی ہو — یہ بھول کر کہ دوپٹہ اوڑھنے والی منی سکرٹ پہن کر بھی تو بیٹھ سکتی ہے! اس تگ و دو کا نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا کہ ملا اور مذہبی لیڈر نے جب بھی زبان کھولی ٹیلی ویژن ہی کو ملک میں عریانی اور فحاشی کے فروغ کا باعث ٹھہرایا۔ مرغی جان سے کھائی حلوہ کھانے والوں کو مزہ نہ آیا!

"سور سے پرہیز:"

سنسر شپ کی نوعیت' ضرورت' اہمیت اور فواید و نقصانات جیسے سوالات خاصے اہم اور توجہ طلب ہیں مگر اس وقت تو صرف اس بنیادی امر کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے کہ سنسر/پابندی/احتساب/ ضبطی/قدغن/ ٹیبو/ بین یہ سب اپنی نوعیت سے قطع نظر اس بنا پر غیر جمہوری ہیں کہ چند افراد کو یہ فتویٰ دینے کا اختیار کیسے حاصل ہو گیا کہ کروڑوں عاقل' دانا' بالغ اور خود مختار افراد یہ نہ دیکھیں/ یہ نہ سنیں/ یہ نہ پڑھیں/ یہ نہ لکھیں — لطیفہ یہ ہے کہ اس تمام احتسابی کارروائی کے باوجود معاشرہ پھر بھی "خراب" ہی رہتا ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں ڈاکو راج' سیاست دانوں کی کرپشن' پولیس کا ظلم' حکام کی نا اہلیت' سرکاری اہل کاروں کی رشوت' لیڈروں کا جمعہ بازار اور بادشاہوں کے قول و فعل میں تضادات افواہوں سے بڑھ کر تلخ حقیقت میں تبدیل ہو چکے ہوں' جہاں غیر منصفانہ تقسیم دولت نے مراعات یافتہ طبقہ اور غریب عوام میں بے انتہا وسیع خلیج پیدا کر دی ہو' جہاں بے کاری اور ناداری کی پیدا کردہ فرسٹریشن کی' بنا پر نئی نسل میں جرائم اور منشیات فروغ پا رہی ہوں اور ذہنی مریضوں اور خود کشی کرنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہو' جہاں آبادی کا کثیر حصہ صحت' تعلیم' پانی اور صاف ماحول جیسی بنیادی سہولتوں سے

محروم ہو اور جہاں کے عوام صرف سور نہ کھانے کے گناہ سے بچنے کے علاوہ بقیہ ہر نوع کے چھوٹے بڑے انفرادی' اجتماعی' اخلاقی' سیاسی' معاشرتی اور مذہبی گناہوں کا بصد مسرت ارتکاب کرتے ہوں تو ایسے میں انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ان تمام خوفناک مسائل اور پریشان کن صورت حال کا حل فلموں سے رقص کے بعض مناظر کے سنسر اور نیوز ریڈرز اور ٹی وی اناؤنسرز کے سر پر دوپٹہ ڈالنے میں ہی مضمر ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہ عریانی اور فحاشی کے خلاف نعرے ہی ان تمام مسائل سے آنکھیں چرانے کا انداز ہوں؟ یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ مذہب نما سیاسی جماعتوں اور ملاؤں کے پاس مسائل کا کوئی حل موجود نہیں لہٰذا جب بھی کوئی بحران یا قومی اہمیت کا مسئلہ در پیش ہو تو عریانی اور فحاشی کی چھچھوندر چھوڑ دی جاتی ہے یہ فراموش کر کے کہ پاکستان میں ٹیلی ویژن کی عمر 28 اور فلم انڈسٹری کی 46 برس ہے— تو کیا اس سے پہلے فرشتے بستے تھے؟ جہاں کسی بھی ویڈیو شاپ سے دس روپے میں نیلی فلم حاصل کی جا سکتی ہو وہاں فلمی سنسر شپ کا تصور ہی بے معنی ثابت ہوتا ہے۔

"کار شر:"

فرد میں نیکی؛ کار خیر' حسن عمل' پاکیزگی اور نیک نفسی جیسے کرداری اوصاف شخصیت کے سوتے سے پھوٹتے اور برتر وجود کے مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ارفع ذات کی توسیع بھی ہوتے ہیں۔ مذہبی تعلیمات' اخلاقی معائیر' معاشرتی امتناعات اور سماجی قدغنیں راہ نما ستارہ کا کام کر سکتی ہیں' نیکی پر مجبور نہیں کر سکتیں۔ کار خیر ہمیشہ شخصیت کے مثبت پہلوؤں کے باعث ہو گا لہٰذا ایسا معاشرہ اور عمومی صورت حال پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کار خیر میں رکاوٹ نہ پیدا ہو سکے اور شخصیت کے مثبت پہلوؤں اور تخلیقی رویوں کے اظہار میں بند نہیں باندھنے چاہئیں لیکن ہمارے ہاں اس کے بالکل برعکس ہے کہ کار شر کے لیے ہر طرح کا تحفظ اور سہولت موجود ہے۔ بے حیائی' عریانی اور فحاشی کے سیلاب کو روکنے کے بجائے ظلم' تشدد' جبر' ناانصافی' عصبیت' تعصب اور کرپشن کے میلانات روکنے کی ضرورت ہے!

"انسانی حقوق کی پامالی:"

جس ملک کے اخبارات ظلم و تشدد کی داستانوں سے بھرے ہوں وہاں عریانی اور فحاشی ہی کو ہدف بنا لینے کا مطلب اصل مسائل سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ یکم جنوری

1993ء کے روزنامہ "جنگ" لاہور میں مطبوعہ ہیومن رائٹ کونسل کی سالانہ رپورٹ کے مطابق "92— پاکستان میں انسانی حقوق کی ریکارڈ خلاف ورزیاں' 23 افراد پولیس کی حراست میں ہلاک ہو گئے' سیاسی کارکنوں پر سادہ پولیس والوں کے تشدد کی نئی روایت ڈالی گئی— اخبارات پر دباؤ ڈالا گیا- صحافیوں پر حملے کیے گئے' گینگ ریپ کا نشانہ بنایا گیا— نومبر میں دس ہزار سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا— اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات محدود کر دیے گئے — دنیا بھر میں پاکستان کے وقار کو دھچکا لگا— سیاسی کارکنوں پر تشدد— جمہوریت کا جنازہ نکال دیا گیا— (یہ صرف تین کالمی خبر کی سرخیاں ہیں) اسی روز کے اخبار میں ایک دو کالمی خبر اگرچہ یہ خوشخبری سناتی ہے کہ "1990ء کے مقابلہ میں جرائم میں کمی ہوئی" مگر خبر کی دل دہلا دینے والی سرخیاں کچھ یوں ہیں— "ہر چھٹے دن قتل- ہر پانچویں گھنٹے ڈکیتی- ہر تیسرے دن بدکاری- ہر 36 منٹ پر چوری- 70 منٹ پر گاڑی چھیننے کی واردات- ہر 21 ویں گھنٹے اغوا برائے تاوان' سندھ میں جرائم کی شرح میں 9 فی صد اضافہ-"

"آج کا ویلن- ڈش انٹینا:"

10 اکتوبر 1992ء کے "جنگ" کے مطابق عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے ربوہ میں منعقدہ گیارہویں سالانہ کانفرنس کے اختتام پر ایک قرار داد کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ کیا کہ "عریاں فلموں' سی- این این' ایس ٹی این اور ڈش انٹینا پر پابندی عائد کی جائے"— 17 فروری 1993ء کے "جنگ" کے مطابق پنجاب اسمبلی نے "ڈش انٹینا پر پابندی کی قرار داد مسترد کر دی—" اس خبر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ "خاتون سپیکر فوزیہ بہرام کی موجودگی میں رانا ثناء اللہ کی ذومعنی تقریر اور امان اللہ چیمہ کے اشعار پر ارکان بار بار قہقہے لگاتے رہے— یہ تو تھیں سرخیاں اب خبر بلا تبصرہ درج ہے:

"لاہور (نمائندہ خصوصی) پنجاب اسمبلی میں گذشتہ روز ملک میں ڈش انٹینا کے عام استعمال پر پابندی کے بارے میں جماعت اسلامی کے پارلیمانی لیڈر ڈاکٹر محمد افضل اعزاز کی قرار داد ایک گھنٹہ تک گرما گرم بحث کے بعد مسترد کر دی گئی- خاتون سپیکر فوزیہ بہرام کی موجودگی میں پیپلزپارٹی کے رکن رانا ثناء اللہ کی دو معنی تقریر اور آئی جے آئی کے امان اللہ کے اشعار سے ارکان بار بار قہقہے لگاتے رہے- قائم مقام سپیکر نے متعدد بار اس کا نوٹس لیا اور مذکورہ رکن کو پارلیمانی حدود میں رہتے ہوئے پارلیمانی الفاظ کا استعمال کرنے کی ہدایت کی- ڈاکٹر محمد افضل اعزاز نے پرائیویٹ ممبر ڈے کے روز ملک میں ڈش انٹینا کی در آمد اور اس کے عام استعمال پر پابندی کی قرار داد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈش انٹینا کے عام استعمال

سے ملک میں فاشی عریانی اور بے راہ روی کا سیلاب آجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حکمران ایک طرف ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا دعویٰ کرتے ہیں دوسری طرف ریڈیو' ٹی وی پر مغربی تہذیب کی ترجمانی کی جاتی ہے اور قانون کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ریڈیو' ٹی وی' وی سی آر سستے اوراشیاء ضرورت مہنگی ہو رہی ہیں۔ ڈش انٹینا سے ایڈز کی بیماری بھی آئے گی۔ پی ڈی اے کے رکن رانا ثناء اللہ نے قرار داد میں ترمیم پیش کرنا چاہی۔ مگر قائم مقام خاتون سپیکر بیگم فوزیہ بہرام نے ترمیم مسترد کر دی۔ رانا ثناء اللہ نے قرار داد کی زبردست مخالفت کی اور کہا کہ ڈش انٹینا کے ذریعے ایڈز کی بیماری آنے کا محرک کا خدشہ درست نہیں۔ ڈش انٹینا دور جدید کی اہم ضرورت ہے جدید ٹیکنالوجی کو روکنا ناممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے معاشرے میں ایک طبقے کو مولوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ریڈیو ایجاد ہوا تو مولوی نے کہا کہ یہ شیطان کی آواز ہے جس گھر میں ریڈیو کی آواز آئے گی فرشتہ نہیں آئے گا' ٹی وی آیا تو کہا کہ یہ شیطان کی تصویر ہے' ٹی وی والے گھر میں نماز قبول نہیں ہوتی۔ اب ان مولویوں کے گھروں میں ریڈیو ٹی وی کے ساتھ وی سی آر بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈش انٹینا پر قابل اعتراض پروگرام شروع ہو تو بٹن دبا کر اسے بند بھی کیا جا سکتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ فاشی پہلے مولوی نے حجروں سے شروع کی' ٹی وی ریڈیو سے نہیں پھیلی' اس پر فرید پراچہ نے اعتراض کیا اور کہا کہ معزز رکن یہ بتا دیں کہ ان کا کس مولوی سے پالا پڑا ہے۔ رانا ثناء اللہ نے کہا یہ کھلا راز ہے کہ کس کا پالا کس سے پڑتا ہے جو مولوی کے پاس گیا ہو گا اس کا پالا پڑا ہو گا' مولوی شارٹ ہو جاتا ہے تو پھر بند نہیں ہوتا۔ سپیکر: مولوی نام اور کام کی حد تک قابل احترام لفظ ہے اس کی تضحیک نہ کی جائے۔ امان اللہ نے کہا کہ ٹی وی پر شعر و شاعری ہونی چاہیے۔ سپیکر نے کہا کہ آپ تشریف رکھیں' امان اللہ نے کہا کہ آپ کو شعر سنانا چاہتا ہوں' سپیکر آپ سے چیمبر میں شعر سنیں گے۔ سپیکر فوزیہ بہرام کو مخاطب کر کے امان اللہ نے شعر کا یہ مصرع:

"ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق"

پڑھا تو ارکان مسکرا دیئے' سپیکر نے کہا کہ قرارداد کے حوالے سے بات کی جائے۔ رانا ثناء اللہ نے کہا کہ ایم پی اے ہوسٹل میں بھی ڈش انٹینا لگا ہوا ہے ڈاکٹر افضل اعزاز بھی دیکھتے ہیں۔ چودہری محمد حنیف نے سخت غصے میں کہا کہ یہ کیا مذاق ہے افسوس ہے کہ مولوی کی توہین کی جارہی ہے اور سب تماشا دیکھ رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ڈش انٹینا مغرب کی سازش ہے تاکہ عریانی اور فحاشی پھیلا کر مسلمانوں میں جذبہ جہاد کو ختم کیا جائے۔ امان اللہ نے کہا کہ میں رانا ثناء اللہ کی تائید کرتا ہوں اور سپیکر فوزیہ بہرام کی طرف مسکرا کر یہ شعر پڑھا:

اب کچھ اور ڈھب سے آنکھ لگی
نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی

وزیر قانون سردار نصراللہ خاں دریشک نے کہا کہ ڈش انٹینا بیرونی دنیا سے رابطے کا ذریعہ بن چکا ہے اور جدید علم سے آگاہی کے لیے بہت ضروری ہے' ہمیں جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔ اس لیے قرار داد کو مسترد کیا جائے۔ ڈاکٹر افضل اعزاز نے کہا کہ ڈش انٹینا کی اجازت دینے سے آپ کو ایڈز کا بندوبست کرنا پڑے گا' آج خواتین کے ساتھ گینگ ریپ کے واقعات اسی کا نتیجہ ہیں۔ سپیکر نے ایوان کی رائے لینے کے بعد قرار داد کو مسترد کر دیا۔"

"مہم برائے انسداد عریانی و فحاشی:"

فلم ٹیلی ویژن اور ڈش انٹینا کے ساتھ ساتھ ایسے حضرات کی بھی کمی نہیں جنہیں اخبارات کے رنگین ایڈیشنوں میں بھی عریانی اور فحاشی دکھائی دیتی ہے۔ "جنگ" (3 جنوری 1993ء) سے یہ خبر درج کی جاتی ہے:

"اسلام آباد (این این آئی) سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسلامک یونین آف جونلسٹس پاکستان کے صدر اکرام الحق جاوید کی طرف سے اخبارات و جرائد میں عریانی و فحاشی کے خلاف 288 صفحات پر مشتمل عذرداری ساعت کے لیے منظور کر لی ہے جس میں درخواست دھندہ نے 74 صفحات پر اپنا موقف جبکہ 214 صفحات پر مشتمل شہادتی مواد عدالت عظمٰی کو فراہم کیا ہے۔ درخواست دھندہ نے عدالت عظمٰی میں موقف اختیار کیا ہے کہ فحاشی و عریانی سے پاک جرائد پاکستان جیسے نظریاتی ملک کے شہریوں کا بنیادی حق ہے جسے اخبارات و جرائد نے اپنی اشاعت میں اضافہ کی پالیسی کے تحت سلب کیا ہوا ہے۔ رٹ میں اخبارات کے رنگین ایڈیشنوں کو بے حیائی' بے پردگی اور عریانی کے فروغ کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور الزام لگایا گیا ہے کہ خواتین کے معاشرتی مقام کو ان ایڈیشنوں کے ذریعے ختم کیا جا رہا ہے۔ عذرداری میں عدالت عظمٰی سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ بے حیائی اور عریانی کے انسداد کے لیے تمام اخبارات کو ہدایات جاری کرے تاکہ ذرائع ابلاغ ملک میں اسلامی نظام کے لیے سازگار ماحول بنانے میں مدد دے سکیں"

اور اس کے ساتھ ہی یہ دو کالمی اشتہار بھی ملاحظہ کیجئے جو "مہم برائے انسداد عریانی و فاشی پوسٹ بکس نمبر 6216 لاہور" نے جنگ (17 نومبر 1993ء) اور دیگر اخبارات میں شائع کرایا:

"دینی و سیاسی جماعتوں، علمائے کرام اور خطبائے عظام کے نام اہم پیغام- ٹیلی ویژن کے جشن بے حیائی کے خلاف فوری ایکشن لیں"

(یہ عنوان ہے- متن ملاحظہ ہو)

"ٹیلی ویژن کے ذریعہ پھیلایا جانے والا عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا سیلاب پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا ہے- آپ بھی اس سے آگاہ ہیں مگر آپ کی طرف سے کسی قسم کے موثر ردعمل کا نہ ہونا، ایک قومی جرم ہے- اب ٹیلی ویژن پر جو چار روزہ "جشن بے حیائی" منایا جا رہا ہے اس کے ٹریلر دیکھ کر بھی آپ خاموش ہیں اور آپ کی غیرت ایمانی نہیں جاگی- انتخابی مہم کے دوران تو آپ یہ بلند و بانگ دعوے کرتے رہے ہیں کہ آپ اسلامی اقدار کا تحفظ کریں گے، عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا خاتمہ کرائیں گے مگر اب آپ "جشن بے حیائی" کے ٹریلر دیکھ کر بھی خاموش بیٹھے ہوئے ہیں- آپ کے پاس ان گنت مسجدیں، دینی مدارس اور بے لوث سیاسی کارکن ہیں- بے حیائی کے سیلاب کے خلاف ان کو متحرک کریں اور ہنگامی طور پر اس "جشن بے حیائی" کو منسوخ کرانے کے لیے پروگرام کا اعلان کریں- اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو یہی سمجھا جائے گا کہ آپ صرف گفتار اور وعدوں کے غازی ہیں اور کردار میں "جشن بے حیائی" کے پالیسی سازوں اور آپ میں کوئی فرق نہیں-"

اور تو اور بے چارہ عالم چنا بھی فحاشی کے الزام سے نہ بچ سکا فیصل آباد (جنگ 3- دسمبر 1991ء) کی خبر درج ذیل ہے:

"فیصل آباد (نمائندہ جنگ) دنیا کے طویل القامت شخص حاجی محمد عالم چنا نے کہا ہے کہ ان پر فحاشی کا الزام لگانے والوں کو کبھی معاف نہیں کیا جائے گا- وہ یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے، انہوں نے کہا کہ ان کے جس بینیفٹ شو پرپابندی لگائی گئی ہے اس میں کوئی ایسا ایکٹ نہیں تھا جو قابل اعتراض ہو، انہوں نے بتایا انہوں نے اپنے تمام پروگرام اور اس میں شامل سٹیج ڈرامہ کی مکمل تفصیل انتظامیہ کو دکھائی جس کی بعد میں انتظامیہ نے منظوری بھی دے دی اور فیصل آباد کونسل نے بھی اس کی منظوری دی مگر انتظامیہ نے علماء کے دباؤ میں آ کر منظوری منسوخ کر دی- انہوں نے کہا کہ اس سے قبل

بھی کئی مرتبہ یہاں سٹیج ڈرامے اور دیگر پروگرام منعقد ہوئے ہیں اور اب بھی جاری ہیں لیکن علماء کرام کو ان کا کوئی خیال نہیں ہے۔ عالم چنا نے کہا کہ اب تک 570 غیر مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بعض علماء کرام اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ان کے شو کے خلاف ہیں' عالم چنا نے بتایا کہ بعض علماء نے شو کے انعقاد کے لیے دو ہزار روپے روزانہ دینے کو کہا ہے انہوں نے مزید کہا کہ وہ فیصل آباد کے شہریوں کے لیے اپنے جذبات لے کر آئے تھے مگر بعض علماء نے انہیں پامال کیا ہے۔ علماء ان پر فتوے جاری کر رہے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ بیوہ عورتوں اور نادار لوگوں کی امداد کے لیے پروگرام منعقد کر رہے ہیں' انہوں نے کہا کہ ان کے پروگرام کی مکمل تفصیل کو پڑھ لیا جائے اگر ایک لفظ بھی قابل اعتراض ہوا تو وہ معذرت خواہ ہیں۔"

1992ء کے قومی انتخابات کی پیشکش کے لیے ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو ہفت روزہ "تکبیر" (کراچی: 14 اکتوبر 1993ء) نے "سیکس شو" قرار دیا تھا۔

مذہب نما سیاسی جماعتوں نے 1993ء کے انتخابات میں جو عبرت ناک شکست کھائی وہ سب کی آنکھیں کھول دینے کو کافی ہونا چاہیے کہ صرف 25ء 3 فی صد ووٹ' مرکز میں محض 9 اور صوبوں میں صرف 13 نشستیں حاصل کر سکیں۔ ایک اخباری اطلاع (روزنامہ جنگ۔ 13- اکتوبر 1993ء) کے بموجب "اسلامی فرنٹ نے اپنی پبلٹی پر 10 کروڑ روپے خرچ کیے۔" ڈاکٹر اسرار احمد کا اس تمام صورت حال پر تبصرہ پیش ہے (بحوالہ جنگ لاہور 30 اکتوبر 1993ء)

"لاہور (نیوز رپورٹر سے) امیر تنظیم اسلامی پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ہماری دینی جماعتیں ایک مغالطے کا شکار تھیں جو الیکشن کے نتائج آجانے کے بعد بھی اگر دور نہ ہوا تو سب سے بڑی بد قسمتی یہی ہو گی۔ وہ جامع القرآن ماڈل ٹاؤن میں تنظیم اسلامی کے اٹھارویں سالانہ اجتماع کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا الیکشن کے اکھاڑے میں اترنے والی مذہبی اور دینی جماعتوں کی توقعات ہرگز پوری نہ ہوں گی کیونکہ اسلام کے حق میں جو تبدیلی وہ لانا چاہتی ہیں اسے انتخاب کے راستے ہرگز نہیں لایا جا سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا میں یہ بھی پہلے لکھ چکا ہوں کہ بہت جلد مذہبی لبادہ اتار کر ہمارے ملک میں بھی عریاں سیکولرازم راج کرے گی لیکن صدمے کی بات ہے کہ معاملات میرے اندیشوں سے کہیں زیادہ خراب نکلے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ جن مذہبی جماعتوں کے تصور اسلام میں انسانی زندگی

کا معاشی، سماجی اور سیاسی پہلو بھی وہی اہمیت رکھتا ہے جو معاشرے کی تشکیل میں فی الواقع اسے حاصل ہے انہیں میں دینی جماعتیں کہتا ہوں۔ جنہوں نے یہ سمجھ کر انتخابات میں حصہ لیا کہ ہماری آبادی کی عظیم اکثریت مسلمان ہی نہیں بلکہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے علاوہ اللہ اور رسول کی محبت سے بھی سرشار ہے اور عمل کی جو کمی ہے وہ بھی اس لیے کہ ایک بالا دست طبقہ عوام کو غلط سمت میں لے جا رہا ہے۔ ان جماعتوں اور بالخصوص قاضی حسین احمد کا خیال یہ تھا کہ اگر عوام کی اسلام سے محبت استعمال کر کے الیکشن کے ذریعے ایک بار قوت کے سرچشموں پر قبضہ کر کے اس بالا دست طبقے کو عاجز کر دیا جائے تو تعلیم و تربیت کے ذرائع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور ریاستی وسائل کو کام میں لا کر اصلاح اور اس کی کمی دور کرنا بھی ممکن ہو گا۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ میں کم سے کم جماعت اسلامی سے یہ حسن ظن رکھتا ہوں جس نے پاکستان اسلامی فرنٹ کے نام سے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا، یہ غلط فہمی نیت کے فتور کا نتیجہ نہ تھی تاہم جس گھٹیا عوامی سطح پر اتر کر یہ کام کیا گیا اس نے رجال دین کے سر شرم سے جھکا دیئے اور پاکستان کے صحافی ادب میں ایک مزاحیہ کردار کا اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ بہرحال یہ ضرور فراموش کر بیٹھے تھے کہ پچاس سال پہلے اس قوم کی تحریک آزادی اور مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان سے مولانا مودودی اسی لیے لاتعلق رہے تھے کہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت صرف وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں جو خود اپنی زندگیوں پر اسلام نافذ کر چکے ہوں اور ان لوگوں پر ہی قائم ہو سکتی ہے جن کی ترجیحات کو بدلا جا چکا ہو، ورنہ تو ایک قومی حکومت وجود میں آسکتی ہے جس کا دین سے تعلق اتنا ہی ہو گا جتنا بالفعل عوام کی بھیڑ کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے رابطہ عوام کے ذریعے اس بابرکت نظام کی خصوصیات بیان کرنے کے علاوہ ان اصولوں اور قوانین و ضوابط کا شعور بھی عام کر رہے ہیں جن کا حاصل یہ خصوصیات ہیں اور اس کے ساتھ دلیل کے زور پر یہ بات بھی سمجھا رہے ہیں کہ نظام خلافت الیکشن کے ذریعے نہیں آئے گا کیونکہ الیکشن تو کسی بھی نظام کو چلانے کے لیے کرائے جاتے ہیں اسے بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے نہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ حالیہ انتخابات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ نظام بدلنا دور کی بات ہے یہاں تو چہرے بھی نہیں بدلے جا سکتے۔ نظام جو بدلنا ہے تو ایمان کی دعوت پر لبیک کہہ کر اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لینے والوں کو منظم کر کے ایک انقلابی جدوجہد پر لگانا ہو گا۔"

اس ضمن میں مدیر تکبیر جناب محمد صلاح الدین کا "اسلامی فرنٹ کی انتخابی کارکردگی" کا بے لاگ تجزیہ بھی بصیرت افروز ہے۔ ("تکبیر" کراچی: 21 اکتوبر 1993ء)

10- "عورت: چھوٹے فریم میں بڑی تصویر"

جہاں تک عورت کا تعلق ہے تو — وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ — جیسے شاعرانہ رویہ اور اس حقیقت کے باوجود کہ وہ لاتعداد گیتوں، تصویروں، مجسموں، خوابوں، داستانوں، جنون اور حکایات کے لیے موضوع بنتی رہی ہے یہ امر بھی برحق کہ دنیا کے کسی بھی معاشرہ اور تہذیب و تمدن میں اس سے کوئی اچھا سلوک نہیں روا رکھا گیا۔

سیمون دیوار نے اپنی تالیف "سیکنڈ سیکس" کا آغاز جس فقرہ سے کیا وہ اپنی بلاغت میں روسو کے اس مشہور قول کی یاد دلاتا ہے کہ فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا مگر آج وہ ہر طرف زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے جبکہ سیمون کے بقول:

"عورت اس طرح جنم نہیں لیتی جیسی کہ وہ بنا دی جاتی ہے۔"

مرد کی طرح عورت کو بھی خدا آزادی کی فضا میں سانس لینے کے لیے پیدا کرتا ہے لیکن پیدائش کے بعد ہی سے اس کی آزادی کی فضا کو مرد آلودہ کر دیتا ہے کہ وہ جس معاشرہ میں جنم لیتی ہے وہ مرد کا ساختہ ہے، جن معاشرتی اقدار کے سانچے میں اس کی شخصیت کو ڈھالا جاتا ہے وہ مرد کی تشکیل کردہ ہوتی ہیں، اسے تسلیم و رضا، صبر و تحمل، وفا، عصمت و عفت، خدمت و اطاعت، قربانی، عزت و ناموس وغیرہ کے جو درس عمر بھر دیئے جاتے رہتے ہیں تو یہ نصاب اس کے لیے مرد ہی تجویز کرتا ہے۔ وہ عمر بھر اپنی پسند و ناپسند، اپنی انا، اپنا پندار، اپنا حال، اپنا مستقبل الغرض پوری شخصیت مرد کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھالنے کو اُفتاں و خیزاں رہتی ہے مگر ہر بار — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا — والا عالم ہوتا ہے۔

"تصویر کائنات کا رنگ:"

عہد عتیق کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دیوتا کا غیض و غضب ٹھنڈا کرنے کے لیے باکرہ دوشیزہ بھینٹ چڑھائی جاتی تھی، نیل میں پانی نہ آئے کنواری لڑکی قربان کر دی جاتی، وہ عستارت اور مالیتا کے مندروں میں مقدس کسبی بنی تو جنوبی ہند کے مندروں میں دیوداسی، قدیم افریقہ اور عرب میں عورت کی شہوت کو اعتدال پر رکھنے کے لیے اس کا ختنہ

(Clitoris) کاٹ دیا جاتا تھا بعض قبائل میں مقدس پجاری، قبیلہ کا ساحر یا کاہن —— کبھی عوامی اجتماع میں اور کبھی خفیہ رسم کی صورت میں __ نوجوان لڑکی کا پردہ بکارت چاک کرتا (اسے De Flowering کہتے ہیں) بعض تمدنوں میں شادی کی پہلی رات کے اختتام پر بیوی کی عصمت کے ثبوت میں خون آلود چادر دکھائی/ لٹکائی جاتی تھی (برعکس صورت میں نتائج کا قیاس کیا جا سکتا ہے) چودھویں پندرھویں صدی کے یورپ کے سورما جنگ آزمائی کے لیے جاتے تو بیوی/ محبوبہ/ داشتہ کو "عصمت کی پٹی" (Chastity Belt) پہنا کر—— اسے پابند عصمت بنا کر گویا اپنے جنسی حقوق کا تحفظ کر لیتے۔

ہندو پتنی خاوند کے ساتھ چتا پر جل مرتی تو "ستی" (سچی) کہلاتی، شوہر کا نام اور اپنا ناموس بچانے کے لیے انفرادی یا اجتماعی خود کشی کی صورت میں "جوہر" کی رسم ادا کرتی تو وفا دار پتنی کا خطاب حاصل کرتی اور تو اور تمام وفاؤں کے باوجود بھی سیتا کو "اگنی پرکشا" دینی پڑی۔ اسلام سے قبل کے عرب مارے غیرت کے بیٹی کو زمین میں زندہ گاڑ دیتے۔ عورت منڈی کی زینت بنی، لونڈی بنی، باندی بنی، کنیز بنی، گولی بنی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طوائف بنی بلکہ طوائفیت کو تو دنیا کا قدیم ترین پیشہ قرار دیا جاتا ہے۔

"ناگن اور افعی:"

دنیا کے تین بڑے اور آسمانی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے پیرو کاروں میں سقوط آدم عورت کی کم بختی کا باعث بنتا رہا ہے۔ اس ضمن میں سانپ کا کردار تو فراموش کر دیا مگر حوا کی ترغیب یاد رہی، یوں عورت جنس کی علامت بن گئی تو جنس عورت کا استعارہ—— اور اس ضمن میں بھی مرد کے کردار کو فراموش کر کے ہر نوع کی طعن و تشنیع اور تعزیر عورت کے لیے مخصوص رہی۔ حضرت عیسیٰ جیسے کم ہی نکلے جنہوں نے سنگساری کے لیے زانیہ کو لانے والے مردوں سے کہا۔ تم میں سے اس پر پہلا پتھر وہ اٹھائے جس نے خود کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ یہ تو تھی مثالی بات۔ عمل کی مثالیں پیش ہیں۔

بنگلہ دیش کی خبر ملاحظہ ہو (جنگ لاہور 24 فروری 1994ء)

" ڈھاکہ (نمائندہ جنگ) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج امین الرسول نے سلہٹ کے ایک دور افتادہ گاؤں چھتک چھاڑا مسجد کے امام مولانا منان سمیت آٹھ افراد کو بیس سالہ نور جہاں کے سنسنی خیز قتل کے الزام میں سات سات سال قید بامشقت کی سزا کا فیصلہ سنایا اور فی کس دو ہزار ٹکا بطور جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا، جرمانہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں مزید ایک سال کی سزا بھی کاٹنی پڑے گی۔ گزشتہ سال نورجہاں کے والدین نے اپنی بیٹی کی پہلی

شادی کی ناکامی کے بعد نورجہاں کی دوسری شادی گاؤں کے ایک مزدور مطلب میاں کے ساتھ کرادی چھتک چھاڑا مسجد کے امام مولانا منان نے یہ نکاح پڑھایا لیکن کچھ دنوں کے بعد انہوں نے فتویٰ صادر کیا کہ نورجہاں اور مطلب میاں کی شادی غیر شرعی اور ناجائز ہے۔ بعدازاں ایک پنچایت بیٹھی جس نے نورجہاں کو ایک سو ایک پتھر اور اس کے والدین کو پچاس پچاس پتھر مارے گئے۔ نورجہاں ہر پتھر کی چوٹ پر چیختی رہی، درد کی شدت سے چلاتی رہی، روتی رہی، کہتی رہی مت مارو، مت مارو، میں بے قصور ہوں۔ پھر وہ کراہتی کانپتی کھڈ کے اندر بیٹھ گئی اس کا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ پتھر برسانے کا سلسلہ ختم ہوا تو اسے کھڈ سے نکالا گیا۔ لہولہان نورجہاں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ سسکتی ہوئی گھر کی طرف روانہ ہو گئی تاہم اس دوران اس نے فیصلہ کیا اسے زندہ نہیں رہنا چاہئے موت ہی اس بے حرمتی سے نجات دلا سکتی ہے لہٰذا وہ گھر پہنچ کر اپنی پھٹی ساڑھی گردن سے لپیٹ کر کھونٹی سے جھول گئی۔

بی بی سی کے مطابق بنگلہ دیش میں 9 دیہاتیوں اور امام مسجد کا قصہ گزشتہ دو ماہ سے قومی سطح پر ایک جذباتی نوعیت کے مباحثے کا موجب بنا ہوا ہے جنہوں نے مذہبی جنون کا مظاہرہ کرتے ہوئے مبینہ طور پر زنا کی مرتکب ایک نوجوان خاتون کو سنگ باری کا نشانہ بنایا تھا۔ تاہم نوبت سنگ باری سے سنگساری تک نہیں پہنچی۔ حقوق نسوانی کے پاسبان گروپوں نے امام مسجد اور دیگر افراد کو سنائی گئی سزا کو نرم قرار دیا ہے۔ یہ گروپ خودکشی کرنے والی خاتون کے حق میں قومی مہم چلاتے رہے ہیں۔ یہ عدالتی فیصلے پر بہت زیادہ ناخوش ہیں اور انہوں نے اس میں اضافے کی اپیل کی ہے۔ بی بی سی کے مطابق نورجہاں کو سنگسار کرنے کے فیصلہ کے نتیجہ میں اس کے جسم کو 101 پتھر لگے مگر اس کی روح کو اتنے گھاؤ لگے جنہیں کوئی گن نہیں سکتا تھا۔ بعدازاں اس نے خودکشی کر لی۔ غیر جانبدار دیہاتیوں کا کہنا ہے کہ مولوی منان نورجہاں پر عاشق تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کے دام میں پھنس جائے مگر نورجہاں نے مولوی صاحب کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ مولوی منان اس کی اس حرکت سے اس کا دشمن ہو گیا، اس نے نورجہاں پر پتھراؤ سے پہلے اس کے والدین کو پٹوایا اس واقعہ سے حقوق انسانی کے گروپ سرگرم ہو گئے ہیں۔"

بنگلہ دیش ہی کی ایک اور خبر بھی بحوالہ جنگ لاہور 13۔ اکتوبر 1994ء ملاحظہ ہو۔

"لاہور (جنگ فارن ڈیسک) ڈھاکہ سے دو سو کلو میٹر دور ایک گاؤں بے بھاتا میں ایک سولہ سالہ غیر شادی شدہ لڑکی کے حاملہ ہو جانے پر گاؤں کے مولوی نے اسے سنگسار کرنے

کا فتویٰ دے دیا۔ جس پر اس لڑکی زلیخا کو اس کے ماں باپ کی موجودگی میں ایک درخت سے باندھ کر ایک سو ایک پتھر مارے گئے جس سے وہ ادھ موئی ہو گئی اسے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ وہ راستے میں دم توڑ گئی۔ ایک برطانوی اخبار نے بنگلہ دیش کے ایک حوالے سے یہ افسوسناک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زلیخا کو تین بچوں کے باپ ایک شخص عبد الکریم نے ورغلا کر ہوس کا نشانہ بنایا تھا وہ حاملہ ہو گئی تو عبد الکریم دوسرے گاؤں چلا گیا پولیس نے مولوی اور دوسرے افراد کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے۔"

اس ضمن میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "اکنامسٹ" کا شمارہ 22-28 اکتوبر 1994ء

ایران میں "ایک ایرانی خاتون کو بدکاری کے جرم میں سنگسار کر دیا گیا" (جنگ : 5 مارچ 1994ء)اور دوبئی میں "اپیل کورٹ نے ایک 27 سالہ حاملہ خاتون کو زنا کاری کے جرم میں شرعی کورٹ کی جانب سے 180 کوڑے لگانے کی سزا برقرار رکھتے ہوئے قرار دیا کہ اس خاتون نے زنا کیا اس وجہ سے حاملہ ہوئی" (جنگ 29 مارچ 1994ء)

انسانی معاشرہ کے آغاز میں مادارانہ سربراہی کا نظام مروج تھا جس میں اولاد ماں کے نام سے منسوب ہوتی تھی چنانچہ گھر اور مال و املاک اور خاندان کی سربراہی عورت کے تصرف میں ہوتی تھیں۔ قدیم تمدنوں اور عتیق تہذیبوں کی اساطیر میں مادر اعظمیٰ، مادر گیتی (مدر ارتھ) مہامیا پر مبنی اساطیری تصورات اور زرخیزی اور بار آوری کی دیویاں اور ان سے منسوب رسوم بھی اس عہد کی مظہر ہیں جب عورت گھر کی مالک اور کنبہ کی سربراہ اور ایک سے زیادہ شوہروں کی مالک ہوتی تھی۔

"دیوی ـــــ پاؤں کی جوتی:"

مادرانہ سربراہی کی بہت سی وجوہ میں سے غالباً ایک بہت اہم وجہ مرد کی تولید میں اپنے کردار کی بنیادی اہمیت سے لاعلمی بھی تھی اس لیے چاند کی طرح گھٹتی بڑھتی اور اپنے دامن میں سمندروں کے مد و جزر سمیٹے عورت اس کے لیے خاصی پراسرار تھی۔ ادھر عورت کا حیض بھی اسے طلسمی سا محسوس ہوتا تھا چنانچہ عورت کے بارے میں عجیب اور پراسرار ہونے کے تصورات کی اساس ان ہی پر استوار ہے۔ اسی لیے کبھی وہ منحوس سمجھی گئی تو کبھی گندگی کی پوٹ اور ان سب پر مستزاد یہ احساس کہ عورت جنسی فعل کے ذریعہ مرد کی شکتی چوس لیتی ہے۔ آج بھی یہ اور ان سے مشابہہ تصورات مردانہ تحت الشعور میں پائے جاتے ہیں تو یہ سب ان ہی تعصبات کے باعث ہے جنہوں نے ہزاروں برس قبل کے انسانی آباء

سے ہمارا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیا۔

انتھرو پولوجی کے محققین کے بموجب آج سے کوئی چھ سات ہزار برس قبل کے معاشروں میں مقامی حالات، ضروریات اور وجوہات کے تحت —— مادارنہ نظام کا شیرازہ منتشر ہوا اور غالباً موجودہ عراق اور شام کی سمیری اور اکادی تہذیبوں میں اس عمل کا پہلے آغاز ہوا جو بالآخر پدرانہ سربراہی پر منتج ہوا۔ محققین اور ماہرین نے ان وجوہ کے سلسلہ میں خاصی خامہ فرسائی کی ہے (نفسیاتی نقطۂ نظر سے فرائڈ کی "ٹوٹم اینڈ ٹیبو" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے) بہرحال عورت کی جب بازی پٹ گئی تو وہ مادر اعظمیٰ کے بلند درجہ سے جو گری تو محض پاؤں کی جوتی بن کر رہ گئی۔

پدرانہ سربراہی کے ساتھ قبیلہ کی سرداری، جاگیرداری، حاکیت اور بادشاہت کا آغاز ہوا تو عوام پر اقتدار مسلط رکھنے کے لیے مقتدرہ اور مذہب نے مصافحہ کرتے ہوئے، مقتدرہ نے قوت اور مذہب نے خوف کا ہتھیار استعمال کیا۔ زمانے بدلتے گئے اور ان استحصال کرنے والوں کے نام اور حلئے بھی تبدیل ہوتے گئے مگر طریقہ واردات برقرار رہا۔ ادھر "ٹوٹم اور ٹیبو" کا دور آیا تو اپنے ساتھ جنسی الجھنیں، اعصابیت اور نیوراتیت کے تحفے لایا اور یوں مردوں کی نسل عجیب الجھنوں کی دلدل میں پھنس گئی۔ معلمین اخلاق نے اس دلدل کو عورت کا نام دیا اور اسی لیے عورت کے بارے میں مرد کے اس گومگو (Ambivalant) رویہ نے جنم لیا جس کے نتیجہ میں وہ بیک وقت اس کے لیے کشش بھی محسوس کرتا اور اس سے گریزاں بھی رہتا ہے۔ وہ اس سے فرار حاصل کرتا ہے لیکن خاصہ بھاگ لینے کے بعد جب رسی کی حد ختم ہو جاتی ہے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس رسی کا دوسرا سرا تو عورت کی کھونٹی سے بندھا ہے۔

"نیک پروین":

بحیثیت مجموعی عورت خوف کے پتھروں کی دیوار میں چنی جاتی رہی ہے حاکم، آقا، باپ، شوہر، بیٹا، سماج، قانون، ریت، رسم، قدغن، ناک، عزت، عصمت، اقتصادی جبر، قبر کا عذاب، حشر کی میزان، جہنم —— یہ ہیں وہ پتھر جن سے اس انار کلی کو چننے کے لیے دیواریں بنائی جاتی ہیں۔۔ پروین "نیک پروین" بننے کی کتنی بھاری قیمت ادا کرتی ہے اسے کون جانے؟

زیورات کے آغاز اور ان کے ارتقا کے بارے میں جو مباحث ملتے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ چوڑیاں، کانوں کی بندے، ناک کی نتھ، گلے کا ہار اور پاؤں کی پازیب وغیرہ

دراصل اس دور کی علامتی یادگار ہیں جب عورت یا تو جبراً اغوا ہوتی تھی یا اسے خریدا جاتا تھا اور واقعی جانوروں کی مانند باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ غار کا وحشی اپنی عورت کے لیے جانور کی کھال لاتا تھا آج کا لکھ پتی اپنی محبوبہ کو "منک" کا تحفہ دیتا ہے۔ وقوعہ ایک ہی ہے صرف کلچر کی تبدیلی نے تلازمہ تبدیل کر دیا ہے۔ ان مرئی زیورات کے ساتھ ساتھ اخلاقی پابندیاں عاید کرنے کی صورت میں پاکیزگی، وفا، عصمت، شرم، حیا کے ایسے آئیڈیل دیئے گئے جن کے ارفع ترین معیار کے حصول کے لیے عورت جتنی بھی کوشش کرے گی اتنا ہی مرد کا فائدہ ہو گا، یہ سب عورت کے غیر مرئی زیورات ہیں۔

"نیک پروین کا مسئلہ:"

عورت ـــــ آج بھی ـــــ دنیا کے قدیم ترین اور وسیع ترین موضوعات میں سے ایک ہے۔ مذہبیات، اخلاقیات، عمرانیات، بشریات، نفسیات اور نہ جانے کتنے علوم ہیں جنھیں محدب شیشہ بنا کر عورت کو دیکھا گیا جانچا گیا، پرکھا گیا اور پھر لیبلنگ کی گئی لیکن عورت کی چھان پھٹک کے سلسلہ میں سب سے بڑا گھپلا یہ ہوا کہ مرد نے اسے اپنے ساختہ معیاروں، علوم، تصورات، نظریات اور پالتو تعصبات کی روشنی میں دیکھا اس لیے مرد کی تمام نیک نیتی، غیر جانبداری اور خلوص، اور عورتوں کے لیے ہمدردی کے باوجود بھی ایسے مطالعات درست تناظر میں نہیں ہو پاتے کہ عورت کے معاملہ میں مرد ہمیشہ "باہر والا" ہی رہے گا۔ جس طرح طوفان اور طوفان کا مشاہدہ کرنے والا ایک نہیں ہو سکتے، آگ اور آگ تاپنے والا ایک نہیں ہو سکتے، ستارہ اور ستارہ شناس ایک نہیں ہو سکتے، پتنگ اور اسے اڑانے والا ایک نہیں ہو سکتے، گائے اور اسے دوھنے والا ایک نہیں ہو سکتے اور مرغی اور اسے ذبح کرنے والا ایک نہیں ہو سکتے اسی طرح مرد عورت کی ثنویت دائمی اور ابدی ہے حتیٰ کہ لمحہ وصال میں بھی جسموں کی یک جائی کے باوجود مرد اور عورت اپنے اپنے مدار کے سیارے رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام مردانہ مطالعات اور تجزیات عورت کو سمجھنے میں صرف جزوی صداقت اور جزوی افادہ کے حامل ثابت ہوتے ہیں۔

ہر معاشرہ کے مردانہ معیارات کے مطابق عورت خود کو بدلتی رہتی ہے۔ یہ عمل صدیوں سے جاری ہے اور اب بھی واضح یا غیر محسوس کن طور پر یہ عمل جاری ہے۔ مرد اخلاقی معیار بناتا ہے عورت کے لیے، مرد فیشن ایجاد کرتا ہے عورت کے لیے۔ مرد نصاب تعلیم مرتب کرتا ہے عورت کے لیے۔ مرد تصورات کا طلسم کدہ تیار کرتا ہے عورت کے لیے ـــــ الغرض! مہد سے لحد تک عورت شعوری یا غیر شعوری طور پر مرد کے ساختہ

سانچوں میں خود کو ڈھالنے میں اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف رہتی ہے اور اس پر بھی حالت یہ ہے کہ نطشے کا زرتشت یہ نصیحت کرتا ہے جب عورت کے پاس جاؤ تو اپنی چابک لے جانی نہ بھولو!

"نیک پروین کا المیہ:"

بحیثیت ایک فرد عورت کا سب سے بڑا مسئلہ اور اسی کے حوالہ سے سب سے بڑا المیہ اپنے وجود کا اعلان، ذات کا تشخص اور اپنی شخصیت کا اظہار ہے۔ میں اس ضمن میں خودی کا لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا مگر اقبال شناسوں کے مقالات سے مجھ پر یہ رمز غریب آشکار ہو چکا ہے کہ خودی مردانہ صفت ہے اس لیے یہ مرد مومن کا آئیڈیل تو ہو سکتی ہے عورت کی نہیں! اسی لیے تو علامہ اقبال عورت کی آزادی کو "زمرد کے گلوبند" کے مساوی جانتے تھے اور اسے زیادہ سے زیادہ اتنے رعایتی نمبر دینے کو تیار تھے:

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی، لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطون

عورت تمام عمر TO BE OR NOT TO BE کی کشمکش میں جو گرفتار رہتی ہے تو اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ TO BE یا NOT TO BE دونوں ہی کا انحصار "اس کے" مرد کے رویہ پر ہوتا ہے۔ مرد نے صدیوں سے وسائل پیداوار اپنے قبضہ میں رکھے اور یوں عورت کے لیے— قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش والی صورت پیدا کر دی۔ چنانچہ وہ ملکہ ہو یا باندی، بیوی ہو یا محبوبہ، کنیز ہو یا داشتہ بہرصورت مرد کی محتاج رہتی ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ شاہجہان نے ممتاز محل کی یاد میں کیا خوبصورت تاج محل تعمیر کرایا مگر یہ بہت کم جانتے ہیں کہ چہیتی بیوی کا انتقال چودھویں بچہ کی پیدائش کے دوران ہوا تھا۔

معاشرہ، مذہب، اخلاق، تعلیم، الغرض! ہر ذریعے سے عورت کو نہ صرف مرد کی خوشنودی کے لیے تیار کیا جاتا ہے بلکہ ہر ممکن طریقہ سے یہ باور بھی کرایا جاتا ہے کہ تیری فلاح اور بہبود، تیری عزت اور وقار کا مرد کی پیدا کردہ صورت حال کو بخوشی قبول کر کے اس کے پسندیدہ سانچے میں اپنے جذبات و احساسات کو ڈھال لینے ہی میں نسوانیت کی تکمیل اور عورت پن کی معراج ہے۔ چنانچہ صبر و ضبط، تحمل و عاجزی، زبان بندی اور جنسی وفاداری کو شرم و حیا کا نام دے کر ان سب کو شریف زادیوں کے زیورات قرار دے دیا۔ عورت یہ غیر مرئی زیورات پہن لے تو پھر مرد اسے حقیقی زیورات سے بھی پیلا کر دے گا

— کیا یہ بہت بڑا انعام نہیں؟

"فرمودات:"

ڈاکٹر اسرار احمد نامور دینی سکالر ہیں انہوں نے ایک انٹرویو میں عورت کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا:

"س- کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ مختلف موضوعات پر میں پوچھتا جاؤں' اول یہ کہ عورت کے دائرہ کار کے بارے میں آپ کی رائے؟

ج- اسے تو میں فوراً متعین کروں گا کہ وہ گھر کے اندر رہے اور جتنی ورکنگ خواتین ہیں ان کو فوراً پنشن پر بھیجا جائے۔

س- ان کا فائدہ تو ان کو ہو گا جو ملازمت میں ہیں' پنشن ان کو آپ نے دے دی لیکن جو ملازم نہیں ہیں جو آئندہ ملازمت میں نہ آ سکیں گی ان کو تو پنشن نہیں ملے گی؟

ج- ہاں جو اس وقت سروس میں ہیں ان کی کوئی صورت کر کے ان کے خرچ کی جو بھی ضروریات ہیں۔

س- آئندہ خواتین کی سروس کے بارے میں کسی بھی شعبے میں....

ج- آئندہ خواتین ملازمت میں نہیں آئیں گی۔ ہاں میڈیکل کے بارے میں کچھ ہو سکتا ہے۔

س- سکولوں کالجوں میں تدریس کے لیے؟

ج- ان کا علیحدہ نظام ہو لیکن یہ کہ ہمارے دفاتر میں ہمارے سٹوڈیو میں' پی آئی اے میں ہوسٹس قطعاً نہیں۔ خواتین کا اپنا نظام ہو اور وہاں یہ پڑھائیں۔

س- حجاب رو کے بارے میں کیا.....؟

ج- ہاں میں شدت سے قائم ہوں۔

س- چہرہ اور ہاتھ مستثنیٰ ہونے کی جو رائے ہے آپ اس کو.....؟

ج- نہیں..... میں اس کا قائل نہیں۔

س- تفریحات کے ضمن میں آپ کیا سمجھتے ہیں مثلاً ٹیلی ویژن ہے؟ اس میں کس نوعیت کی تبدیلی یا اصلاح آپ تجویز کریں گے؟ آپ نے یہ بھی پچھلے دنوں کہا تھا کہ خواتین نہیں بیٹھ سکتیں تو موقف تو آپ کا واضح ہو گیا۔

ج- خواتین اناؤنسرز ــــ میں اس کو گوارہ نہیں کروں گا۔

س۔ مرد اناؤنسرز کو خواتین دیکھیں گی؟.....
ج۔ اس حد تک میں گوارہ کر لوں گا اس لیے کہ پردے میں مرد کا عورت کو دیکھنا اور عورت کے مرد کو دیکھنے میں فرق ہے۔
س۔ مرد پروگرام کرے اور گھروں میں بیٹھی خواتین دیکھ لیں آپ کوئی حرج نہیں سمجھتے اور یہ جو ڈرامہ ہے اس میں کچھ پہلو رومانس کے بھی ہوتے ہیں؟
ج۔ میں قائل نہیں ہوں' ڈرامہ نہیں ہونا چاہیے۔
(انٹرویو مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور: 12 مارچ 1982ء انٹرویو: ارشاد احمد حقانی)

"قصہ ٹیڑھی پسلی کا:"

"بے شک اسلام لانے والے مرد اور اسلام لانے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور عاجزی اختیار کرنے والے مرد اور عاجزی اختیار کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت زیادہ یاد کرنے والی عورتیں۔ ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کیا ہے۔"[1] (سورۃ الاحزاب: 35)

قرآن مجید میں مرد اور عورت کی مساوات کا جس واضح اسلوب میں بیان ہوا اس کی موجودگی میں مرد کی برتری اور عورت کی کمتری کا سوال ہی نہیں پیدا ہونا چاہیے مگر یہ ہمارے جامد معاشرہ کے کمالات میں سے ہے کہ یہاں ہر عہد میں یہ سوال موجود رہا ہے۔ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے مسلمان مرد نے باپ بھائی شوہر ہونے کی حیثیت میں وہ غصب کر لیے کیونکہ پناہ' تحفظ' روزی اور عزت کے لیے وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ مرد اور عورت میزان زیست کے دو پلڑے قرار دیئے جاتے ہیں مگر عملاً ایک کے حق میں ڈنڈی ماری جاتی رہی ہے۔

ڈاکٹر شاہین سردار علی مقالہ بعنوان "عورتیں اور اسلام" میں رقم طراز ہیں:

"امہات المومنین میں سے حضرت ام سلمیٰ نے جب یہ سوال کیا کہ قرآن میں عورتوں کا ذکر کیوں نہیں ہے تو قرآن کی آیت 53 (سورۃ :33) نازل ہوئی جس

میں عورت اور مرد کو برابر قرار دیا گیا اور انہیں ایک ہی برادری کے ارکان بتایا گیا۔ آیت میں کہا گیا ہے کہ جنس خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا فیصلہ نہیں کرتی یہ ایمان اور خدا کی اطاعت ہے جو کسی کو خدا کے قریب کرتی ہے۔ عورت کے لیے ایک پوری سورۃ نساء نازل کی گئی جس میں وراثت کے اصول طے کیے گئے اور مرد کو زیادہ مراعات سے محروم کیا گیا"(2)

ابو ہریرہ (صحیح بخاری) سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو کیونکہ ان کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے اور سب سے ٹیڑھی پسلی اوپر والی ہے اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کو توڑ دے گا اگر چھوڑے گا تو وہ ٹیڑھی رہے گی' اس لیے عورتوں سے اچھا سلوک کیا کرو۔"(3)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی نفسیات کے بارے میں جو گہری بصیرت والی بات کی ہے اس سے "وجود زن" کو سمجھنے میں بے حد مدد ملتی ہے۔ اس حدیث اور مندرجہ بالا آیات کو ملا لیں تو عورت کا اسلامی تشخص اجاگر ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں اس سے بڑھ کر اور کیا لکھا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کے بقول:

عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا" (سورۃ البقر: 187) جبکہ ایک حدیث ہے:

"مجھے دنیا کی چیزوں میں سے عورت اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے"

—— اور ان سب خوبصورت باتوں کے باوجود مسلمان عورت—— نہ صرف پاؤں کی جوتی بنی رہی بلکہ ابھی تک اسے اسی حیثیت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور بھی کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں عورت کے ساتھ جو حسن سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تازہ ترین مثال پیش ہے جو اس بنا پر مزید قابل توجہ ہو جاتی ہے کہ ظالم شوہر حافظ قرآن اور امام مسجد ہے (جنگ لاہور 11 مارچ 1994ء)

"اسلام آباد (خبر نگار خصوصی) جنرل ہسپتال راولپنڈی کا وہ وارڈ انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے جہاں انوکھے انداز میں مرد کے جبر کا شکار ہونے والی ایک 24 سالہ پاکستانی خاتون موت کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ اس خاتون کی جان بچانے کے لیے ٹانگوں کے درمیان سے سینے تک پیٹ کے تمام حصے تقریباً کھولے کر دیئے گئے ہیں۔ موضع بھانٹ تحصیل جنڈ ضلع اٹک کی بد قسمت خاتون زینب نور جنرل ہسپتال راولپنڈی کے

سرجیکل وارڈ نمبر 9 میں مرد کے ظلم کی منہ بولتی تصویر بنی ہوئی ہے۔ زینب بی بی نے نمائندہ جنگ کو بتایا کہ میرا شوہر حافظ محمد شریف کھوڑہ میں موضع مٹور کی مسجد کا امام ہے۔ اس نے پہلے میری خوب پٹائی کی اور پھر بستر سے باندھنے کے بعد دو سلاخوں کو بجلی کے تار لگا کر مجھے تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس نے کہا کہ میرا شوہر انسان نہیں درندہ ہے، جب بجلی کا کرنٹ میرے جسم کے نازک حصوں میں گیا تو میری جان نکل گئی، مجھے تڑپتے دیکھ کر حافظ نے بجلی کا بٹن بند کر دیا اور چند منٹ کے بعد جب میرے ہوش و حواس بحال ہونے لگے تو اس نے بجلی کا بٹن پھر نیچے کر دیا اور بار بار اس عمل کو دہراتا رہا۔ درد سے کراہتی ہوئی زینب نور نے بتایا کہ حافظ نے اسی انداز میں مجھے دو دن تک گھر پر رکھا اور جب میں موت کے قریب پہنچ گئی تو وہ مجھے کھوڑہ کے ہسپتال میں لے گیا اور ڈاکٹروں کو بتایا کہ میں چولہے پر گر کر زخمی ہو گئی ہوں۔ ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تو وہ مجھے راولپنڈی میں لے آیا۔ زینب بی بی نے کہا کہ میرا شوہر مجھ سے ہر روز جھگڑا کرتا تھا اس روز بھی اس نے مجھے پورا دن لکڑیوں سے زدو کوب کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس روز اپنی پٹائی کی داستان اپنی والدہ کو بتا دی تھی اور حافظ نے میرے ساتھ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ میں نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی تفصیل اپنی والدہ کو بتائی تھی۔ اس سوال پر کہ آپ اپنے شوہر حافظ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی ہیں۔ زینب بی بی نے روتے ہوئے کہا کہ اس کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔ وارڈ میں موجود روبینہ نامی ایک نرس نے بتایا کہ ہم زینب کی جان بچانے کی سر توڑ کوششیں کررہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ زینب دنوں کی مہمان ہے۔ حافظ کے ایک پڑوسی غلام رسول نے بتایا کہ میاں بیوی کے درمیان جھگڑا رہتا تھا ڈیڑھ سال پہلے میرے بھائی کونسلر حاجی محبوب نے ان کے درمیان صلح کرائی تھی اور اپنی ذمہ داری پر زینب نور کو حافظ کے حوالے کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس نے موضع جھانٹ تحصیل جنڈ ضلع اٹک میں حافظ کے گھر پر چھاپہ مار کر لوہے کے وہ سلاخ اور بجلی کی تاریں برآمد کر لی ہیں جن کے ذریعہ زینب بی بی پر ظلم کیا گیا۔ اے پی پی کے مطابق خواتین کی غیر سرکاری تنظیموں کی مشترکہ ایکشن کمیٹی نے سپریم کورٹ سے مطالبہ کیا ہے کہ قاری شوہر کے اپنی بیوی کے ساتھ اس ظالمانہ فعل کا از خود نوٹس لے۔ خواتین کی متعدد تنظیموں اور این جی اوز کے اجلاس کے بعد مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ اس کیس کو عدالت سے باہر خاندانوں کے درمیان طے کرنے کی اجازت نہ دی جائے کیونکہ اس طرح مجرم سزا سے بچ جائے گا۔ بیان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قاری محمد شریف جو اس وقت

اڈیالہ جیل میں ہے اس کی ضمانت منظور نہ کی جائے اور اسے انصاف کے تقاضوں کے مطابق فوری سزا ملنی چاہیے۔"

اس ظالمانہ واقعہ کی تشہیر کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو نے ہسپتال میں زینب نور سے ملاقات کی اور اسے بغرض علاج لندن بھجوایا جہاں سے اس کی 12 جون 1994ء کو واپسی ہوئی اور 15 جولائی 1994ء کے اخبارات کے بموجب اس کے مجازی خدا کو تیس برس قید بامشقت کی سزا کے ساتھ 2 لاکھ روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی گئی ۔۔۔ یہ محض اس لئے ممکن ہو سکا کہ محترمہ بے نظیر نے ذاتی دلچسپی لی ورنہ ایسے کیس تو پولیس خود ہی نپٹا دیا کرتی ہے۔

اس انداز کے ہزاروں واقعات میں سے کبھی کبھی کوئی غلطی سے پریس یا عدالت میں آ جائے تو جی دہل کر رہ جاتا ہے جیسے ایک پیر صاحب نے "بدکار" عورت کو "آگنی پرکشا" کا حکم دیا۔ خبر درج ذیل ہے:

کراچی (پ پ ا) سندھ ہائیکورٹ نے ایک خاتون زینب بی بی کی زندگی بچائے جانے سے متعلق رٹ نپٹاتے ہوئے متعلقہ محکموں کو ہدایت کی ہے کہ مستقبل میں ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے سخت اقدامات کئے جائیں۔ تفصیلات کے مطابق سندھ ہائیکورٹ بار کے سابق صدر ظفر ہادی شاہ نے ایک پٹیشن فائل کی جس میں کہا گیا کہ شکار پور کی ایک خاتون زینب بی بی کو ایک مقامی پیر نے اپنی معصومیت ثابت کرنے کے لئے ننگے پاؤں آگ پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ خاتون پر اس کے خاوند نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مبینہ ناجائز تعلقات کا الزام لگایا تھا جس پر مست پیر نے خاتون کو معصومیت ثابت کرنے کے لئے آگ پر چلنے کا ایک دن مقرر کردیا تھا۔ یہ خبر اخبار میں شائع ہونے پر ظفر ہادی شاہ نے سندھ ہائیکورٹ میں پٹیشن فائل کی جس میں خاتون کی زندگی بچانے کی استدعا کی گئی۔ جس پر عدالت عالیہ کے قائم مقام چیف جسٹس پر مشتمل ڈویژن بنچ نے فوری کارروائی کر کے متعلقہ محکموں کو ہدایت کی کہ اس واقعہ کو فوری روکا جائے۔ بعد ازاں خاتون نے اپنے ایک خط میں ظفر ہادی شاہ کو بتایا کہ وہ اب اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی ہے اوراس کی زندگی کو اب کوئی خطرہ نہیں جس کی روشنی میں سندھ ہائیکورٹ نے درخواست نمٹا دی۔"

(روزنامہ جنگ لاہور۔ 2 اکتوبر 1994ء)

سودا نے کہا تھا:

دکھلایئے لے جا کے اسے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

مگر آج کے زمانہ میں نہ صرف عملاً "مصر کا بازار" قائم ہے بلکہ "چہ ارزاں فروختند" کا احساس بھی ہوتا ہے ملاحظہ ہو خبر (بحوالہ جنگ 3۔اکتوبر 1994ء

"لاہور (جنگ فارن ڈیسک) بھارتی صوبہ مہاراشٹر میں اس دور جدید میں بھی عورتوں کی سرعام نیلامی کا کاروبار ابھی جاری ہے۔ ایک بھارتی روزنامہ نے بتایا ہے کہ اس کا ایک رپورٹر شاہ پور کے ایک گاؤں عتوری سے گزر رہا تھا تو اسے ایک پنڈال کے اندر زبردست شور و غل سنائی دیا اس نے قریب جا کر دیکھا تو وہاں چھ عورتوں کی سرعام نیلامی کی جا رہی تھی۔ تین عورتوں کو ایک سو دو سو اور اڑھائی سو روپے کے عوض نیلام کر دیا گیا۔ اس علاقہ بھر میں ٹھاکروں کی حکومت ہے جن کے حکم سے ہی یہاں کی عورتوں کو نیلام کیا جاتا ہے۔"

"تار تار پیرہن:"

اسلام نے عورت کو عزت، حرمت اور وقار و احترام دیا، اسے حقوق دے کر نظام زیست میں اس کا کردار متعین کیا۔ قرآن مجید کی آیات مقدسہ اور آنحضرت کی احادیث مبارکہ میں عورت کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا اس میں کسی طرح کا ابہام نہیں، واضح اور دو ٹوک اسلوب میں قطعی انداز میں بات کی گئی ہے مگر اس کے باوجود اسلامی ممالک سمیت پاکستان میں عورت کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اسے واضح کرنے کے لیے بطور خاص مثالوں کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ ہم سب اسی معاشرہ کا حصہ ہیں بلکہ عورت کے معاملہ میں اپنی سی کرنے سے چوکتے بھی نہیں! یہی نہیں بلکہ ظالم کے ظلم کے جواب میں خاموشی یا لاتعلقی اختیار کر کے کسی حد تک ہم خود بھی عورت پر ظلم میں (بالواسطہ طور ہی سے سہی) شریک ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں صحیح بخاری اور مسلم کی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث بھی ملاحظہ ہو:

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اپنے) مسلمان بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظلوم کی تو میں مدد کرتا ہوں ظالم کی مدد کیونکر کروں، آپ نے فرمایا اس کو ظلم سے روک، تیرا اس کو ظلم سے باز رکھنا ہی مدد کرنا ہے۔"

—— حضور نے کیسی خوبصورت نصیحت کی اے کاش! مسلمان اس پر عمل پیرا ہو سکتے۔ قرآن مجید نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا تھا مگر مرد کا سر دامن کبھی بھی تر نہ ہوا جبکہ ہمیشہ عورت کا پیرہن ہی تار تار نظر آتا ہے۔ اس پر گندگی اچھالی جاتی

ہے اس کو آلودہ کیا جاتا ہے اور اسی کو داغدار کیا جاتا ہے—— کیوں؟

''الزام کی چادر ...:''

تار تار پیرہن اور الزام کی چادر سر پر— یہ ہے مقدر پاکستان میں عورت کا' کشور ناہید کے ایک کالم سے منہ بولتی سطریں پیش ہیں:

''بھلا ہو ہماری دوست نور الہدیٰ کا کہ جس نے ماروی ڈرامہ لکھ کر اپنے ملک کے پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگوں کو بتایا کہ اکیسویں صدی کے دوراہے پر آج بھی سندھ کے دیہاتوں اور قصبوں میں کارو کاری کی رسم جاری ہے۔

یہ رسم ہوتی کیا ہے' شروع زمانے سے قبائلی طرز پر یہ رسم جاری ہے۔ جب کبھی کوئی لڑکا اور لڑکی زنا کے سلسلے میں پکڑے جاتے ہیں علاقے کا جرگہ ان کا مقدمہ سنتا ہے' فیصلہ سناتا ہے قصورواروں کو سزا دیتا اور جرمانہ کرتا ہے۔ ہر سزا کا بدل بھی ممکن ہے یعنی رقم دے کر قصاص ہو سکتا ہے۔

تو ہوتا کیا ہے اور کیسے ہوتا ہے میں آپ کو اسی ماہ ستمبر میں پٹارو کے جنگلوں کے پار ایک گوٹھ میں ہونے والی واردات کی پوری تفصیل سنا کر بتاتی ہوں۔

اس گوٹھ میں ایک لڑکی اور لڑکے کو زنا کے جرم میں پکڑا گیا جرگے نے شہادتوں و دیگر کوائف جمع کرنے کے بعد فیصلہ سنایا کہ دونوں مجرم ہیں۔ اس لئے فیصلہ یہ ہے کہ لڑکی کا سر قلم کر دیا جائے اور لڑکے کو 50 ہزار روپے جرمانہ کر دیا جائے' لڑکی کے سر قلم کرنے میں رعایت کا حاشیہ اس طرح ممکن ہے کہ کوئی بھی شخص اس لڑکی کی قیمت ادا کرے اور وہ لڑکی کو لے جا سکتا ہے۔

لڑکے کی جانب سے دی جانے والی رقم یعنی 50 ہزار روپے لڑکی کے باپ کے پاس جائیں گے اور لڑکی کی فروخت سے حاصل رقم بھی لڑکی کے باپ کو جائے گی۔ تو فیصلہ ہوا اور لڑکے نے 50 ہزار روپے لڑکی کے باپ کو دے دیے۔ اس کے بعد جرگے نے بولی لگائی کہ ہے کوئی جو اس لڑکی کی جان بچانا چاہتا ہے اور معاوضہ دینے کو تیار ہے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر 70 ہزار کی بولی لگائی' باپ کے حوالے رقم کی اور لڑکی کو لے کر چل پڑا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 70 ہزار کی بولی لگانے والا شخص کیا انسانی ہمدردی میں اتنی خطیر رقم ایک اس لڑکی کے لئے خرچ کر رہا ہے جو کہ عصمت باختہ ہے' جس کا ارتکاب تسلیم کر لیا گیا ہے' یقیناً وہ شخص یہ سرمایہ کسی اور تجارت کاروبار کے لئے صرف کر رہا ہے۔ وہ کاروبار کیا ہے' کوٹھوں اور بازاروں میں بولی لگنے والے چہروں میں ایک اور

چہرے کا اضافہ۔ ایک اور نام کا اعلان ان لوگوں کے لئے جنہیں خوب سے خوب تر کی تلاش کبھی شمالی علاقوں میں کسی مخصوص شکل میں ظاہر کرتی ہے اور بڑے شہروں میں گھر سے ہوٹل تک کی تمیز کی لکیریں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں۔

کمال ستم ظریفی یہ ہے کہ لڑکے سے ملنے والی اور لڑکی کی فروخت سے حاصل ہونے والی دونوں رقوم باپ کے ہاتھ ہی جاتی ہیں۔ اتنے کماؤ تو آج کل کے بیٹے بھی نہیں ہوتے کہ باپ کو یکمشت ایک لاکھ بیس ہزار روپے دلا سکیں جبکہ ایک کلموہی بیٹی کے صدقے باپ کو ایک گوٹھ میں اتنی بڑی رقم مل جاتی ہے۔ اس کا سر فخر سے بلند بھی ہو جاتا ہے لوگ اس کے صبر اور برداشت کی گواہی بھی دیتے ہیں اور روشن مستقبل کے منصوبے اس کے آنگن میں کھیلتے رہتے ہیں۔

یہی احوال جیل خانوں میں ضمانتیں داخل کرانے والوں کا ہے، سینکڑوں عورتیں زنا کے الزام میں جیلوں میں ڈال دی جاتی ہیں یہ الزام کئی دفعہ منفعت بخش بھی ہوتا ہے۔ شوہر دوسری بیوی کرنا چاہتا ہے پہلی بیوی پر الزام لگا کر اندر کرا دیتا ہے۔ بھائی بہن کی جائیداد کا حصہ ہڑپ کرنا چاہتا ہے الزام لگا کر بہن کو جیل بھیج دیتا ہے۔ باپ دوسری بیوی لانا چاہتا ہے جوان بیٹی کی موجودگی میں ایسا نہیں کر سکتا بیٹی کو اندر کرانے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ منزل منزل یہ کام چلتا رہتا ہے چونکہ الزام کسی اہم غرض کے لئے لگا کر اپنے ہی اندر کرواتے ہیں اس لئے ضمانت کے لئے کون آئے گا۔

آخر کوئی مہربان یا غرض مند آتا ہے ضمانت کراتا ہے اور پھر اپنے لئے بہتر مستقبل کا راستہ ڈھونڈ کر کبھی دبئی، کبھی محلوں میں، کبھی کوٹھوں پہ فن کی آبیاری کا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ پھر وہ سلسلہ کہ گھروں سے بھاگنے والی عورتیں جہاں جہاں پناہ لیتی ہیں وہاں سے رہائی دلانے والی بھی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں خوب شناخت کر کے راستے بتاتے اور اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں۔

ہمارے ملک میں قدم بقدم اور لحہ بہ لحہ آواز آتی ہے شریعت کے نفاذ کی۔

ہمارے ملک میں دیواروں سے لے کر قبروں تک آواز اٹھائی جاتی ہے زنا آرڈیننس کو ختم نہ کرنے کی۔

ہمارے ملک میں کاروکاری کا بازار باقاعدہ اور سر عام لگتا ہے۔ ہمارے ملک میں عورتوں کے لئے تھانے اس طریق کار کو ختم نہیں کر سکتے ہیں۔

اگر ایک انقلابی قدم اٹھایا جا سکتا ہے اور بے داڑھی مگر سمجھدار شخص اقبال احمد

خاں، اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین ہو سکتا ہے اور اسلامی یونیورسٹی کا ریکٹر ملک معراج خالد جیسا معتدل مزاج شخص ہو سکتا ہے، اگر ایک دفعہ اور بس ایک دفعہ انٹی کرپشن کا انچارج بے داغ شخص ملک قاسم ہو سکتا ہے تو پھر کیوں یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک آرڈیننس جو کہ آئین کا حصہ بھی نہیں جسے ایک آمر نے آٹھویں ترمیم کا تحفظ دیا ہو اس کی بیخ کنی کی جائے۔

جنگلوں کے پار گوٹھوں میں اور گلیوں کے اندر گھروں میں لڑکیوں کو باپ کے گھر رخصت ہونے کے لئے الزام کی چادر نہ ملے دعاؤں کی پناہ ملے۔" (جنگ 3 اکتوبر 1994ء)

"کیوں : ؟"

اس "کیوں" کا جواب مراکش کی معروف سوشیالو جسٹ ڈاکٹر فاطمہ مرنیسی کے مقالہ "عورت اور جدید مسلم معاشرہ کے تضادات" میں ملتا ہے جس کے بموجب "..... عورتوں پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہو رہی ہے وہ بنیاد پرستی اور قدامت پرستی کی بڑھتی ہوئی لہر ہے لیکن اگر ہم مسلم معاشروں میں عورت کے مستقبل اور اس کے لیے امکانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس بندھے ٹکے اور گھسے پٹے خیال کو ترک کرنا ہو گا کہ بنیاد پرستی" قرون وسطیٰ کی پارینہ رجعت پسندی" کا اظہار ہے بلکہ ہمیں اسے اسی طرح دیکھنا ہو گا کہ یہ ان لوگوں کا سیاسی عمل ہے جو ایسی حیران کن مگر لازمی تبدیلیوں سے دو چار ہیں جنہوں نے ان کے معاشی اور جنسی تشخص کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ عالم اسلام کے بارے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہاں کے لوگ اس انقلابی اور تغیر پذیر زمانے میں لایعنی چیزوں میں سے بھی معنی پیدا کر لیتے ہیں، یہاں مطلق العنان طاقتیں آج بھی انسانی زندگی سے کھیل رہی ہیں۔"(4)

ڈاکٹر فاطمہ اس مقالہ میں ایک اور موقع پر یہ لکھتی ہیں:

> "مسلم ملکوں میں عورتوں کے خلاف قدامت پرستی کی جو لہر آئی ہے وہ کوئی رجعت پسندانہ تحریک نہیں ہے بلکہ مردوں کی طرف سے انکا دفاعی میکنزم ہے۔ مرد اور عورت کے کردار اور جنسی شناخت میں جو تبدیلی آئی ہے اور عورتوں کے اندر جو شعور بیدار ہوا ہے یہ تحریک اس کے خلاف بند باندھنے کی کوشش ہے۔"

یہ نکتہ ہے تو قابل توجہ مگر ڈاکٹر فاطمہ نے یہ امر فراموش کر دیا کہ مسلم مرد کے دفاعی میکنزم کی اساس ہی رجعت پرستی اور قدامت پسندی پر استوار ہے کہ یہ اس کے مخصوص

مردانہ مفادات کی ضامن بھی ہے اور انہیں تحفظ بھی فراہم کرتی ہے۔ اس قدامت پسندی میں جب روایات، مسلمات اور بزرگوں کے اقوال زریں بھی شامل کر لیں تو بنیاد پرستی کی وہ معجون تیار ہو جاتی ہے جو مرد کو "مرد" بناتی ہے اور عورت کو "عورت"!

"عورت: اسلحہ خانہ!"

بحیثیت مجموعی صدیوں سے عورت کے بارے میں مخصوص تاثر کی کنڈ۔شنگ میں زبان جو اہم کردار ادا کرتی ہے وہ روز مرہ کے معمولات کا یوں حصہ بن چکا ہے کہ کبھی شعوری طور پر اس کے محرک مقاصد کے تجزیہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی مثلاً ہلاکت خیز ہتھیار تو مرد استعمال کرتا ہے مگر ان میں سے بیشتر کے زنانہ نام ہیں۔ شمشیر، تلوار، تیغ، بندوق، چھری، توپ، کٹاری، برچھی، گولی، حتیٰ کہ جدید ترین میزائل بھی۔۔۔ عورت نہ ہوئی اچھا خاصہ اسلحہ خانہ ہو گئی۔ اس رویہ کی اساس اسی قدیم تصور پر استوار ہے کہ مرد پر عورت تباہی اور بربادی لاتی ہے (مثال: پنڈورا کے بکس والی حکایت) اور یہ رویہ اس شاعرانہ رویہ سے جداگانہ ہے جس کی بنا پر غزل کا محبوب نازو انداز کے اسلحہ سے لیس ملتا ہے۔

اپنی لسانیات کا مطالعہ کریں تو بیشتر زنانہ اوصاف حروف تہجی کے آخری حرف یعنی "ی" پر ختم ہوتے ہیں۔ کیا یہ عورت کو اس کی اوقات بتانے کا علامتی انداز نہیں؟ اس ضمن میں میری لوئیس کے مقالہ "لسانیات میں تذکیر و تانیث کا فرق" (ترجمہ: مسعود اشعر) میں خاصی دلچسپ اور کار آمد معلومات جمع کی گئی ہیں۔ سو اس کے بقول:

> "ارسطو لفظ کے آخر میں آنے والے حرف سے اس کی تذکیر و تانیث کا فرق معلوم کرنے کا قائل تھا۔ وہ تذکیر کو حرکت اور عمل کرنے والا اور تانیث کو "عورت اور دکھ جھیلنے والا صیغہ قرار دیتا تھا"..... ازمنہ وسطیٰ کے صرف و نحو اور علم و ادب کے ماہرین نے بھی زبان میں جنس کے فرق سے متعلق ارسطو کے نظریہ کی حمایت کی ہے۔ گرائمر کے کسی گمنام ماہر کا قول ہے۔ "تذکیر کے ذریعہ ہم کسی چیز میں اس کے عمل کی نوعیت کا اندازہ کرتے ہیں اور تانیث کے ذریعہ ہم کسی چیز میں تحمل و برداشت کی نوعیت سمجھتے ہیں تذکیر میں مرد اور پتھر ایک ہیں اور تانیث میں چٹان اور عورت ایک ہیں...!"

میری لوئیس اس ضمن میں مزید لکھتی ہے:

"برطانوی ماہر لسانیات ہیرس نے 1751ء میں اپنی کتاب Hermes میں لکھا اکثر

الفاظ کو مذکر قرار دیا جاتا ہے۔ جن لفظوں میں آنکھوں کو فعال اثرات یا معلومات دکھائی دیں یا جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے فعال' طاقت ور اور کاریگری میں خواہ وہ اچھے ہوں یا برے (مذکر ہیں) اس کے برعکس تانیث وہ ہے جو قبول کرتی ہے' جمع کرتی ہے' پیدا کرتی ہے' بڑھاتی ہے یا جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے زیادہ قوت برداشت کرنے والی ہے یا جو غیر معمولی طور پر خوبصورت ہے' مہربان ہے یا جس میں مردانہ سے زیادہ زنانہ غلطیاں پائی جاتی ہیں... جیکب گرم نے تذکیر و تانیث کے لیے جو معیار مقرر کیا ہے وہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ وہ کہتا ہے مذکر پہلا' بڑا' مضبوط' زیادہ لچک دار' تیز' فعال' محرک اور خلاق معلوم ہوتا ہے جبکہ مئونث بعد میں آنے والی نرم' جامد' دکھ جھیلنے والی اور قبول کرنے والی ہوتی ہے اور بے جنس صیغہ مخلوق مادی' عام اور بے جان ہوتی ہے۔"(5)

الغرض! مردانہ اوصاف اور زنانہ خصائص کے نقطۂ نظر سے لسانیات کا مطالعہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت انگیز اور بصیرت افروز بھی ہے۔ ادھر میری نیلسن یہ سوال اٹھاتی ہے:

"چڑیل یا ڈائن عورت ہی کیوں ہوتی ہے' چڑیل یا ڈائن جتنی ہیبت ناک' بے رحم اور سنگدل ہوتی ہے مرد راکھشش یا دیو اتنا ظالم اور بے رحم کیوں نہیں ہوتا؟"(6)

—— کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ہماری زبان میں تصغیر یا کمی یا کمتری وغیرہ کے لیے بھی "نسوانی صیغے" استعمال ہوتے ہیں جیسے چھرا سے چھری۔ اگر اس انداز سے عام مستعمل الفاظ پر غور کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہماری زبان بھی دن رات ہمیں عورت کے چھوٹا ہونے' کمتر ہونے اور ناقص یا خام ہونے کا احساس کراتی رہتی ہے۔ ہم اس نوع کے الفاظ سنتے سنتے غیر شعوری طور پر ہی ان سے وابستہ تلازمات اور تصورات کے اتنے خوگر ہو جاتے ہیں کہ اس نوع کے الفاظ کی کنڈ۔شنگ کی وجہ سے ہم بھی عورت کو چھوٹا' کمتر' ناقص اور خام سمجھنے لگتے ہیں شعوری طور پر اس امر کا احساس کیے بغیر کہ ایسے "فکری سانچے" کتنے غیر منطقی ہوتے ہیں اور پھر ان سب پر مستزاد وہ اقوال زریں جن کے بموجب ہر برائی کا باعث عورت ہی ثابت ہوتی ہے۔ ادھر بچپن ہی سے ایسی کہانیاں سنائی جاتی ہیں جن میں ظالم سوتیلی ماں' عیار کٹنی' خونخوار چڑیلیں' جھل پائیاں خوفناک جادوگرنیاں اور بربادی لانے والی عفریت ملتی ہیں۔

اگرچہ نیک دل پریاں اور اچھی عورتیں بھی ملتی ہیں مگر خال خال۔ حتیٰ کہ جانوروں کی حکایات میں بھی لومڑی ہی ہمیشہ عیاری کا کام کرتی ہے شیر یا بھالو یا چیتے نے برا کام نہیں کیا۔ انتقام ناگن ہی لیتی ہے اور پلید روح عورت ہی کی ہوتی ہے۔
الغرض ! تصویرِ زن ترغیب، گناہ، شہوت، دغابازی، مکاری، بے حیائی، بے وفائی، مکر، فریب کے رنگوں سے ہی پینٹ کی جاتی ہے !

"تضاد در تضاد:"

اگرچہ ہمیشہ سے ہی عورت متضاد سماجی رویوں کے تضادات کا شکار رہی ہے مگر آج صورت حال کہیں زیادہ ناخوشگوار نظر آتی ہے کہ اب تعلیم کی بنا پر عورت کو اپنے وجود، ذات، شخصیت، نسوانیت اور ان سب کے حوالہ سے اپنے حقوق کا احساس ہو چکا ہے مثلاً وہ ملازمت سے کنبہ کی کفالت تو کر سکتی ہے مگر اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں، بیوی بیٹی، ماں، بہن ہر رشتہ اس کے لیے پابندیوں کی زنجیر کی نئی نئی کڑی ثابت ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی شخصی آزادی مجروح ہوتی رہتی ہے۔ یہ ہمارے معاشرہ کی عجیب صورت حال ہے کہ یہاں صرف طوائف ہی آزاد عورت رہی ہے !

وہ شہزادی تھی تو حکمران باپ کے سیاسی مفادات کے تحت بیاہی جاتی تھی، امیر، وزیر، درباری رکن کی بیٹی یا بہن تھی تو شاہ اور حاکم کی خوشنودی کے ذریعہ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ غریب کی جورو تو خیر ہوتی ہی ہے دولت مشترکہ، خاندانی جائداد، زمینوں اور ترکہ میں سے اسے ہر قیمت پر وارثت سے محروم رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ قرآن شریف سے "بیاہ" کر کے اسے عمر بھر گھر میں بٹھائے رکھا جاتا ہے۔ نہ گھر سے بیٹی گئی اور نہ زمین !

قرآن شریف سے بیٹی کے بیاہ کو "حق بخشانے" کا نام دیا گیا ہے اور یہ رسم سندھ کے بااثر قدیم مسلم گھرانوں میں آج بھی مروج ہے۔ عاجز جمالی کے الفاظ میں :

"حق بخشانے (لڑکی کی شادی نہ کرنے) کی رسم شروع ہونے کے دو اسباب تھے۔ ایک یہ کہ سندھ میں بسنے والے بہت سارے بلوچ اور سید قبیلوں کے سرکردہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے خاندان کے قابل کوئی بڑا خاندان نہیں ہے سارے قبیلے والے ان سے کم ہیں اس لئے کم حیثیت والے لوگوں کو اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دیا جا سکتا اور دوسرے یہ ہے کہ سندھ کے بااثر قبیلے اپنی خاندانی ملکیت میں کسی اور کو حصہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لڑکی کی شادی کرانے سے قانونی طور پر لڑکی کو بھی ملکیت میں حصہ دینا پڑتا، ایسی صورت میں ملکیت کا وہ حصہ کسی دوسرے آدمی کے پاس چلا جاتا اس وجہ سے انھوں نے

لڑکیوں کی شادی کرانے کے بجائے زندگی بھر کے لئے ان کو گھر میں بٹھا لیا- ایک روایت یہ ہے کہ حق بخشانے کی رسم خصوصی طور پر ان قبائلی سرداروں اور وڈیروں کے ہاں شروع ہوئی جن کے گھر بیٹا پیدا نہیں ہوا- بیٹے کی پیدائش کے لئے انہوں نے خود تو تین تین شادیاں بھی کیں مگر بیٹا پیدا نہ ہونے کی صورت میں انہوں نے اپنی بیٹیوں کو گھر میں بٹھا دیا- اس طرح بیٹیاں ساری عمر لال جوڑے کی خواہش کو اپنے سینے میں چھپائے خواہشوں کی سلگتی ہوئی آگ پر جلتی رہیں-

حق بخشانے کی رسم عموماً اس وقت ہوتی ہے جب لڑکی کی عمر جوانی کی سرحدیں پار کر کے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے اور اس کے بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگتے ہیں مگر کچھ علاقوں میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ چھوٹی عمر میں ہی لڑکی کا حق بخشایا گیا ہو، سندھ میں حق کی معنی ہیں "شوہر" یعنی عورت اپنے شوہر کو اپنا حق کہتی ہے- جب لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی تو اس کی گود میں قرآن شریف ڈال کر باپ اس سے کہتا ہے کہ " بیٹی میں نے تمہیں حق بخشا دیا ہے" یعنی اب ساری عمر تیرا قرآن شریف کا ساتھ ہو گا اور اب تو قرآن شریف کے ہی سائے میں زندگی بسر کرے گی- لڑکی کی زندگی میں جب یہ دن آتا ہے تو اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس دن کے آنے سے تو اچھا ہے وہ خود کو مار ڈالے- بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ لڑکیوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی- پانچ سال قبل دادو ضلع کے ایک گاؤں سنگری میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا ایک بااثر قبیلے کی لڑکی نے گھر میں رکھی ہوئی بندوق سے خودکشی کر لی مگر بعد میں لڑکی کی اس خودکشی کو قتل قرار دے کر اس کا الزام اپنے مخالفوں پر لگا دیا گیا- دادو ضلع میں ہی کاچھو والے علاقے میں ایک قبیلے میں اب تک بہت سی لڑکیوں کی شادی نہیں کروائی گئی اور ان کی تمام عمر بڑی بڑی حویلیوں میں بیت گئی، تاہم اس قبیلے میں کچھ عورتیں اب تک شادی کی آس لگائے ہوئے بیٹھی ہیں- ایسی مثالیں دادو میں کوہستان والے علاقے کے بااثر قبیلے کے حوالے سے بھی موجود ہیں-

کوٹ ڈیجی میں (ضلع خیرپور) سندھ کے ماضی کے حکمران قبیلے کی پچیس فیصد لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی جبکہ خیرپور ضلع کے کوٹ بنگلو سے ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ایک پیر کا کوئی بیٹا نہیں تھا اور زمین کے بٹوارے کے خوف سے اسنے اپنی اکلوتی لڑکی کی شادی نہیں کی اور اسے حق بخشا دیا- حیدر آباد ضلع میں سندھ کے ایک مشہور سیاسی قبیلے میں بہت سی لڑکیوں کی شادیاں نہیں کی گئیں ان میں سے بڑی عمر کی ایک غیر شادی شدہ عورت حال ہی

میں فوت ہو گئی ہے جبکہ ٹکھڑ کے علاقے کے مشہور خاندان میں بھی لڑکیوں کی شادیاں نہیں کی جاتیں ٹکھڑ سے ہی تعلق رکھنے والی سندھ کی ایک بڑی ادیبہ اور ڈرامہ نگار نورالہدی شاہ نے بھی اپنی تحریروں میں سندھی عورتوں پر ہونے والے مظالم "کارو کاری" اور "حق بخشانے" کی رسم کی مذمت کی ہے اور اپنے قلم کے ذریعے مزاحمت کی ہے۔ اسی طرح ملکی سیاست میں اچھی حیثیت رکھنے والے بدین کے ایک زمیندار گھرانے کے مشہور آدمی کی بہن کی شادی نہیں کروائی گئی تو وہ گھر سے بھاگ گئی آج تک اس لڑکی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

سندھی عورتوں پر ہونے والے مظالم اور فرسودہ رسومات کی چکی میں سندھی عورت کے پسنے کی داستانیں تقریباً حویلیوں کی بڑی بڑی دیواروں سے ٹکرا کر ہی دفن ہو جاتی ہیں مگر کبھی کبھی وہ داستانیں دیواریں پھلانگ کر باہر نکلتی ہیں تو ان کے سارے کردار ختم ہو جاتے ہیں۔ تاہم ایسے واقعات لوگوں کے سامنے لانے میں کچھ لوگوں کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ ان میں میڈم عطیہ داؤد بھی شامل ہیں جو ایک سندھی ادیبہ اور سوشل ورکر ہیں۔ سندھی عورتوں پر ہونے والے مظالم پر میڈم عطیہ داؤد نے ایک دستاویز ترتیب دی ہے ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ "سندھ کے ایک معزز قبیلے کی چھ سات لڑکیاں دشمنی کی بنیاد پر اغواء ہوئی تھیں، ان کی تلاش میں قبیلے کے مردوں نے دن رات ایک کر دیا جب وہ لڑکیاں ہاتھ آ گئیں تو ان کو گھر لا کر لائن میں کھڑا کرنے کے بعد ساری لڑکیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ بھاگ گئیں تھیں۔"

سندھ میں ایسی ہی بہت مشہور سی خواتین بھی ہیں جنہوں نے زندگی کا بہت عرصہ حویلیوں میں گزارنے کے بعد حویلیوں کی دیواروں کو قید خانہ تصور کیا اور بغاوت کی اور گھروں سے بھاگ کر اپنے لیے پناہ گاہیں تلاش کیں۔ جبکہ یہ بہت ہی دلچسپ پہلو ہے کہ سندھ کے بہت نامور سیاستدان، ادیب، دانشور اور معروف لوگوں نے خود تو ایک سے زائد شادیاں کی ہیں مگر اپنے گھروں میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو انہوں نے قید رکھا۔ سندھ کے سیدوں میں یہ عام ہے کہ وہ خود تو عام قبیلے کے کسی لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں مگر اپنے گھروں میں ان کی بیٹیاں بوڑھی ہو جاتی ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ "بی بی زادیاں رعایا کے گھروں میں کیسے جا سکتی ہیں۔"

سندھ میں حق بخشانے کی رسم کے بارے میں دادو ضلع کے پہاڑی علاقوں کے ایک قبائلی سردار کا یہ قصہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کے لیے یہ شرط رکھی

کہ "جب اس علاقے کا کوئی جوان تین شیروں کا شکار کرے گا تو وہ اس نوجوان سے اپنی بیٹی کی شادی کرے گا" لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے یہ شرط اس خیال سے رکھی تھی کہ کوئی یہ کام نہیں کر سکے گا اور اسے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی پڑے گی اور ہوا بھی یہی۔ اس سردار کی بیٹی بوڑھی ہونے تک گھر میں ہی بیٹھی رہی' ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جو سندھ میں مرتی ہوئی جاگیرداری اور اندر سے کھوکھلی وڈیرا شاہی کی علامتیں ہیں اور بنیادی انسانی حقوق کے چارٹر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی مترادف اور انسانیت کی توہین ہیں۔"

(بحوالہ : 16 اکتوبر 1994ء)

عورت کے معاملہ میں اہل مذہب کے قول و فعل میں جو تضاد ملتا ہے اس کی بنا پر وہ بیک وقت "شریعت جو" اور "شریعت گریز" ہوتے ہیں اور خود کو عقل کل جاننے کے باوجود بھی کبھی انہیں ان تضادات کا ادراک نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے "اقبال اور ملا" (ص : 14- 13) میں ایسے ہی ایک مولوی صاحب کا واقعہ بیان کیا ہے جو علامہ اقبال کو ریش درازی کی تو تلقین کرتے تھے مگر بہن کو ترکہ میں سے شرعی حصہ دینے کو تیار نہ تھے۔

اکثریت ان معاملات میں بالعموم خاموش رہتی ہے کہ کون تکفیر کا خطرہ مول لے۔ تازہ ترین مثال ایس ایم ظفر کا بیان ہے جس کے بموجب "عورت کی گواہی آدھی ہے نہ مرد کو چار شادیاں کرنے کا اختیار ہے" روزنامہ جنگ لاہور (28 جنوری 1994ء) کی خبر کے مطابق انہوں نے اس ضمن میں یہ کہا:

"اسلام عورت کو طلاق طلب کرنے کے حق سے نہیں روکتا' مرد کو چار شادیاں کرنے کا حق نہیں بلکہ رعایت ہے۔ قرآن پاک میں عورت کی گواہی کے بارے میں آیت کی غلط تشریح کی جاتی ہے۔ علمائے کرام' سکالروں اور باشعور لوگوں کو اجتہاد کر کے حالات و واقعات کے مطابق اسلامی قوانین کو ڈھالنا چاہیے۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے' ہمیں پیچھے دیکھنے کی بجائے بہت آگے کی بات سوچنا چاہیے ورنہ فروغ اسلام ممکن نہیں..... حضرت علی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کی گواہی قابل قبول نہیں' مولوی نے تو عورت کی شہادت کو آدھا کر دیا انہوں نے کہا میں علمائے کرام کا بڑا احترام کرتا ہوں لیکن قرآن کی غلط تشریح و توضیح کے سامنے ہتھیار نہیں پھینک سکتا ــ انہوں نے کہا ہم آئمہ کے فیصلوں کو اجتہاد کے ذریعہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ آج اگر امام ابو حنیفہ زندہ ہوتے اور انہیں بہتر دلیل دی جاتی تو وہ قبول کر لیتے ... ایس ایم ظفر نے کہا حضور نبی کریمؐ کا فرمان ہے کہ جس شخص کے دو دن ایک ہی جیسے گزر گئے وہ گھاٹے میں ہے اس لیے ہمیں اسلام

کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اجتہاد کرنا ہو گا اور تبدیلیاں لانا ہوں گی۔"

اس بیان پر علماء کا ردعمل روزنامہ جنگ (لاہور: 29 جنوری 1994ء) میں شائع ہوا جس کے بموجب "ملک بھر سے معروف علماء اور مفتیوں نے ایس ایم ظفر کے بیان کو قرآن اور اسلامی تعلیمات کے خلاف بغاوت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایس ایم ظفر قرآن و حدیث کی واضح نصوص کے انکار کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو چکا ہے اور اگر اس نے توبہ نہ کی تو اس کا حشر بھی سلمان رشدی جیسا ہو گا۔ ایک بیان میں ان علماء نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے تو اس میں اسلام کی واضح تعلیمات کے خلاف کسی کو "ہرزہ سرائی" کی اجازت نہیں دی جائے گی— بیان دینے والے علماء کرام کے اسماء یہ ہیں پاکستان علماء کونسل کے قائم مقام چیئرمین مولانا حبیب الرحمٰن فاروقی، مفتی جمیل احمد تھانوی، علامہ حافظ زبیر احمد ظہیر، مولانا اسعد تھانوی، مولانا عبدالقیوم حقانی، مولانا محمد عبداللہ، حافظ عبدالرحمٰن مدنی، مولانا عبدالرحمٰن اشرفی، مولانا لطیف الرحمٰن، مولانا اشرف قریشی، مولانا عبدالعزیز نورستانی، مولانا اسعد زکریا، مولانا محمد علی جانباز، مولانا سرفراز خاں صفدر، مولانا عبدالرحمٰن سلفی، مولانا اللہ دتہ کاکڑ، قاری محمد حنیف جالندھری، مفتی غلام سرور قادری، مفتی محمد حسین نعیمی، حافظ محمد انور ساجد، پیر سیف اللہ خالد نقشبندی اور مولانا محمد نواز بلوچ!

اگلے دن کے جنگ میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ بیان چھپا:

"لاہور (خبرنگار خصوصی) مسٹر جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال نے کہا ہے کہ اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی صرف رعایت دی ہے اس کا "لائسنس" نہیں دیا۔ علماء کا نقطۂ نظر روایتی ہے یہ شہنشاہیت اور بادشاہت میں تو چل سکتا ہے مگر جمہوریت میں اس کی گنجائش نہیں۔ علماء عورت کی حکمرانی کے خلاف تھے مگر جمہوریت نے عورت کے حق میں فیصلہ دے دیا اور آج عورت حکمران ہے۔ "جنگ" سے گفتگو میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا کہ مرد کو چار شادیوں کی رعایت ہے۔ یہ فرض نہیں ہے قرآن پاک میں یہ ضرور ہے کہ مرد چار شادیاں کر سکتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کی گئی ہے کہ سب کے ساتھ انصاف کیا جائے اگر انصاف نہیں کر سکتے تو پھر ایک ہی شادی کرنا بہتر ہے، تاہم عام تاثر یہی ہے کہ مرد انصاف نہیں کر سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ چار شادیوں کے بارے میں ہمارے علماء کی اپروچ روایتی ہے جو آج کے زمانہ کے موافق نہیں ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ قرآن پاک میں صرف بعض مخصوص معاشی معاملات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ دو عورتوں کی گواہی کو ایک گواہی مانا جائے گا۔ یہ معاملات معاشی

لین دین کے ہیں جو مخصوص زمانہ کے لیے تھے اگر خلیفہ ہارون رشید کی بہن قاضی ہو سکتی ہے تو پھر عورت کی گواہی کس طرح آدھی ہو گی؟

فقہا کے اس مسئلہ پر اختلافات ہیں۔ ایک طبقہ عورت کی گواہی کو آدھا کہتا ہے مگر دوسرا عورت کی گواہی کو مکمل قرار دیتا ہے، تاہم چار شادیوں اور عورت کی گواہی کے بارے میں تمام بحثیں اور باتیں آج کے زمانہ سے مطابقت نہیں رکھتیں ہمیں قومی سطح پر یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم نے قدم آگے بڑھانا ہے یا پیچھے۔ اگر پیچھے جانا ہے تو پھر ہمیں سلطانوں کے دور میں جانا پڑے گا، مذہبی آمریت ہی قائم کرنی ہے تو خلیفہ اور سلطان لانا پڑیں گے۔ علماء کا روایتی نکتہ نظر شہنشاہیت یا بادشاہیت میں تو چل سکتا ہے مگر جمہوریت کے تقاضے مختلف ہیں۔ اگر پارلیمنٹ یہ فیصلہ کرے کہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا ہے تو پھر علماء کیا کر لیں گے؟ ہماری ہاں تو مثال موجود ہے کہ علماء نے کہا کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی مگر جمہور نے عورت کے حق میں یہی فیصلہ دے دیا اور آج عورت حکمران بن گئی ہے اب علماء کیا کر سکتے ہیں علماء کی کون سنے گا؟ ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ قوم کو ان بحثوں سے کوئی فائدہ نہیں، یہ بحثیں قوم میں انتشار پیدا کر رہی ہیں انہوں نے کہا علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا کہ :

دین ملا فی سبیل اللہ فساد

ملا کی تاویل معاشرہ میں صرف فساد ہی پیدا کر سکتی ہے اس سے معاشرہ میں یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی"

"حوا کی بیٹی:"

اس ملک میں عورت کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے اس کا صرف زنا بالجبر کے اعداد و شمار سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ —— 1991ء میں 1118- 1992ء میں 1273 جبکہ 1993ء میں صرف پنجاب میں 140 کیس رجسٹر کیے گئے یہ "جنگ" 31 دسمبر 1993ء کے اعداد ہیں۔ اس ضمن میں مزید معلومات، کوائف، اعداد اور رپورٹوں کے لیے کمیشن برائے انسانی حقوق کے مجلہ ماہنامہ "صدائے آدم" سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں عورت کیونکہ عزت کی علامت سمجھی جاتی ہے اس لیے اسے نشانہ بنا کر سارے خاندان کی تذلیل کے لیے بڑے آدمیوں، ان کے اوباش بیٹوں، جاگیرداروں، وڈیروں اور ان کے کارندوں نے اب اجتماعی آبرو ریزی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اور اس "اہم کارنامہ" کی تکمیل کے بعد بڑھکیں مار کر اور بھنگوے ڈال کر جشن کامرانی منایا

جاتا ہے۔ 12 جولائی 1994ء کے اخبارات کے مطابق بیوی سے زیادتی کا انتقام لینے کے لئے پنچائیت کے فیصلہ کے مطابق زیادتی کرنے والے کی بیوی کی ساتھ گینگ ریپ کیا گیا۔ روزنامہ جنگ لاہور : 23 جون 1994ء کی یہ رپورٹ بھی ملاحظہ ہو :

"لاہور (فاخرہ تحریم افضل) گذشتہ تین برسوں میں پنجاب میں 20 سال سے کم عمر کی 149 لڑکیوں سے زیادتی کی گئی۔ ان میں سے 54 اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنیں۔ ان بدقسمت خواتین میں 15 سے 20 سال عمر کی 79 دس سے پندرہ سال کی 48 پانچ سے دس سال کی 17 اور پانچ سال سے کم عمر کی بچیوں کی تعداد پانچ تھی۔ یہ بات خواتین کے ساتھ زیادتی کے خلاف بنائی گئی تنظیم "وار" کی ایک ریسرچ رپورٹ میں بتائی گئی ہے جو یونیسیف کے تعاون سے تیار کی گئی۔ اس رپورٹ پر گروپ میٹنگ 2 جولائی کو ہو گی۔ رپورٹ کے مطابق تشدد کانشانہ بننے والی بچیوں میں سے 84 کا تعلق دیہی علاقوں سے اور 64 کا شہری علاقوں سے ہے۔ ظلم کا نشانہ بننے والی لڑکیوں میں سے 20 طالبات ٹیچر اور 6 نوکرانیاں ہیں۔ گھر میں رہنے والی بچیوں کی تعداد تین جبکہ 109 بچیوں کے بارے میں علم نہیں ہو سکا کہ وہ کیا کام کرتی تھیں۔ 137 لڑکیاں غیر شادی شدہ جبکہ 11 شادی شدہ اور ایک طلاق یافتہ تھی۔ رپورٹ میں انکے مذہب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے 120 مسلمان 8 عیسائی اور 21 کے مذہب کے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔ ان بچیوں میں سے ایک بھی بچی کا تعلق طبقہ امرا سے نہیں تھا۔ اپر مڈل کلاس کی ایک' مڈل کلاس کی دس' لوئر مڈل کی 58 اور نچلے طبقے کی 77 بچیوں میں سے 54 کو اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنایا گیا۔ 12 کو برہنہ پریڈ کرائی گئی۔ پولیس نے صرف 106 کی ایف آئی آر درج کی 27 کی رپورٹ درج نہیں ہوئی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صرف 23 کیسز میں پولیس کا رویہ تعاون پر مبنی تھا' تشدد کرنے والوں میں سے 11 قریبی رشتہ دار تھے' 7 ہمسائے' چھ آشنا یا دوست' 46 واقف کار' 24 اجنبی اور 50 نا معلوم افراد تھے۔"

جہیز نہ لانے' کم لانے یا بیاہ کے بعد خاوند اور سسرال کے ناجائز مطالبات زر پورا نہ کرنے کی پاداش میں نو بیاہتا دلہنوں کو تیل کے چولہے سے جلانے کے واقعات میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ 1993ء میں صرف لاہور اور اس کے گرد و نواح میں 286 عورتوں کی موت تیل کے چولہے سے ہوئی۔ (جنگ : 31 دسمبر 1993ء)— اس پر ہمارا دعویٰ کہ ہم مسلمان ہیں' ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے اور بیٹی اور بہن کے رشتے سب سے مقدس ہیں۔

حکومت اور قانون تو اپنی سی کرتا ہے لیکن کیا کبھی کسی لاؤڈ سپیکر سے بھی عورت کے خلاف جنسی اور دیگر جرائم کی مذمت کی گئی؟ کسی معصوم لڑکی کی آبرو ریزی کے بعد علاقے کی مسجد کا پیش امام اپنے ضمیر کو مطمئن پاتا ہے؟ مذہب نما سیاسی جماعتوں کے راہنما کیسے تقاریر میں عوام کی تقدیر بدلنے کے دعوے کر جاتے ہیں؟ ویسے تو یہ تمام معاشرہ ہی کی ذمہ داری ہے لیکن مذہبی شخصیات کیونکہ خود کو اسلام کی نمائندہ اور عوام کی نجات دھندہ کے طور پر پیش کرتی ہیں اور ایسے حضرات دین کے محافظ ہونے کے دعوے دار بھی ہوتے ہیں اس لیے ان معاملات میں ان سے فوری رد عمل کی توقع بے جا نہیں! یہ جلسے کرتے ہیں، تقاریر کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، ہڑتالیں کراتے ہیں اور معاشرہ میں فحاشی کے خلاف مہمیں شروع کرتے ہیں اس لیے ان معاملات میں بھی مظلوم عورتیں ان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں کہ کم از کم یہ حضرات تو حوا کی بیٹی کی فریاد سنیں گے، باقی معاشرہ تو خیر گنہگار، مادہ پرست، دنیا دار اور جاہ پسند افراد پر مشتمل ہوتا ہے لہٰذا اللہ کے ان نیک بندوں اور پاک دیندار اور صاف ستھرے کردار کی حامل مذہبی شخصیات کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ علاقہ کے تھانے دار کی حیثیت، سیاسی شخصیت اور جاگیردار یا وڈیرے سے ڈرے بغیر مظلوم بچی کے سر پر دست شفقت رکھ کر اس کی داد رسی کریں!

حواشی:

(1) بحوالہ "اسلامی معاشرہ" از پروفیسر رفیع اللہ شہاب ص :260

(2) بحوالہ "عورت۔ زبان خلق سے زبان حال تک" مرتبہ کشور ناہید ص :117

(3) بحوالہ "عورت کی سربراہی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں" از فضل الرحمٰن بن محمود، ص :98

(4) بحوالہ "عورت۔ زبان خلق سے زبان حال تک" ص : 99- 98

(5) ایضاً ص : 78- 76

(6) ایضاً ص : 165

کتابیات

آزاد، ابوالکلام (مترجم) "مسلمان عورت" از : فرید وجدی آفندی، فیصل آباد، طارق اکیڈمی، 1399ھ

آغا افتخار حسین، ڈاکٹر "قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ" لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع سوم : 1992ء

ابوالاعلیٰ مودودی، سید "تجدید و احیائے دین" لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، طبع نہم، 1966ء

"تنقیحات" ایضاً طبع ہشتم، 1967ء

"ابوریحان البیرونی" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سنہ؟

"اردو جامع انسائیکلوپیڈیا" (جلد اول و دوم) لاہور، شیخ غلام علی، 1987ء

"اردو دائرہ المعارف (جامعہ پنجاب) لاہور 1966ء

"اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) کراچی، اردو لغت بورڈ، 1993ء

ایس ایم اکرام، ڈاکٹر وحید قریشی (مرتبین) "دربار ملی" لاہور، مجلس ترقی ادب، 1966ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر "پاکستانی کلچر" کراچی، الیٹ پبلشرز، 1973ء

"قومی انگلش اردو ڈکشنری" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1993ء

رشید ملک (مترجم) "جدید سائنس کا آغاز" از ٹامس گولڈ شائن، لاہور، تخلیقات، 1993ء

رفیع اللہ شہاب، پروفیسر "اسلامی معاشرہ" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1988ء

رئیس احمد جعفری (مترجم) "تاریخ معتزلہ" از زہدی حسن جاراللہ، لاہور، شیخ غلام علی، سنہ؟

سبط حسن "ماضی کے مزار" کراچی، مکتبہ دانیال، 1979ء

"موسیٰ سے مارکس تک" ایضاً 1983ء

سلیمان ندوی، علامہ "عرب و ہند کے تعلقات" کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، 1987ء

شہزاد احمد (مترجم) "ارمان اور حقیقت" از ڈاکٹر عبدالسلام، لاہور، لزیری بکس اینڈ ساؤنڈز، 1993ء

"تخلیقی رویے" لاہور، اردو سائنس بورڈ، 1986ء

عبدالحکیم، خلیفہ "اقبال اور ملا" لاہور مجلس ترقی ادب

"فکر اقبال" لاہور، بزم اقبال 1988ء

عبدالحمید، قاری "انکشافات" بنوں، دار التبلیغ، 1965ء

علی عباس جلال پوری "روایات تمدن قدیم" جہلم، خرد افروز 1991ء

غلام جیلانی برق — "دو قرآن" لاہور

فضل الرحمن بن محمد — "عورت کی سربراہی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں" لاہور، انجمن اہل حدیث، مسجد مبارک، 1990ء

قاضی جاوید — "ہندی مسلم تہذیب" لاہور، وین گارڈ بکس، 1983ء

قرۃ العین حیدر — "کارجہاں دراز ہے" لاہور، مکتبہ اردو ادب

کشور ناہید — "عورت : خواب اور خاک کے درمیان"
لاہور، گلرنگ پبلشرز، 1985ء
"عورت۔ ایک نفسیاتی مطالعہ" از سیمون دیوار،
لاہور، وین گارڈ، 1982ء
"عورت زبان خلق سے زبان حال تک" (مرتبہ)
لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1993ء

محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا (مرتب) — "مقالات سرسید" (جلد شاف وہم) لاہور، مجلس ترقی ادب، 1965ء

محمد اکرام، شیخ — "آب کوثر/ موج کوثر/رود کوثر"
لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1992ء

محمد اقبال، علامہ — "کلیات اقبال" لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز 1973ء

مبارک علی، ڈاکٹر — "برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ"
لاہور، نگارشات، 1987ء
"تاریخ اور فرقہ واریت" لاہور، نگارشات، 1986ء

محمد حنیف ندوی، مولانا — " عقلیات ابن تیمیہ"
لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، سنہ؟

معشوق حسین خاں، مولوی (مترجم) — "ابن رشد و فلسفہ ابن رشد" از موسیو رینان ساں،
لاہور، تخلیقات، 1993ء

نذیر نیازی، سید (مترجم) — "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ"
از علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، لاہور، بزم اقبال، 1963ء

نیاز فتح پوری — "مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ"
کراچی، ادارہ ادب العالیہ، 1961ء

Encyclopaedias: Americana / Britanica

Hawking, Stephen W. "A Brief History of Time".

Ikram, S.M. "A History of Muslim Civilization in India Pakistan:" Lahore, Institute of Islamic Culture, 1994.

Leaky, Richard E/ Lewin, Rooger "Origins." London, 'Macdonalds and Jane's 1979.

Wilson, Colin: "The Occult" New York, Vintage Books, 1973

Life: The Bible Issue. 19-April, 1965.
The "Economist". 22- 28 Oct 1994.

جرائد

"المعارف"	لاہور	مئی جون 1993ء
"پیامی"	کراچی	اگست 1979ء
"تکبیر"	کراچی	14 اکتوبر 1993ء /21 اکتوبر 1993ء/12 مئی 1994ء
"راوی"	لاہور	دسمبر 1989ء
"روشن خیال"	کراچی	شمارہ 2، 3، 4، 1993ء
"سیارہ ڈائجسٹ"	لاہور	ستمبر 1993ء
"شب خون"	الہ آباد	مارچ مئی 1986ء
"ضیائے حرم"	لاہور	اپریل، اگست 1993ء/ فروری 1994ء
"عرفات"	لاہور	مئی 1994ء
"فکر و نظر"	اسلام آباد	جولائی- ستمبر 1993ء
"فنون"	لاہور	جون- جولائی 1989ء/ جنوری مارچ 1991ء
"لیل و نہار"	کراچی	19 اپریل 1979ء
"ماہ نو"	لاہور	جون 1977ء/ مئی 1980ء
"نگار پاکستان"	کراچی	جنوری 1966ء/ جشن طلائی نمبر 1983ء/ سالنامہ 1983ء/ اپریل، دسمبر، نیاز صدی نمبر 1984ء مکتوبات نیاز نمبر 1985ء/ فروری 1987ء/ مئی 1988ء/ مئی 1989ء/ نومبر 1991ء

تصانیف: ڈاکٹر سلیم اختر

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ
تخلیق اور لاشعوری محرکات
انشائیہ کی بنیاد
پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال
تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید
ادب اور لاشعور
ادب اور کلچر
افسانہ حقیقت سے علامت تک
افسانہ اور افسانہ نگار
مغرب میں نفسیاتی تنقید
داستان اور ناول
اردو زبان کیا ہے؟
تنقیدی دبستان
نگاہ اور نقطے

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ
اردو زبان کا مطالعہ
حیات جاوید (تلخیص)
باغ و بہار از میرامن (مقدمہ)
چالیس منٹ کی عورت
کلام نرم و نازک
تین بڑے نفسیات دان
عورت جنس اور جذبات
ہماری جنسی اور جذباتی زندگی
مرد جنس کے آئینے میں
عورت جنس کے آئینے میں
شادی جنس اور جذبات
خوشگوار اور مطمئن زندگی گزاریئے

Rs. 150.00

ISBN 969 - 35 - 0599 - 4